مولانا اِحتشام الحق تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ

کی

آپ بیتی

تحریکِ جمہوریتِ پاکستان کا ایک باب

ترتیب و تہذیب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

ناشر

مولانا اِحتشام الحق تھانوی اکادمی کراچی

مولانا احتشام الحق تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ

کی

آپ بیتی

تحریک جمہوریت پاکستان کا ایک باب

ترتیب و تہذیب

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہانپوری

ناشر

مولانا احتشام الحق تھانوی اکادمی کراچی

مولانا احتشام الحق تھانوی کی آپ بیتی

تحریک جمہوریت پاکستان کا ایک باب

ترتیب و تہذیب: ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری

طابع: المخزن پرنٹرز، پاکستان چوک، کراچی ـ 74200

اشاعت: ۱۹۹۳ء

قیمت: .روپے

ملنے کے پتے

- مکتبہ ، شاہد، ۱/ ۹ علی گڑھ کالونی ـ کراچی ۷۵۸۰۰
- مکتبہ ، رشیدیہ، قاری منزل ـ پاکستان چوک ـ کراچی ۷۴۲۰۰
- مکتبہ ، بنوریہ، نیو ٹاؤن ـ کراچی
- مکتبہ ، قاسمیہ، اردو بازار ـ لاہور
- کتب خانہ ، رشیدیہ، مدینہ مارکیٹ ـ راولپنڈی
- مکتبہ ، رشیدیہ، سرکی روڈ ـ کوئٹہ
- کتب خانہ ، مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ـ ملتان

ناشر

مولانا احتشام الحق تھانوی اکادمی

کراچی

فہرست

ضمیمہ جات

حرف ناشر

مولانا احتشام الحق تھانوی اکادمی کی پہلی کتاب جو حضرت تھانوی کی آپ بیتی ہے، اصحاب ذوق کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔ یہ مولانا کی مکمل آپ بیتی نہیں، بلکہ پاکستان کے ایک نازک ترین دور کے ہیجان انگیز لمحوں کی کہانی ہے۔ اس دور میں مولانا تھانوی پر جو کچھ گزرا تھا اس میں انھوں نے وہ سب پوری صفائی کے ساتھ بے کم وکاست بیان کر دیا تھا۔ مولانا کے بیان سے بعض مقامات پر ظاہر ہوتا تھا کہ شاید جذبات میں وہ کچھ حقائق نظر انداز کر گئے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری کی رہنمائی وسعی سے اس میں جو ضمیمے شامل کر دیے گئے ہیں، ان کے مطالعے سے یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ جن حقائق، جماعت اسلامی کے جن افکار وعقائد، تحریک پاکستان کے دور میں اس کے جس رویے کی طرف مولانا تھانوی نے اشارہ کیا ہے اور اسلامی اتحاد کے قیام کی کوششوں میں قدم قدم پر جو رکاوٹیں وہ کھڑی کر رہی تھی اور جو مشکلات اس کا مغرورانہ رویہ پیدا کر رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں تو مولانا تھانوی کے اظہارات میں بہت اعتدال ہے۔ لیکن اب کہ یہ کتاب اصحاب ذوق اور اہل نظر کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے، مناسب نہ ہوگا کہ ذوق وفکر کے کسی خاص نکتے کی طرف ان کی رہنمائی کی جائے۔

مولانا احتشام الحق تھانوی کی یاد میں یہ اکادمی صرف یہی ایک کتاب شائع کرنے کے لیے قائم نہیں کی گئی۔ اولاً تو حضرت تھانوی ہی کے متعلق تصنیف اور تالیف وتدوین واشاعت کے کئی کام ہیں۔ ان کے حالات وخدمات کے تذکرے میں

ایک کتاب تو انشاء اللہ جلد ہی قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دی جائے گی ۔ مولانا تھانوی مرحوم کے خطبات پر کام ہو رہا ہے ۔ اور یہ شاید کئی جلدوں میں تکمیل پائے ۔ اس کے علاوہ ضرورت ہے کہ ان کی تفسیر جو روزنامہ جنگ کراچی میں ۱۵، ۱۶ سال تک شائع اور اس سے زیادہ عرصہ تک ریڈیو پاکستان سے نشر ہوتی رہی تھی ۔ اس کے حصول اور اس کی ترتیب و تدوین اور اشاعت کا انتظام کیا جائے ۔ اس کے علاوہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمہ کے سلسلے کی کئی شخصیات ہیں جن کی علمی، دینی اور ملی خدمات کے تعارف کی ضرورت ہے ۔ اگر ان بزرگوں کے متعلق تصنیف و تالیف پر اب بھی توجہ نہ کی گئی تو اس کام میں روز بہ روز مشکلات بڑھتی جائیں گی اور ان کی خدمات کے بہت سے پہلوؤں پر لکھنے والے ناپید ہوتے جائیں گے ۔ اور آئندہ نسلیں تحریک پاکستان، اس کی تعمیر و ترقی اور قوم و ملت کے مختلف دائروں میں ان کی عظیم الشان خدمات سے ناواقف رہ جائیں گی ۔

اس سلسلے کے کاموں کا آغاز کر دیا گیا ہے اور اکادمی کے محدود وسائل کی حد تک کام جاری بھی رہے گا (انشاء اللہ العزیز) ۔ لیکن اس قسم کے کام افراد کے کرنے کے نہیں ہوتے ۔ ان کے لیے بہت وسائل اور بہت سے اہل علم و فضل کے تعاون اور صلاحوں اور مشوروں کی ضرورت ہوتی ہے ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کون بزرگ اس کام میں ہماری رہنمائی اور سرپرستی فرماتے ہیں اور کتنے اصحاب علم و ذوق پیش نظر کاموں میں ہمارے ساتھ تعاون کے لیے آگے بڑھتے ہیں ۔ وما توفیقی الا باللہ

سیکریٹری

مولانا احتشام الحق تھانوی اکادمی

کراچی

مولانا احتشام الحق تھانوی کی آپ بیتی

ترتیب و تہذیب کی کہانی

ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

۱۹۷۱ء میں مجھے پہلی بار حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کی خدمت میں شرف یاب ہونے کا موقع ملا تھا۔ پہلی ملاقات میں مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ ہفت روزہ "چٹان" لاہور کے قاری ہیں اور میری متعدد تحریریں حضرت موصوف کی نظر سے گزر چکی ہیں اور "مکاتیب ابو الکلام آزاد" خاکسار کا مرتبہ مجموعہ حضرت کے مطالعے میں آچکا ہے۔

اسی زمانے میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع علیہ الرحمہ کا ایک فتویٰ پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام "بصیرت" کے پروڈیوسر کے بارے میں شائع ہوا تھا۔ اس میں حضرت نے فرمایا تھا کہ بصیرت کا اسلامی پروگرام اس کے قادیانی پروڈیوسر سے لے لیا جائے اور کارپوریشن کو یہ خدمت کسی مسلمان سے لینی چاہیے۔ حضرت مفتی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے بیٹے ولی رازی کے عبید اللہ علیم سے دوستانہ تعلقات تھے یا اس وجہ سے کہ انھیں بصیرت میں پروگرام ملتے تھے، اس لیے پروڈیوسر کی خاطر عزیز تھی۔ انھوں نے اپنے والد گرامی مرتبت کے فتوے کو مستفتی کی شرارت اور اپنے دوست سے اس کی ذاتی دشمنی کے پس منظر میں حضرت والد کی سادگی پر محمول کیا اور اپنے والد ماجد

حضرت مفتی صاحب کی معلومات میں اضافہ کرکے فتوے سے رجوع کروانے کے بجائے وہ عبید اللہ علیم کی دوستی میں ان کے ساتھ کراچی کے تین سو تیرہ ادیبوں کے دستخطوں کی مہم پر نکلے اور ایک جوابی بیان اشاعت کے لیے اخبارات کے نام جاری کیا گیا۔ دوسرے اخبارات نے تو اسے معمولی قرار دیتے ہوئے غیر نمایاں طور پر ایک کالم کی چند سطروں میں شائع کیا، لیکن روزنامہ جسارت، کراچی نے اسے دو کالمی جلی سرخی کے ساتھ زیادہ تفصیل کے ساتھ شائع کیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس پر جسارت کے ادارہ تحریر یا کالم نگاروں میں سے چار کے دستخط تھے۔ میرے قلب پر یہ بات گراں گزری کہ حضرت مفتی صاحب کے ایک اسلامی ودینی فتوے کو مسلمان ادیب رد فرمائیں اور دستخطوں کے لیے تین سو تیرہ کی تعداد کا اہتمام کیا جائے۔ جسارت کے ایڈیٹر اس زمانے میں نیر علوی صاحب تھے۔ میں نے خط لکھا اور قادیانیوں کے بارے میں ان کا عقیدہ اور ان کے ادارہ تحریر کا مسلک دریافت کیا۔ علوی صاحب نے التفات نہ فرمایا تو میں نے پہلے خط کی نقل کے ساتھ ایک اور خط رجسٹرڈ بھیج دیا۔ پھر بھی انھوں نے جواب نہ دیا تو میں نے تیسرا خط رجسٹرڈ بھیجا اور انھیں لکھ دیا کہ اب میں اس معاملے کو جسارت کے نگراں و منتظم اعلیٰ اور جماعت اسلامی کے امیر کو بھیجنے کے علاوہ اخبارات ورسائل کو بھی یہ خطوط جاری کر رہا ہوں۔ مشفق خواجہ صاحب کے ذریعے سے نیر علوی صاحب انجمن ترقی اردو (پاکستان) کے دفتر میں تشریف لائے اور بتایا کہ وہ اس بیان کے واقعی پس منظر سے بالکل ناواقف تھے۔ انھوں نے سلیم احمد، شمیم احمد، انجمن ترقی اردو کے ایک عالی قدر رکن، دیگر کارکنان اور بہت سے دوسرے بڑے بڑے ادیبوں کے نام دیکھے تو اشاعت کی منظوری دے دی۔ شمیم احمد اور انجمن کے دوسرے ارکان بھی نہیں چاہتے تھے کہ اس معاملے میں ان کا نام آئے۔ مشفق خواجہ صاحب کا مشورہ بھی یہی ٹھہرا کہ اس معاملے کو ختم کر دیا جائے۔ میں اس سے پہلے حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کی خدمت میں ایڈیٹر جسارت کے نام اپنے خطوط

کی نقول بھیج چکا تھا۔ چند روز گزرے ہوں گے کہ مشفق خواجہ صاحب نے بتایا:
"مولانا تھانوی صاحب کا فون آیا ہے اور وہ مجھے یاد فرمارہے ہیں"۔

میں شام کو انجمن سے اٹھا اور جیکب لائینز میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہو گیا یہ اوائل ۱۹۷۱ء کا واقعہ ہے۔ مولانا سے گفتگو ہوئی اور میں نے صورت احوال ان کے سامنے پیش کر دی۔ حضرت مولانا نے مشورہ دیا کہ جب تو نے اپنے دوستوں سے معاملے کو رفت گذشت کرنے کا وعدہ کر لیا ہے تو اب مناسب نہ ہو گا کہ اس سلسلے میں کچھ کیا جائے۔

اسی ملاقات میں حضرت مولانا نے کچھ لکھوانے کا عندیہ ظاہر فرمایا اور یہ کہ وہ میرے قلم پر اعتماد کر سکتے ہیں۔ مجھ پر مولانا کی شخصیت اور ان کے علم و فضل کا ایسا رعب چھایا ہوا تھا کہ میں نہ اس ذمہ داری کو قبول کر سکتا تھا اور نہ انکار ہی کرتے بن پڑتا تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ وہ کچھ لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو جذبات کا ایسا وفور اور افکار کا ایسا ہجوم ہوتا ہے کہ قلم اسے تحریر کرنے سے قاصر رہ جاتا ہے۔ البتہ ان جذبات کے زبانی اظہار اور افکار کے تقریری بیان میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ اس لیے اگر میں حضرت مولانا کے ساتھ تعاون کروں تو یہ کام آسان ہو سکتا ہے۔ وہ بولتے جائیں، میں لکھتا جاؤں۔ پروگرام طے پا گیا اور میں حضرت مولانا کے پاس جانے لگا۔ مولانا بیان فرماتے، میں لکھتا جاتا، کوئی واقعہ ہوتا تو تفصیل نظر انداز کر کے اشارہ لکھ لیتا، تاریخ نوٹ کر لیتا، کوئی بیان یا خط ہوتا تو اسے شامل کرنے کے لیے یادداشت تیار کر لیتا تھا پھر مولانا کے بیانات، خطوط وغیرہ لے کر ایک باب کے مضمون کو ترتیب و تالیف کے سانچے میں ڈھالتا اور مولانا کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ مولانا اسے ملاحظہ فرماتے اور واقعات کی ترتیب، مضامین کی کمی بیشی اور زبان و بیان کی اصلاح کے بارے میں مشورے اور ضروری ہدایات کے ساتھ مجھے واپس فرما دیتے۔ میں ہر کمی بیشی اور اصلاح و ترمیم حضرت مولانا کی ہدایات کے مطابق عمل میں لاتا رہا اور اپریل ختم ہونے سے

پہلے کتاب تیار ہو گئ۔ حضرت مولانا اس کام سے مطمئن اور تکمیل سے خوش ہوئے۔ مولانا کا اطمینان اور خوشی میرے لیے مسرت کا باعث تھی۔

حضرت مولانا کے افکار خیالات کی تالیف میں میں نے کوشش کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ حضرت مولانا ہی کی زبان میں قلم بند ہو۔ لیکن اس کی پابندی مشکل ہوئی۔ حضرت مولانا کے مفہوم و مطالب کو بہت جگہ میں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا تھا لیکن حضرت مولانا کی نظر ثانی اور اصلاح و ترمیم کے بعد اطمینان ہو جاتا تھا کہ اب وہ کلیتاً مولانا کا بیان ہو گیا ہے۔

۱۹۷۳ء میں مسودہ کتابت کے مرحلے سے گزر کر اشاعت کے لیے پریس کے حوالے کر دیا گیا اور امید تھی کہ ہفتے عشرے میں کتاب بازار میں آجائے گی لیکن مولانا نے کسی وجہ سے کام کو رکوا دیا۔ پھر اس کی اشاعت میں ایسا التوا پیدا ہوا کہ مولانا اللہ کو پیارے ہو گئے اور کتاب کی اشاعت کی نوبت نہ آئی۔ مزید ستم یہ ہوا کہ کتاب کا مسودہ و کتابت بھی واپس نہ ملی۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے حضرت مولانا مرحوم و مغفور کے صاحبزادگان کے پاس بھی نہ اس کا مسودہ ہے نہ ٹائپ کاپی اور نہ کتابت۔ مجھے اس بات سے خوشی ہوئی کہ میرے پاس اس کی ایک ٹائپ کاپی محفوظ تھی۔ بعض لوگوں کے علم میں یہ بات تھی اور اس کی اشاعت کے لیے انھوں نے مجھ سے اصرار بھی کیا۔ لیکن آج سے پہلے میں نے اس کی اشاعت کو مناسب نہیں سمجھا۔

جب یہ کتاب لکھی جا رہی تھی تو میرا ذہن جماعت اسلامی کے اس درجہ خلاف نہ تھا۔ حضرت مولانا نے مجھے بتایا کہ پاکستان اور ہندوستان میں مسلمانوں کے دونوں مکاتب فکر حنفی اور اہل حدیث اور حنفیوں کے دونوں فرقے دیوبندی اور بریلوی جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کی ضلالت اور گمراہی پر متفق ہیں اور جن اہل علم اور اصحاب نظر نے جماعت اسلامی کے افکار و عقائد پر تحقیق کی ہے۔ وہ اپنی اپنی تحقیق کے مطابق انھیں رافضی، خارجی، باطنی، پرویزیوں اور قادیانیوں سے بدتر، منکر حدیث

وسنت اور کافر تک قرار دیتے ہیں ۔ بریلوی مکتبہ فکر کے نزدیک وہ کافر ہیں ۔ مولانا نے فرمایا تھا کہ آپ انھیں کچھ اور نہ مانیے لیکن ان کی گمراہی کا فتویٰ تو مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے نزدیک متفق علیہ ہے ۔ اور کسی مکتبہ فکر کے علما کا متفقہ فتویٰ اس مکتبہ فکر کے ماننے والوں کے لیے حکم شرعی کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کسی فتوے پر متفق ہو جائیں تو وہ پوری امت کے لیے واجب التعمیل ہو جاتا ہے ۔ اس وقت تو شاید میں مولانا کے رعب علمی کی وجہ سے خاموش ہو گیا تھا ۔ لیکن بعد کے مطالعے نے مجھ پر حضرت مولانا تھانوی کے استدلال کی قوت کو پوری طرح واضح کر دیا ۔ اب میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان پاکستان کا کوئی مسلمان اس وقت تک سچا مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی گمراہی پر ایمان نہ لے آئے ۔ کسی اور ملک کے مسلمانوں کا استثنا کیا جا سکتا ہے ، جہاں کے علمائے حق نے اس جماعت اور اس کے بانی امیر کے بارے میں کوئی تحقیق نہ کی ہو ۔ لیکن ہندوستان پاکستان کے مسلمانوں کو ان کی گمراہی بہ طور اجماع امت اور کل ملت اسلامیہ کے متفقہ شرعی فتوے کی حیثیت سے تسلیم کر لینا چاہیے ۔ گزشتہ بیس اکیس سال کے مشاہدے اور مطالعے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جماعت اسلامی جماعت ضرور ہے ، لیکن اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ۔ اس جماعت میں صاحب اخلاص مسلمان ضرور ہیں لیکن یہ جماعت بہ حیثیت جماعت کے مسلمان نہیں ۔

اکثر جماعت اسلامی والے اپنے تئیں دیو بندی اور بعض اہل حدیث ظاہر کرتے ہیں ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سلفی ہوتے ہیں ، نہ حنفی ۔ جب ان کی زبانوں سے یہ الفاظ ادا ہوتے ہیں تو ان کے دل نفاق سے بھرے ہوتے ہیں ۔

دیو بند ایک مکتبہ فکر ہے ، وہ ایک علمی ، دینی ، فکری روایت ہے ۔ اس کی ایک تاریخ ہے ۔ دیو بند علمائے حق کے ایک سلسلتہ الذہب کا نام ہے ۔ اس سلسلے کی مختلف و متواتر کڑیاں اس کے اسلاف کرام کے قابل فخر ناموں سے معنون ہیں ۔

دیو بند ایک فکر، انداز فکر اور علم و عمل کے حسن توازن کا نام ہے۔ اس کے اکابر اسلامی اعتقادات اور اعمال صالحہ میں حق اور اعتدال کی مثال ہیں۔

اہل حدیث کے فکر و نظر کا پیمانہ تو حنفیت سے بھی بلند ہے۔ انھوں نے اپنے آشیانے کے لیے کتاب و سنت کی بلندیوں کو اور نمونہ۔ عمل کے لیے سلف صالحین کو اپنا آئیڈیل بنایا ہے۔ وہ پستیوں کے نہیں بلندیوں کے باسی ہیں۔ ان کے لیے وقت کی کسی سیاسی یا نیم مذہبی جماعت یا نیم عالم شخصیت سے عہدِ اطاعت استوار کرنا اور کتاب و سنت کے بجائے کسی جماعت کے امیر کو علی الاطلاق مطاع اور حکم تسلیم کر لینا تقلید سے پست درجے کی چیز ہے۔ کوئی شخص اہل حدیث ہوتے ہوئے جماعت اسلامی سے اتفاق یا اس کی رکنیت کا فارم پر کر ہی نہیں سکتا اور اگر کوئی اہل حدیث اتفاق ور کنیت کا فارم پر کرتا ہے، امیر کی اطاعت اور جماعت کے نظم کی پابندی کا عہد اٹھاتا ہے تو یا تو

(۱) وہ سلفیت سے اپنے تئیں الگ کر لیتا ہے اور اتباع کتاب و سنت کے دعوے سے دستبردار ہو جاتا ہے اور ایک دوسرے مرکز ثقل سے اپنا تعلق پیدا کر لیتا ہے۔

(۲) وہ جماعت کے نظم اور امیر کی اطاعت کو گویا کتاب و سنت پر ترجیح دیتا ہے۔ حالاں کہ کسی جماعت کا نظم، درست، اغراض و مقاصد صحیح اور اس کے لیے سعی نیکی قرار پا سکتی ہے۔ نیز معروف میں امیر کی اطاعت قطعاً جائز ہے۔ لیکن اس جماعت کے اغراض و مقاصد کتاب و سنت کے برابر اور اس کے نیم عالم امیر کی اطاعت کسی صحابی رسولؐ کی اقتدا کا بدل نہیں ہو سکتی۔

(۳) اگر کہا جائے کہ یہ اطاعت فی المعروف ہے، نہ کہ فی المعصیت کہ ارشاد نبویؐ لاطاعۃ المخلوق فی معصیۃ الخالق، عام ہے تو مودودی صاحب سے لے کر قاضی حسین احمد تک جماعت اسلامی کے امیروں کی پیروی کے مقابلے میں حضرت امام ابو حنیفہ اس اطاعت و پیروی کے کہیں زیادہ مستحق قرار پائیں گے۔

جماعت اسلامی والے صحیح ہوں یا غلط، وہ دیو بندی یا اہل حدیث نہیں ہو سکتے۔ اگر اس کا کوئی متفق یا رکن اپنے تئیں دیو بندی یا اہل حدیث ظاہر کرتا ہے تو وہ درحقیقت مخاطب کو فریب دیتا ہے۔ جماعت اسلامی کے اپنے معتقدات ہیں، اس کا اپنا نظام فکر ہے، وہ نہ صرف مذہبی طور پر بلکہ معاشرتی طور پر بھی ایک الگ تنظیم ہے۔ جماعت اسلامی مسلمانوں سے الگ ایک مستقل مذہب ہے۔ لیکن اس کا اپنے تئیں حنفیوں، دیو بندیوں، بریلویوں اور اہل حدیث یا کسی اور شافعی، مالکی، حنبلی مسلک سے الگ تسلیم کرنا اس کے باطنی مقاصد کے خلاف ہے۔ چوں کہ انھیں مسلمانوں ہی میں کام کرنا ہے۔ اس لیے ان کے لیے ضروری ہے کہ حالات و وقت کے مطابق مسلمانوں ہی کے کسی مکتب فکر سے وابستہ ہونے کا فریب دیں۔

مسئلے پر اس پہلو سے بھی غور کیجیے کہ ان کے دیو بندی یا اہل حدیث ہونے کا فیصلہ کون کرے گا؟ آیا ان کا مجرد دعویٰ اس کے لیے کافی ہے کہ انھیں دیو بندی یا اہل حدیث تسلیم کر لیا جائے؟ یا ان مکاتب فکر کے علما، ان کے علمی مراکز، ان کی دینی درس گاہیں اور ان کے معروف دارالافتا۔ یہ فیصلہ کریں گے کہ ان سے تعلق کے دعوے میں یہ سچے ہیں یا نہیں؟ اگر کسی مذہب، مکتبہ فکر یا مسلک سے تعلق کا مجرد دعویٰ قابل قبول ہو سکتا تو قادیانیوں کا مسلمان ہونا تسلیم کر لیا جاتا کہ وہ شہادتیں کو مانتے ہیں اور آیہ۔ ختم نبوت پر ایمان کے مدعی ہیں۔ وہ اس کا انکار نہیں کرتے، تاویل کرتے ہیں۔ لیکن معلوم ہے کہ ان کا مجرد دعویٰ ان کے مسلمان تسلیم کیے جانے میں بالکل مفید ثابت نہیں ہوا۔ اور جو بات تسلیم کی گئی وہ ان کا اسلام سے خارج ہونا ہے ٹھیک اسی اصول کے مطابق جماعت اسلامی کے کسی متفق یا رکن کو اس کے محض دعوے کی بنیاد پر دیو بندی یا اہل حدیث مسلمان تسلیم نہیں کر لیا جا سکتا۔

یہ فیصلہ کہ وہ کیا ہیں؟ ان ہر دو مسالک کے علمائے دین، ان کے مراکز علمیہ و دینیہ اور ان کے دارالافتا۔ کریں گے۔ پھر کیا یہ حقیقت نہیں کہ دیو بندی مکتب فکر

کے تمام مراکز دارالعلوم (دیو بند)، مظاہر العلوم (سہارن پور)، مدرسہ امینیہ (دہلی)، مدرسہ شاہی (مراد آباد)، دارالعلوم ندوۃ العلماء (لکھنو) کے سیکڑوں اساتذہ، علمائے دین، فقہا و مفتیان کرام، حدیث و تفسیر کے شیوخ عظام ہیں اور ان کے نزدیک جو بات متفق علیہ ہے وہ جماعت اسلامی اور اس کے امیر کا گمراہ ہونا ہے، نہ کہ ان کا دیو بندی مسلمان ہونا۔ پھر پورے ہندوستان کے علاوہ صرف پاکستان میں دیو بندی مکتب فکر کے سیکڑوں مدارس اور ان کے ہزاروں علمائے دین ہیں جن کا ٹھیک یہی مسلک ہے۔ اسی طرح سلفی مسلک کے ہندوستان اور پاکستان میں سیکڑوں دارالعلوم اور صرف ان میں درس و افتا کے فرائض انجام دینے والے ہزاروں علما و مفتی ہیں جو جماعت اسلامی اور اس کے امیر کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ پھر بریلوی حضرات تو ان کے کفر پر اصرار کرتے ہیں۔ اس لیے جماعت اسلامی کو ایک الگ مذہب تو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ انھیں دیو بندی، اہل حدیث یا بریلوی مسلمان نہیں مانا جا سکتا۔

اس جماعت کے سیاسی کردار نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ اس پر کبھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور جو جماعتیں آئندہ اسے کسی محاذ یا فرنٹ میں شامل کریں گی وہ مسلمانوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائیں گی اور بالآخر خود بھی پچھتائیں گی۔ اس کی بے وفائیوں کی داستاں طویل ہے۔ اس نے کب کسی جماعت سے معاہدہ کیا اور دھوکا نہیں دیا اور بیچ منجدھار میں نہیں چھوڑ دیا۔ مسلم لیگ سے آخری اتحاد (آئی جی آئی) بھی اس شان کے ساتھ قائم تھا کہ جماعت کے کچھ افراد محمد نواز شریف کی سابق حکومت کو مسلسل نشانہ تنقید بنائے ہوئے تھے، کچھ لوگ حزب اختلاف کی جماعتوں سے راہ و رسم بڑھا رہے تھے، چند حضرات وزیر اعظم کو تسلیاں دے رہے تھے اور ٹھیک اسی وقت ایک الگ متحدہ اسلامی محاذ بھی تشکیل دے رکھا تھا۔

میرا خیال ہے کہ مولانا احتشام الحق تھانوی کے بعد مولانا شاہ احمد نورانی کی بصیرت نے جماعت اسلامی کی حقیقت کو جس طرح سمجھا ہے وہ کسی اور نے نہیں

سمجھا۔ جمعیت علماے اسلام کے مولانا فضل الرحمان کی دینی اور سیاسی بصیرت پر بھی پورا اعتماد ہے۔ امید ہے کہ کوئی دوسری جماعت بھی اسلام کے نام پر اس سے اتحاد کے فریب میں مبتلا نہیں ہو گی لیکن مجھے خطرہ ہے کہ اہل حدیث اور دیو بندی جماعت کے کچھ لوگ اس سوراخ سے ایک بار پھر ڈسے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ انھیں اس کے ضرر سے محفوظ رکھے۔

اس کتاب کے سلسلے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مولانا تھانوی مرحوم اس میں جماعت اسلامی کے سیاسی کردار، مذہبی عقائد وغیرہ کے بارے میں بعض ضمیمے شامل کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ لیکن اس وقت انھوں نے یہ ضمیمے تیار نہیں کرائے تھے اب اس کی اشاعت کی ذمہ داری میں چوں کہ میں بھی شامل ہو گیا ہوں اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ اس میں چند ضمیمے شامل کر دیے جائیں تاکہ حضرت مولانا نے اپنے بیانات میں جماعت اسلامی کے مذہبی افکار و عقائد اور سیاسی کردار کے بارے میں جو اشارات کیے تھے، ان کی وضاحت اور ثبوت مہیا ہو جائے۔

ضمیموں کے لیے مواد کی فراہمی اور ان کی تالیف و تدوین میں شاہد حسین خان اور قاری تنویر احمد شریفی سلمہما نے بہت مدد کی ہے۔ مولانا تھانویؒ کا انتقال ہو جانے کے بعد ان کے حالات و خدمات میں ایک مقالے کی شمولیت ضروری معلوم ہوئی۔ تنویر سلمہ نے یہ مقالہ میری فرمائش پر لکھ کر عنایت کیا۔ عزیز گرامی کے مقالے پر نظر ثانی اور بعض اصلاح و ترمیم مناسب سمجھیں اور ضمیموں میں بھی بعض مباحث اور تبصروں کا اضافہ ضروری معلوم ہوا، سو اس سے قلم کو روکا نہیں۔ مجھے امید ہے کہ عزیزان گرامی کچھ خیال نہ فرمائیں گے۔

امید ہے کہ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کی یہ آپ بیتی حضرت مرحوم کے حالات و خدمات میں اس مقالے اور متعدد ضمیموں کے اضافے سے زیادہ مفید ہو گئی ہے۔

کتاب کے نام کے بارے میں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ حضرت مولانا تھانوی مرحوم نے اس کا نام "اسلام پسندوں کے انتشار میں جماعت اسلامی کا حصہ" رکھا تھا۔ لیکن میرے خیال میں اس کی اہمیت اس میں ہے کہ یہ حضرت مولانا کی آپ بیتی ہے اور اس کا یہ پہلو نمایاں ہونا چاہیے تھا۔

مولانا احتشام الحق تھانوی

حیات و خدمات

قاری تنویر احمد شریفی

مولانا احتشام الحق تھانویؒ کا نام زبان پر آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ کسی گلستان ہزار رنگ کی دل آویز داستان کھل گئی ہے اور ایک بلبل ہزار داستان ہے جو اپنے نوع بہ نوع نغموں سے سیر کنندگان گلستان کے دلوں کو لبھا رہا ہے اور اپنی خوش الحانی وخوش بیانی سے بے پایاں لطف بخش رہا ہے ۔ مولانا تھانوی مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں علم وفضل کی بے شمار خوبیوں اور فکر ونظر کے بہت سے خصائص سے نوازا تھا ۔ پھر وہ صرف ایک عالم دین اور صاحب فکر شخص ہی نہ تھے ، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انھیں خدمت قوم ووطن کی توفیق بھی ارزانی فرمائی تھی ۔ علم اور عمل کے دونوں میدانوں میں انھوں نے امت مسلمہ کی بیش از بیش رہنمائی فرمائی اور خدمات انجام دیں ۔ وہ ایک ایسے عالم دین تھے جن کی رہنمائی کا دائرہ محراب ومنبر سے لے کر عملی زندگی کے مختلف میدانوں تک وسیع ہوتا ہے ۔ ان کی خدمات کسی ایک دائرے تک محدود نہیں تھیں ۔ پاکستان کی تحریک اور اس کے قیام سے لے کر اس کی تعمیر وترقی تک تاریخ میں ان کی رہنمائی کے نقش ثبت ہیں ۔ قیام پاکستان

کے بعد اس مملکت پر جب بھی کوئی براوقت آیا، اس کے نظریے پر کوئی حملہ ہوا، اس کے دفاع کو کوئی خطرہ لاحق ہوا، کسی شخص یا جماعت نے اس کے قیام کے مقاصد کے برخلاف رہنمائی کی اور جب بھی کسی فتنے نے سر اٹھایا مولانا احتشام الحق تھانوی قوم کی رہنمائی کے لیے فوراً میدان میں آگئے اور اپنی پرجوش تقریروں سے، فکر انگیز بیانات سے صلاحوں اور مشوروں سے، ایثار وقت ومال سے، فکری نظریے اور جغرافیائی سرحدوں کے دفاع کے لیے، قیام پاکستان کے مقاصد کی تعلیم و تبلیغ اور توضیح کے لیے اور فتنوں کی سرکوبی کے لیے اپنے علم و عمل کی بہترین صلاحیتوں سے قوم کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ان کی سیاست صرف ڈرائنگ روم تک محدود نہ تھی، بلکہ عملی زندگی کے ہر میدان کے شدائد اور کٹھن مرحلوں سے گزر کر جیل خانے کی سلاخوں کے پیچھے اور نظربندی کی پابندیوں تک وسیع ہوتی چلی گئی تھی۔اللہ تعالیٰ نے انھیں بے شمار علمی خصائص، ذہن ودماغ کی بہترین صلاحیتوں اور فکر ورائے کی اصابت سے نوازا تھا اور عزیمت دعوت کے بلند مقام پر فائز کیا تھا۔ان کا تعلق دیوبندی مکتبہ فکر کی تھانوی جماعت سے تھا اور اس جماعت کے اکابر واصاغر میں وہ ایک خاص امتیاز کے مالک تھے اور کم از کم تھانوی جماعت میں تو کوئی عالم دین ان کے اس امتیاز میں شریک نظر نہیں آتا۔

خاندان:

مولانا احتشام الحق تھانوی کا تعلق کیرانہ ضلع مظفر نگر (یو۔پی) کے ایک معزز اور سربرآوردہ صدیقی خاندان سے تھا۔اس خاندان کے افراد پورے ضلع میں اپنی خاندانی روایات، شرافت، وضع داری اور خدمت خلق کے لیے مشہور تھے۔یہ خاندان ایک علمی خانوادہ تھا۔اس کے افراد دینی علوم کے ذوق کے ساتھ دنیاوی علوم سے بھی بہرہ مند تھے اور اگرچہ بعض افراد خاندان نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی اور

مناصب قبول کر لیے تھے۔ لیکن عام طور پر زمینداری ان کا ذریعہ معاش، مسلمانوں کی اصلاح و تعلیم ان کا مقصد حیات اور طب کے ذریعے عامہ۔ خلائق کی خدمت ان کی زندگی کا مشن ہوتا۔ مولانا تھانوی کے والد گرامی مرتبت مولانا ظہور الحق تھانوی اپنے خاندان میں ایک خاص امتیاز کے مالک تھے۔ وہ ایک عالم دین اور نہایت متقی و پرہیز گار بزرگ تھے۔ انھیں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ سلوک و تصوف اور طریقت میں وہ شیخ المشائخ حضرت مولانا امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت اور حضرت کے فیوضات سے استفاضے کی سعادت حاصل تھی۔ حضرت حکیم الامت نے ان کی سعادت مندی، فیروز بختی اور نیک اطواری سے متاثر ہو کر اپنی چھوٹی بہن کو ان کے حبالہ۔ عقد میں دے دیا تھا۔ یہ مرحومہ خود حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی سے رشتہ بیعت میں منسلک اور علوم ظاہری و باطنی سے شرف یاب تھیں۔ اس طرح مولانا ظہور الحق تھانوی کے گھر میں فیض کی کئی ندیاں رواں تھیں۔ ان کا گھرانہ بہ یک وقت امدادیہ، محمودیہ اور اشرفیہ علوم و معارف و شریعت و طریقت کے سر چشموں سے فیض یاب اور وقت کے حکیم الامت سے نسل و خون کے رشتوں میں منسلک تھا۔

مولانا ظہور الحق کی اولاد:

مولانا ظہور الحق نے زندگی میں تین شادیاں کی تھیں۔

۱.... پہلی شادی مولانا اشرف علی تھانوی کی بہن امتہ الوہاب سے ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بطن سے انھیں چار بیٹے اور ایک بیٹی عطا فرمائی۔

بڑے بیٹے کا نام عزیز الحق تھا۔ دینی علوم کی باقاعدہ تحصیل نہیں کی تھی لیکن مطالعہ خوب تھا اور واقفیت بہت اچھی تھی۔ گریجویشن الہ آباد یونی ورسٹی سے کیا تھا۔ گورنمنٹ سیکریٹریٹ نئی دہلی میں ملازم تھے اور غالباً اسسٹنٹ سیکریٹری تھے۔

ملازمت کے سلسلے میں پاکستان آگئے تھے۔ری ہیب لی ٹیشن کے محکمے میں ملازم تھے پھر کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی (کے۔ڈی۔اے) میں آگئے تھے اور بقول ماہر القادری مرحوم چیئرمین کے بعد سب سے بڑا عہدہ ان کا تھا۔نیک سیرت، پاک طینت، ضرورت مندوں کی مدد کرنے والے، دیانت دار، صوم وصلوۃ کے پابند، متقی اور ظاہر وباطن سے متشرع شخص تھے۔شاعری کا شوق بھی تھا ان کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ "گفتار عزیز کے نام سے چھپ چکا ہے۔صاحب اولاد تھے۔غالباً مئی ۱۹۷۶ء میں انتقال فرمایا۔ماہر القادری مرحوم نے جون ۱۹۷۶ء کے فاران میں ان کی وفات پر تعزیتی مضمون لکھا ہے۔ فیڈرل بی ایریا کے علاقے میں عزیز آباد کی بستی انھی مرحوم کے نام پر بسائی گئی ہے۔

دوسرے بیٹے مولانا احتشام الحق تھانوی تھے۔جن کے حالات میں یہ مفصل مقالہ ہے۔

تیسرے بیٹے اعتماد الحق صدیقی تھانوی تھے۔مستند عالم دین نہ تھے۔لیکن دین سے خوب واقف تھے۔مطالعہ وسیع تھا۔نیک سیرت، پاک طینت اور پابند صوم وصلوۃ شخص تھے۔ان کی پیدائش ۴۔اگست ۱۹۱۹ء کو تھانہ بھون میں ہوئی تھی اور وفات ۱۵۔جون ۱۹۸۹ء بہ روز جمعرات کراچی میں ہوئی۔سوسائٹی کے قبرستان میں محوخواب ابدی ہیں۔کتبے پر تاریخ پیدائش ووفات درج ہے۔اور یہ شعر بھی:

انوکھی چمک اس کے چہرے پہ تھی
مجھے کیا خبر تھی کہ مر جائے گا

شاعری کا شوق انھیں بھی تھا اور یہ شعر غالباً انھیں کا ہے۔

چوتھے بیٹے عماد الحق تھے۔ان کے حالات کا علم نہیں ہوسکا۔یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ اپنی بہن سے بڑے تھے یا مولانا ظہور الحق کی پہلی بیوی کی سب سے چھوٹی اولاد تھے۔

پہلی بیوی کے بطن سے مولانا کی ایک بیٹی یادگار ہے اور اس وقت (جون

۱۹۹۳ء میں) جب کہ یہ سطریں لکھی جارہی ہیں ۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ بحمد اللہ بہ قید حیات ہیں اور کراچی میں مقیم ہیں۔

۲۔۔۔ مولانا ظہور الحق کی پہلی بیوی کا انتقال ان کی بیٹی یا عماد الحق کی پیدائش کے بعد ہو گیا تھا۔ بچے چھوٹے تھے ان کی پرورش، نگہداشت اور تعلیم و تربیت کا مسئلہ پریشان کن تھا۔ عزیزوں کا اصرار ہوا کہ انھیں دوسری شادی کر لینی چاہیے ۔چناں چہ خاندان ہی کی ایک نیک سیرت لڑکی سے ان کا عقد ثانی کر دیا گیا۔ان خاتون سے مولانا ارشاد الحق تھانوی ان کی یادگار ہیں ۔ مولانا ارشاد الحق تھانوی کا شمار پاکستان کے اصحاب نظر اور ارباب بصیرت وتدبر میں ہوتا ہے ۔ان کے افکار عالیہ سے اخبار بین اور دینی وسیاسی ذوق رکھنے والے اکثر مستفید ہوتے رہتے ہیں۔

۳۔۔۔ مولانا ظہور الحق کی دوسری بیوی کا انتقال بھی جلد ہو گیا تھا۔ان کے بعد گھر بار کی دیکھ بھال، بچوں کی نگہداشت اور تعلیم و تربیت کی ضرورت نے انھیں پھر شادی کرنے پر مجبور کیا۔ اس مرتبہ ان کی پہلی بیوی کی چھوٹی بہن امتہ المنان ان کے حبالہ ٔ عقد میں آئیں ۔ لیکن جہاں تک معلوم ہوا ہے ان کی کوئی اولاد یادگار نہیں ۔ مرحومہ کا انتقال کراچی میں ہوا۔ پاپوش نگر کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی ۔ یہ چوں کہ مولانا احتشام الحق تھانوی کی خالہ بھی تھیں ۔وہ انھیں خالہ کے رشتے ہی سے مخاطب فرماتے تھے اور ماں کی طرح ان کا احترام کرتے تھے۔

مولانا ظہور الحق تھانوی قیام پاکستان کے ساتھ ہی کراچی تشریف لے آئے تھے انھوں نے کیرانہ میں اپنی زمینداری اور کیرانہ و دہلی میں لاکھوں روپے کی جائیداد چھوڑی تھی ۔ لیکن یہاں اس کے بدلے اولاً تو کسی جاگیر و جائیداد حاصل کرنے کی طرف توجہ نہیں دی ، پھر احباب و واقفین کے زور دینے پر توجہ کی تو انھیں اس کا عشر عشیر بھی حاصل نہ ہوا۔ان کا خاص ذوق گوشہ گزینی و خلوت نشینی تھا۔ان کا زیادہ وقت اوراد و وظائف اور عبادت الہی میں گزرتا تھا۔ نہایت متقی اور زاہد شب زندہ دار تھے ۔ وہ

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے بہنوئی تھے، لیکن حضرت حکیم الامت ان کے استاد تھے اور انھیں اپنے استاد سے عشق تھا۔ حضرت حکیم الامت کے علوم ومعارف پر گہری نظر رکھتے تھے اور ذوق وفکر کے انھی حکیمانہ سانچوں میں ڈھل گئے تھے، جو حضرت حکیم الامت تھانوی کا مقصود تھا۔ وہ حضرت تھانوی کے اخلاق وسیرت کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ مولانا احتشام الحق جامع مسجد جیکب لائنز میں جمعہ کی امامت وخطابت فرماتے تھے۔ اگر وہ کبھی سفر میں ہوتے تو یہ فرض مولانا ظہور الحق ادا فرماتے تھے۔ تقریر فرماتے تھے، خطبہ دیتے اور نماز پڑھاتے تھے۔ جن لوگوں کے کان حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کی خطابت سے آشنا اور سامعہ حضرت کی آواز سے لذت اندوز نہیں ہوا، وہ اس کی خوبیوں کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ حضرت مولانا قاری شریف احمد مدظلہ فرماتے ہیں کہ مولانا ظہور الحق کی خطابت حضرت حکیم الامت تھانوی کی خطابت کا عین عکس تھی۔ اس حد تک کہ اگر وہ سامنے نہ ہوں تو لذت آشنائے خطابت حکیم الامت پہچان بھی نہ سکے۔ آواز، مضمون، تقریر، طرز استدلال اور انداز بیان سب کچھ وہی محسوس ہوتا تھا۔

مولانا ظہور الحق کا انتقال:

مولانا ظہور الحق کا انتقال کراچی میں ۶۔ ذی قعدہ ۱۳۷۴ھ م ۲۶۔ جون ۱۹۵۵ء کو ۷۶ برس کی عمر میں ہوا تھا۔ عمر کی اس صراحت سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی پیدائش ۱۲۹۸ھ میں ہوئی ہو گی۔ اسد ملتانی کا رقم کردہ قطعہ۔ تاریخ وفات ان کی لوح تربت پر کندہ ہے۔ چوں کہ اس قطعے سے ان کی اولاد ذکور اور بعض خصائص علم وسیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے نقل کیا جاتا ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا ظہور الحق رحمۃ اللہ علیہ

وفات شب دوشنبہ ۶۔ذی قعدہ ۱۳۷۴ھ بہ عمر ۷۶سال

عزیز الحق غمیں شد از وفات والد ماجد ہم ارشاد وعماد واعتماد واحتشام الحق
بزرگے زندہ دل بود بہ علم واتقا یکتا علومش جملہ مستحضر دلش در شوق مستغرق
گہے نطق بلیغش منبر ومحراب را زینت گہے طبع لطیفش محفل احباب را رونق
بہ فیض صحبت اشرف علی از ہمدمان اشرف زصدق حضرت صدیقؓ طبعاً صادق واصدق
نہ ریزد ہیچ برگے جز بہ حکم خالق عالم نہ میرد ہیچ کس الا بہ امر قادر مطلق

اسد گر چار سال دیگر اورا زندگی بودے
شدے تاریخ رحلت - مولانا ظہور الحق -

۱۳۷۸-۴ = ۱۳۷۴ھ

(خفتگان کراچی از پروفیسر محمد اسلم، ۱۹۹۱ء، لاہور)

مولانا ظہور الحق پی ای سی ایچ سوسائٹی کے قبرستان میں آسودہ خواب ابدی ہیں۔

پیدائش:

مولانا احتشام الحق تھانوی ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ء) میں یوپی کے شہر اٹاوہ میں پیدا ہوئے۔وہ چار بھائی تھے۔شرافت اور سعادت مندی حسب توفیق سب کے حصے میں آئی لیکن علم دین کی دولت کے لیے مشیت ایزدی نے احتشام الحق کو منتخب کرلیا۔اور مشیت ایزدی کے اس انتخاب نے دنیا کی عزت وشہرت میں سے وہ سب کچھ انھیں بھی عطا کردیا۔جس کی تلاش میں ان کے دوسرے بھائیوں نے اسکول، کالج اور یونی ورسٹی کا رخ کیا تھا۔پھر بھی وہ انھیں میسر نہ آئی۔آج انھیں دنیا میں کوئی نہیں جانتا کہ وہ دنیا میں زندہ بھی ہیں اور اگر وہ مرگئے ہیں تو کہاں آسودہ خاک ہیں۔لیکن وہ جو خدا کی تلاش

میں اور اس کے دین کی خدمت کے لیے نکلا تھا اور شاید اس کے بارے میں کہا گیا ہو کہ اس کے عزم وسعی کا میدان کسی مسجد کے صحن سے زیادہ وسیع نہیں ہو سکتا، وہ آج لاکھوں مسلمانوں کی عقیدتوں اور ارادتوں کا مرجع ہے۔اس کے عزائم کی بلندی نے کئی مساجد ومدارس کی شکل میں فیضان خداوندی کے چشمے جاری کر دیے ہیں۔ان کے انتقال پر کامل بارہ برس گزر چکے ہیں۔لیکن یقین ہے ان بارہ برسوں میں کوئی صبح یا شام ایسی نہ گزری ہو گی جب ان کی مغفرت اور بلندی درجات کے لیے کسی مسجد، مدرسے یا خانقاہ میں ہاتھ نہ اٹھے ہوں۔

تعلیم:

حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کی تعلیم کا آغاز قرآن مجید سے تھانہ بھون کے تاریخی مدرسہ امدادیہ سے ہوا۔جہاں انھیں حضرت حکیم الامت تھانوی کی سرپرستی حاصل تھی۔۱۹۲۷ء میں کہ ابھی ان کی عمر بارہ برس سے زیادہ نہ تھی۔قرآن مجید کے حفظ کی سعادت حاصل کی۔اس کے بعد کچھ عرصہ میرٹھ میں رہ کر مولانا محمد اختر سے فارسی کی ابتدائی کتابوں کی تحصیل کی۔عربی کی تعلیم کے لیے مدرسہ مظاہر العلوم سہارن پور میں داخلہ لیا، جہاں انھیں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کی خصوصی توجہ اور سرپرستی حاصل رہی۔۱۹۳۰ء میں آپ کا شوق دارالعلوم دیوبند کھینچ کر لے گیا۔۔جہاں وقت کے حدیث، تفسیر، فقہ، ادب وغیرہ میں عالم اسلام کے نامور اساتذاے کرام موجود تھے۔مولانا نے تقریباً سات سال دارالعلوم دیوبند میں گزارے اور وقت کے نامور اساتذہ جن میں شیخ التفسیر علامہ شبیر احمد عثمانی، شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی، شیخ الادب مولانا اعزاز علی، معقولات میں علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، فقہ میں مولانا مفتی محمد شفیع (رحمہم اللہ اجمعین) سے استفادہ کیا۔ان کا شمار دارالعلوم (دیوبند) کے لائق وفائق ترین طلبہ میں ہوتا تھا۔اور الحمد للہ کہ پاکستان میں ان کا وجود گرامی

دارالعلوم کے لیے فخر کا موجب ثابت ہوا۔

مولانا تھانوی ۱۹۳۷ء میں دارالعلوم سے فارغ ہوئے۔ اس وقت تک برعظیم پاک وہند کی سیاست میں وہ شوراشوری پیدا نہ ہوئی تھی جو بعد کی خصوصیت تھی اور جس کے اثرات سے دارالعلوم کے دیوار و در بھی متاثر ہوئے۔ وہ سیاست میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد سے متاثر نہ تھے۔ جب انھوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو چند برسوں میں ملک میں سیاست کا طوفان آچکا تھا۔ اس زمانے میں ان کے سیاسی ذوق نے حضرت حکیم الامت تھانوی کی سرپرستی میں تربیت پائی اور علامہ شبیر احمد عثمانی کی صحبت ورہنمائی میں آگے کی منازل طے کیں۔

دارالعلوم دیوبند کا فیضان:

دارالعلوم دیوبند میں قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم جس معیار پر اور جس انداز سے دی جاتی تھی اس کا جو امتیاز ہے وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا اور تمام عالم اسلامی میں اپنی مثال آپ ہے۔ لیکن کسی دارالعلوم یا یونی ورسٹی میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ علم کی انتہا نہیں ہوتی۔ دارالعلوموں اور یونی ورسٹیوں کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہوتا ہے کہ وہ طالب علم کی ذہنی وفکری تربیت کر دیتی ہیں۔ ان میں علمی ذوق پیدا کر دیتی ہیں اور دل میں شوق علمی کی ایسی شمع روشن کر دیتی ہیں کہ وہ اس کی روشنی میں زندگی بھر علم وحکمت کے لیے سرگرداں رہتا ہے اور جہاں کہیں بھی اسے علم وحکمت کی کوئی پونجی نظر آجاتی ہے اس کی طرف دوڑتا ہے اور اسے حاصل کر لینے کی سعی میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اس کی نظر اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ علم وحکمت کی یہ پونجی کس کے پاس ہے۔ طلب علم کے میدان میں وہ اپنے اور بیگانے سے بے نیاز ہو جاتا ہے اس کی نظر چہروں پر نہیں پڑتی، وہ صرف یہ دیکھتا ہے کہ کسی کے منہ سے علم وحکمت کے کیا پھول برس رہے ہیں۔ وہ ان پھولوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے اور علم

وحکمت کے موتیوں کو اپنی جیب ودامن میں بھر لینے اور زیب گلو بنالینے کا آرزومند ہوتا ہے۔ ایسا فارغ عن التحصیل طلب علم سے کبھی فارغ نہیں ہوتا، وہ زندگی بھر علم کا شائق اور طالب علم ہی رہتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی تعلیم کا یہ بہت بڑا فیضان تھا کہ اس نے مولانا احتشام الحق کو علم کا حقیقی جویا وشیدا بنا دیا۔ وہ زندگی بھر حصول علم وحکمت میں مشغول رہے۔ ان کی طالب علمی کا زمانہ ان کی موت تک وسیع ہوتا اور پھیلتا چلا گیا تھا۔ جن حضرات کو مولانا کے قرب کی سعادت اور ان کی مجلسوں میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا ہے، وہ جانتے ہیں کہ مولانا اپنے بزرگوں ہی کے سامنے باادب اور طالب علمانہ شان سے متوجہ نہیں رہتے تھے بلکہ اپنے خردوں اور عام لوگوں کی باتوں کو بھی وہ بہت توجہ سے سنتے تھے۔ اور ان میں سے عقل وفراست کی باتوں اور علم وحکمت کے موتیوں کو چن لیتے تھے۔

یونی ورسٹی کے امتحانات:

دارالعلوم دیوبند کی تربیت نے ان کے اندر جو شوق علمی پیدا کر دیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے الہ آباد یونی ورسٹی سے عربی، فارسی میں ہائی پروفیشنسی کے امتحانات پاس کیے اور دعوت وتبلیغ کے کاموں میں اور خصوصاً حکومت کے اعلیٰ طبقات میں دینی خدمات انجام دینے کے لیے انگریزی تعلیم کی ضرورت کو محسوس کیا اور اس کمی کو پورا کرنے کے لیے پنجاب یونی ورسٹی سے انگریزی کا ایک ابتدائی امتحان بھی پاس کر لیا۔ ان امتحانات سے خواہ انھیں علمی فائدہ نہ ہوا ہو لیکن اس سے انھیں عربی وفارسی پر مزید عبور اور یونی ورسٹی کی تعلیم کے انداز ومعیار کا اندازہ ہو گیا نیز ان کے اندر ایک اعتماد پیدا ہو گیا۔ انگریزی زبان میں بھی انھیں اس حد تک دست رس حاصل ہو گئی کہ وہ عام زندگی میں اپنے کاموں کی انجام دہی میں کسی کے محتاج نہ رہے

زمانہ طالب علمی کی خصوصیت:

تعلیم کا زمانہ مولانا احتشام الحق نے بڑی شان سے گزارا تھا۔ تھانہ بھون میں حفظ قرآن کے دور سے گزر رہے تھے تو ان کے نہایت شفیق ماموں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علیؒ موجود و سرپرست تھے، جن کے گھر میں رہتے تھے اور ناز و نعم کے ساتھ پرورش پاتے تھے۔ میرٹھ میں ان کے زمانہ تعلیم میں ان کے والد گرامی کا قیام بسلسلہ ملازمت تھا۔ مظاہر العلوم سہارن پور اور دارالعلوم دیوبند میں انھیں اپنے والد کے گھر اور ماموں کے گھر سے دور رہنا پڑا تھا۔ لیکن ان کے سرپرستوں نے عام مطبخ سے کھانا لینا پسند نہ کیا تھا بلکہ ان کے لیے ایک الگ اور مستقل کمرے کا انتظام دارالعلوم کی طرف سے تھا اور کھانا پکانے کے لیے ایک باورچی کا انتظام ان کے والد نے کر دیا تھا۔ ان کے ماموں حضرت حکیم الامت دارالعلوم کے سرپرست اور اس کی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ اس لیے وہ تمام اساتذہ اور مدرسے کے دیگر عملے کی خصوصی نوازشوں کے مورد تھے۔ لیکن ان خصوصی توجہات کی وجہ صرف یہی نہ تھی بلکہ وہ اپنی ذہانت وفطانت اور شوق علمی کی وجہ سے بھی اساتذہ کے محبوب تھے۔ صاف ستھرا اور بہترین لباس اور روزانہ لباس کی تبدیلی اس زمانے میں بھی ان کا شعار تھا۔ ان کی شخصیت میں ایک شان و تمکنت اور رکھ رکھاؤ اس زمانے میں بھی تھا۔ لیکن اس میں غرور و تبختر کا شائبہ نہ تھا۔ دارالعلوم کے ساتھیوں سے برابر کے دوستانہ روابط تھے اور ان سے تعلقات میں اپنی خاندانی وجاہت کی پرچھائیں بھی پڑنے نہ دیتے تھے۔ سب سے عجز وانکسار سے پیش آتے تھے اور اگر کسی ساتھی کی کوئی مجبوری محسوس فرمالیتے تھے تو اس کی حسب ضرورت خاموشی کے ساتھ اور ایسے انداز میں مدد فرماتے تھے کہ اس کے جذبات خودداری کو ٹھیس بھی نہ لگے۔ مولانا احتشام الحق کی ان خوبیوں نے انھیں اپنے ساتھیوں اور دارالعلوم کے دیگر طلبہ کے نزدیک بھی ایک محبوب شخصیت بنا دیا تھا۔

عملی زندگی کا آغاز:

رسمی تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے اپنی اصلاحی و تبلیغی سرگرمیوں کے لیے دہلی کو مرکز بنایا اور حکیم الامت حضرت تھانوی کی قائم کردہ مجلس دعوت الحق کے پروگرام کے مطابق جدید تعلیم یافتہ اور حکومت کے سربرآوردہ مسلمان آفیسروں میں کام کا آغاز کیا۔ انھوں نے بہت جلد دہلی کے سربرآوردہ طبقے میں رسوخ حاصل کر لیا۔ اس رسوخ حاصل کرنے میں جو چیز سب سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہوئی وہ ان کی بے نیازی، سیر چشمی اور استغنا تھا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے ابتداً سبزی منڈی دہلی کے ایک محلہ شورہ کوٹھی کی ایک مسجد میں پیش امامت کے فرائض انجام دیے پھر سنٹرل سیکریٹریٹ کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کی امامت و خطابت کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔ لیکن وہ تبلیغ و اشاعت اسلام اور امامت و خطابت کا کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ یہ سب کام فی سبیل اللہ اور کسی لوث و لالچ کے بغیر انجام دیتے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ان پر بڑا فضل تھا کہ ان کے والد ماجد مولانا ظہور الحق نے دہلی میں اتنی جائیداد پیدا کر دی تھی کہ اس کے کرایے کی آمدنی نے مولانا کے لیے فراغت کی زندگی گزارنے کا سر و سامان مہیا کر دیا تھا۔

مولانا احتشام الحق تھانوی اپنی طالب علمی کے زمانے سے عمدہ لباس پہنتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں صفائی اور سادگی اور مولویانہ وضع پر خاص زور دیا جاتا تھا۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا کہ لباس کی عمدگی اور معیار ایسا نہ ہو جس سے دوسرے غریب اور مسافر طلبہ احساس کم تری میں مبتلا ہوں اور خود مولانا کے دل میں جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ غرور جڑ پکڑ لے۔ لیکن تعلیم سے فراغت کے بعد انھوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا اور دین کی خدمت اور اعلیٰ طبقوں اور جدید تعلیم یافتہ حضرات میں تبلیغ و اصلاح دین کو اپنا نصب العین بنایا تو انھوں نے وقت کے

مسلمان شرفا و امرا کے لباس کو اختیار کیا۔ اس زمانے میں شیروانی کے ساتھ ترکی ٹوپی اور انگلش بوٹ یا پمپ کا عام رواج تھا۔ ان کی تعلیم اعلیٰ پائے کی ہوئی تھی، یونی ورسٹی کی اعلیٰ عربی، فارسی کی تعلیم اور انگریزی سے واقفیت نے ان میں اعتماد پیدا کر دیا۔ ٹھاٹ کے لباس اور عمدہ رہن سہن اور حکومت کے اعلیٰ مسلمان آفیسروں، پارلیمنٹ کے ارکان، مسلم لیگ کے اگلی صف کے رہنماؤں نے ان کے اندر سیاسی شعور پیدا بھی کیا تھا۔ اور سیاسی فکر کو پختہ و مستحکم بھی کیا تھا۔ اس زمانے میں مولانا احتشام الحق تھانوی صرف ایک دینی مبلغ و مصلح ہی نہ تھے بلکہ سیاسی خدمات کے میدان میں بھی قدم رکھ چکے تھے۔ مولانا اس وقت ایک جنٹلمین مولانا تھے جو دینی علوم میں دست رس کے ساتھ سیاسی بصیرت کے حامل بھی بنتے جا رہے تھے۔ ان حالات کا تعلق مولانا کی عملی زندگی کے بالکل آغاز سے تھا۔

۱۹۴۰ء کے بعد جو سیاسی دور شروع ہوا تو اس میں تو مولانا کی سیاسی شخصیت کا نقش روز بروز اجاگر ہوتا چلا گیا۔ اور قیام پاکستان کے وقت تک مولانا مصلح دین اور مبلغ اسلام کے ساتھ ایک مکمل سیاسی رہنما بھی بن چکے تھے۔ سیاسی زندگی کے آغاز میں سب سے بڑا محرک حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا مسلم لیگ کی طرف رجحان تھا اور بعد میں مولانا کے سیاسی فکر کو جو رسوخ حاصل ہوا اور خدمات انجام دیں، ان میں سب سے زیادہ حصہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کی صحبت و معیت اور رہنمائی کا ہے۔

تحریک پاکستان کا دور:

اگر تحریک پاکستان کی کامیابی کا سہرا کسی جماعت کے سر باندھا جائے اور دیگر عوامل و محرکات اور پس منظر کے واقعات کو نظرانداز کر دیا جائے تو اس سہرے کی سزاوار مسلم لیگ کے سوا کوئی دوسری جماعت نہیں ہو سکتی۔ لیکن مسلم لیگ اپنے

دعاوی کا عام مسلمانوں میں ہرگز اعتماد پیدا نہ کر سکتی تھی اگر اس کے ہراول دستے میں حکیم الامت مولانا اشرف تھانوی، ان کے متوسلین اور خاص طور پر حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی دیوبندی رحمہم اللہ اجمعین شامل نہ ہوتے۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی اس دور میں علمائے کرام کی اسی جماعت اور مسلم لیگ کے ہراول دستے میں شامل تھے۔

اس زمانے میں حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کی دینی وسیاسی سرگرمیوں کا دائرہ پورے ہندوستان تک پھیل گیا تھا۔ انھوں نے تحریک پاکستان کو کامیاب بنانے میں مسلم لیگ کا ہر محاذ پر بے غرضانہ ساتھ دیا۔ تحریک پاکستان اور اس کے مقاصد سے متعارف کرانے کے لیے انھوں نے پورے ملک کا دورہ کیا۔ سیکڑوں نہیں، ہزاروں جلسوں اور مجلسوں سے خطاب کیا۔ ۱۹۴۵ء، ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں شب وروز کام کیا۔ جمعیت علمائے اسلام کے قیام میں وہ نہایت سرگرم تھے۔ سرحد کے ریفرنڈم میں انھوں نے انتھک محنت کی اور اپنے آرام اور راحت کی پروا نہ کی۔ لیکن اس سلسلے میں انھوں نے مسلم لیگ سے ریل کا کرایہ تک وصول نہ کیا۔ نواب زادہ لیاقت علی خان کے بارے میں تو معلوم ہے کہ وہ جماعتی کاموں کے سلسلے میں ریل کے فرسٹ کلاس کا کرایہ اور دیگر اخراجات وصول کرتے تھے، لیکن حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کے بارے میں ایسی کوئی شہادت موجود نہیں۔ حالاں کہ اگر وہ مسلم لیگ سے سفر کے اور دوسرے ضروری اخراجات وصول کرتے تو یہ کوئی عیب اور بے ضابطہ بات نہ ہوتی۔ دوسرے کارکن، رہنما اور علمائے دین پورا پورا سفر خرچ وصول کرتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مولانا کو ایسی بلند فطرت، فراخ حوصلے، اعلیٰ ظرف اور ایثار پیشگی کے جوہر سے نوازا تھا کہ انھوں نے کسی چھوٹی بڑی رقم کو اپنے جائز اور ضروری اخراجات کی حد تک وصول کرنا بھی اپنے ذوق ونظر کی بلندیوں سے بہت پست جانا۔

مولانا احتشام الحق تھانوی کی ایک اور خوبی جس پر حضرت قاری شریف احمد

صاحب مدظلہ نے روشنی ڈالی ۔قیام پاکستان سے قبل کے الیکشن اور مسلم لیگ اور جمعیت علمائے ہند اور دیگر قوم پرور جماعتوں کے ہنگامے، جن کا سب سے بڑا مرکز دہلی اور اس کے قرب وجوار میرٹھ، بجنور، سہارن پور وغیرہ کے علاقے تھے ۔قاری صاحب موصوف کی آنکھوں کے سامنے کے واقعات ہیں ۔وہ فرماتے ہیں لیگ کے جلسوں میں عام مقرر سے لے کر رہنما اور علما تک اپنے مخالفین کی شان میں گستاخانہ اور شوخ جملے کہہ جاتے تھے حتی کہ بعض مقامات پر مسلم لیگی قوم پرور مسلمانوں خصوصاً مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کی جان کے لاگو اور آبرو کے دشمن ہوگئے تھے ۔اس میں مسلم لیگ کے عام کارکن سے لے کر لیگ کے صف اول کے رہنماؤں تک کا حصہ ہے ۔لیکن حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کی زبان سے جوش وجذبات کے اس دور میں بھی کسی مخالف جماعت کے اکابر واصاغر کے لیے کبھی کوئی کلمہ۔ استہزا، کسی قسم کا طنز وتعریض یا کوئی شوخ جملہ تک نہ نکلا ۔یہ ان کے اخلاق کی بلندی اور سیرت کی ارجمندی کا بہت بڑا ثبوت ہے ۔قیام پاکستان کے بعد مولانا کی زندگی کے جو ۳۳، ۳۴ سال گزرے ہیں اور سیاست کے دائرے میں جو لیل ونہار انھوں نے دیکھے تھے، ان میں وہ اپنے استاد شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی کی سیاست اور اصابت رائے کے بہت قائل ہوگئے تھے"۔

مولانا احتشام الحق تھانوی کے بارے میں اسی قسم کی بات ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بیان فرمائی ہے ۔وہ لکھتے ہیں:

> [حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے] "ذاتی تقویٰ وتدین کے (اعتراف کے) علاوہ، اب تو ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جو ان حضرات کے سیاسی موقف کے بارے میں اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں ۔خود مولانا احتشام الحق تھانوی نے آج [جون،

جولائی ۱۹۷۰ء] سے تقریباً تین سال قبل جامعہ اشرفیہ، لاہور میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کچھ ایسے الفاظ کہے تھے کہ:

"اب جو حالات پیش آرہے ہیں، ان کو دیکھ کر تو یہ خیالات ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان کے بارے میں ان حضرات کی رائے زیادہ درست تھی، جو یہ کہتے تھے کہ پاکستان میں فروغ اسلام کو نہیں فرق باطلہ اور الحادو اباحیت کو حاصل ہوگا۔"

(جماعت شیخ الہند اور تنظیم اسلامی، ۱۹۷۷ء، لاہور، صفحہ ۱۷۴)

لیکن یہ حالات تو تاریخ قیام پاکستان کے وقت ہی سے نظر آنے لگے تھے اور مولانا تھانوی کی ان پر نظر بھی تھی۔ لیکن مولانا تھانوی نے شروع ہی سے اس کے لیے وعظ و نصح اور اصلاح کی راہ اختیار کی، جب کہ جماعت اسلامی نے تنقید و تنقیص اور تعریض و تردید کی راہ اپنائی۔

جمعیت علماے اسلام کا قیام:

۱۹۴۷ء سے قبل کی مولانا احتشام الحق تھانوی کی ایک خدمت قومی کا تذکرہ رہ گیا اور وہ ہے جمعیت علماے اسلام کا قیام! اس کے لیے تھوڑی سی تمہید کی ضرورت ہے حضرت مولانا قاری محمد شریف مدظلہ فرماتے ہیں کہ مولانا تھانوی کو اعتراف تھا کہ مسلم لیگ کوئی اسلامی جماعت نہ تھی وہ ایک کل قومی جماعت تھی۔ اس کا مقابلہ کانگریس سے تھا۔ کانگریس میں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور اس میں مسلمان، عیسائی، پارسی وغیرہ شامل تھے۔ مسلم لیگ میں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور اس میں آغا خانی اسماعیلی، قادیانی شامل تھے۔ اسلامی جماعت اگر کوئی تھی تو وہ جمعیت علماے ہند تھی مجلس احرار اسلام (ہند) بھی اس ضمن میں آتی ہے۔ ان کے علاوہ جمعیت قریش، مومن کانفرنس وغیرہ تھیں۔ انھیں ہم مسلمان ذیلی قومی جماعتیں کہہ سکتے ہیں۔ آزادی

کی تحریک میں کانگریس کو ان جماعتوں کا تعاون حاصل رہا تھا۔ اس کے مقابلے میں مسلم لیگ کو مسلمان اکثریت کا تعاون حاصل تھا۔ بہت سے علما و مشائخ بھی مسلم لیگ کے ہم خیال تھے۔ لیکن جمعیت علمائے ہند جیسی علمائے کرام کی کوئی مقتدر جماعت مسلم لیگ کی حلیف نہ تھی۔ مسلم لیگ میں مخلصین کی کمی نہ تھی۔ لیکن اس میں سرمایہ داروں، جاگیرداروں، نوابوں، خان بہادروں وغیرہ کی اکثریت تھی اور وہی صاحب فکر ورائے سمجھے جاتے تھے۔ ان میں سے اکثر کی سیرتیں فسق وفجور کے انھیں سانچوں میں ڈھلی ہوئی تیں جو عام طور پر سرکار پرست امرا کی سمجھی جاتی ہیں۔ یہ مسلم لیگ کا بہت کمزور پہلو تھا۔ مولانا احتشام الحق مرحوم فرماتے تھے کہ ہمیں جمعیت علمائے ہند کی سیاسی فکر سے اختلاف تھا۔ لیکن مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری، مولانا حفظ الرحمن وغیرہم کی سیرت، ان کے اخلاص، ان کے سچے جذبہ حریت، ان کے ایثار، ان کی قربانیوں کے بارے میں کوئی شک وشبہ نہ تھا۔ اس بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتی تھیں کہ ان سے اچھی سیرت کے لوگ ناپید تھے۔ بہ حیثیت جماعت کے کوئی ایسا اجتماع ملّی مسلم لیگ کا حلیف نہ تھا۔

جمعیت علمائے اسلام کا قیام دراصل مسلم لیگ کی ضرورت تھا۔ مسلم لیگ کے ایما پر اس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ مسٹر محمد علی جناح کو خاص طور پر اس سے دل چسپی تھی۔ اس سلسلے میں جن علمائے دیوبند کی اس کے قیام سے دل چسپی اور جن کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے، ان کا اخلاص، ان کا علم وفضل، علوم ومعارف اسلامیہ میں ان کا تبحر مسلمات سے تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی سیاسی آدمی نہیں تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کو اس کا صدر بنایا گیا تھا۔ لیکن اس کے قیام سے حضرت مرحوم کی دل چسپی اور اس کے کاموں میں ان کی سرگرمی کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ وہ اس کے پہلے اجلاس میں شریک بھی نہیں ہوئے تھے۔ اس اجلاس میں متعدد قرار دادیں پاس کی

۔الیکشن میں مسلم لیگ کی کامیابی کے بعد جمعیت کا نام بھی سننے میں
تان کے بعد کچھ عرصے تک اس کا نام سنا گیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی
غیرہ اس کے صدر بنائے گئے۔ لیکن کسی کے نزدیک اس کی اہمیت ان
می سے زیادہ نہ تھی، دو ایک اجلاس بھی ہوئے۔ کئی اتحادوں میں بھی
نظر آتا رہا پھر وہ اپنا وجود بھی برقرار نہ رکھ سکی۔ اس کے بعد اس پر
ند کے سیاسی فلسفے پر یقین رکھنے والوں کا قبضہ ہو گیا اور آج مسلم لیگ
علمائے اسلام کا کوئی نشان باقی نہیں رہا۔

تشام الحق تھانوی نے جمعیت علمائے اسلام کی قرارداد کے مطابق
یت میں ملک کے دور دراز علاقوں کے دورے کیے، سیکڑوں تقریریں
ووٹروں کو مسلم لیگ کے امیدواروں کو ووٹ دینے کے لیے آمادہ کر
ن پور، میرٹھ، مظفر نگر وغیرہ کے علاقوں میں چوں کہ جمعیت علمائے
ت زیادہ تھے اور نواب زادہ لیاقت علی خاں میرٹھ ڈویژن کے حلقے سے
۔ان کے لیے اس علاقے سے الیکشن جیتنا ان کی آن کا مسئلہ تھا۔ ان
لہ سر کرنے میں اور ان حضرات کو الیکشن جتوانے میں مولانا احتشام
سب سے زیادہ تھا۔ جس کا اعتراف نواب زادہ صاحب نے کیا تھا۔
ں مولانا تھانوی کی سیرت کا روشن پہلو یہ ہے کہ ان اسفار کے لیے

حضرات کی ذہنی اور فکری طور پر کایا پلٹ کر دی۔ الیکشن
انھیں بہت کم فرصت ملی تھی اس کے باوجود انھوں نے ان ش
کے ذہنوں اور ان کے انداز فکر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔
تحریک پاکستان کی تاریخ میں مولانا احتشام الحق تھ
حروف میں لکھی جائیں گی۔

پاکستان کی فکری تاریخ کا پہلا حادثہ:

مولانا احتشام الحق تھانوی قیام پاکستان سے ایک ہ
وہ دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس کے مبصرین میں شامل ت
صدر اور پاکستان کے گورنر جنرل نے ۱۱۔اگست ۱۹۴۷ء کو پہ
کہ پاکستان میں نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان، نہ عیسائی نہ پار
سب اس مملکت کے یکساں شہری ہیں، سب کا حکومت میں
ہیں وہ اپنے مندروں میں جائیں۔ عیسائی اپنے گرجوں میں ا
میں، مذہب ہر شخص کا شخصی معاملہ ہے۔ حکومت کے کاموں
تو اس سے مولانا کے دل کو اور ان کے جذبات صادقہ کو سخت
مولانا کو مزید تڑپا دیا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان، مملکت خد

اولاً: اس لیے کہ ابھی پاکستان نے حقیقت کا روپ بھی اختیار نہ کیا تھا۔ ۱۴۔ اگست میں، جب پاکستان کا خواب حقیقت بننے والا تھا، ابھی تین دن باقی تھے۔

ثانیاً: تاریخ پاکستان کے یہ نہایت اہم اور نازک ترین ایام تھے۔

ثالثاً: پاکستان کے لیے مسلمانوں نے جو قربانیاں دی تھیں اور آگ اور خون کے جو دریا عبور کر کے یہاں پہنچے تھے ابھی ان کے سر چھپانے اور ذریعہ معاش کا کوئی انتظام بھی نہ ہوا تھا۔

رابعاً: پاکستان کو جن حالات میں حاصل کیا گیا تھا، پاکستان اور اسلام دشمن قوتیں ان حالات کی نزاکت سے فائدہ اٹھانے کی تاک میں تھیں۔

خامساً: ان کا یہ خیال بھی تھا کہ یہ حکومت بہر حال اپنی ہے۔ نہ یہاں برٹش استعمار ہے اور نہ مقابلہ غیر مسلم قوتوں سے ہے۔ اس لیے نئے حالات میں حکومت کے خلاف تحریک چلانے کا وہ انداز نہ ہونا چاہیے، جو گزشتہ دور میں روا رکھا گیا تھا۔

ان حالات میں حضرت علّامہ عثمانی اور حضرت مولانا تھانوی کا خیال تھا کہ اس وقت کوئی بحث چھیڑنے سے پاکستان کو ایسا نقصان پہنچے گا جس کی تلافی ناممکن ہو گی اور وقت کا کوئی اختلاف خواہ کتنا ہی معقول کیوں نہ ہو اس سے اسلام دشمن فائدہ اٹھائیں گے۔ اس لیے یہی صحیح معلوم ہوا کہ اس وقت کوئی اختلاف پیدا نہ کیا جائے اور اس کے لیے مناسب وقت کا انتظار ہی مصلحت وقت کا تقاضا ہے۔ لیکن حالات نے دونوں بزرگوں پر واضح کر دیا تھا کہ انھیں پاکستان میں حکومتِ الٰہیہ کے قیام یا نظام اسلامی کے نفاذ اور مملکت کو سیکولر راستے سے ہٹانے کے لیے ایک نئی تحریک کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

اس سے پہلے ۱۹۴۶ء کے اواخر میں جب مسلم لیگ نے عارضی حکومت میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور مسلم لیگ کے حصّے اور مسلمانوں کے کوٹے کی پانچ سیٹوں میں سے ایک سیٹ اچھوت لیڈر جوگندر ناتھ منڈل کو دے دی تھی۔ یہ بات

پاکستان کی تحریک کے دعاوی اور مقاصد کے خلاف تھی۔اس سے مخلص لیگیوں اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی اور دوسرے اسلامی ذہن رکھنے والے عوام وخواص کو تکلیف پہنچی تھی۔ لیکن اس وقت حالت جنگ تھی۔اس لیے خیال کر لیا گیا تھا کہ یہ کانگریس یا مخالفین پاکستان اور مسلم لیگ کے نکتہ چینوں کے جواب میں قائد پاکستان کی کوئی چال ہے۔اب ۱۱۔اگست کی دستور ساز اسمبلی کی تقریر نے قائد کے سیکولر خیالات اور نظام حکومت کے بارے میں ان کے عزائم سے بالکل پردہ ہٹا دیا تھا۔لیکن یہ تاریخ کا ایسا جبر اور حالات کا ایسا دباؤ تھا کہ اس وقت اختلاف پیدا کرنا مصلحت شناسی اوز دور اندیشی کے خلاف تھا اور ان جہاں دیدہ وگرم وسرد چشیدہ بزرگوں کے نزدیک آئندہ کے بہترین امکانات کو ختم کر دیتا۔اس لیے خاموش ہو گئے اور مناسب وقت کے انتظار میں رہے۔

اسلامی آئین سازی کی تحریک....۱

بانی پاکستان کی ۱۱۔اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر سے مملکت کی اسلامی نظریاتی حیثیت کے بارے میں جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔اس نے حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا احتشام الحق تھانوی کو بہت مشوش کر دیا تھا۔اب ان کے سامنے اس مملکت خداداد کو اسلامی نظام کی راہ پر ڈالنے کا مقصد سب سے بڑھ کر تھا۔اس وقت دستور ساز اسمبلی میں متعدد حضرات اسلامی ذہن رکھنے والے موجود تھے۔ان ہر دو حضرات نے ان کو اپنے ساتھ ملا کر دستوری جنگ کا آغاز کیا۔لیاقت علی خاں پر زور ڈالا گیا کہ وہ تحریک پاکستان کے زمانے میں مسلم لیگ اور اس کے رہنماؤں کے دعاوی کے مطابق اسلامی دستور ملک میں نافذ کریں۔اس سلسلے میں حضرت مولانا عثمانی اور حضرت مولانا تھانوی نے دوسرے علما کے تعاون سے ایک قرار داد مرتب کی، جس کے اعلان کے ذریعے پاکستان نے ایک اسلامی آئینی مملکت کی حیثیت اختیار کر لی۔یہ وہ قرارداد ہے

جسے پاکستان کی دستوری تاریخ میں "قرارداد مقاصد" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اب حضرت تھانوی کے سامنے اسلامی آئین کی تدوین کا مسئلہ تھا۔ اس کے لیے کوششیں جاری تھیں کہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی نے ۱۳۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کو انتقال فرمایا۔ حضرت تھانوی کو حضرت علامہ عثمانی سے خاص تعلق تھا اس لیے ان کے انتقال سے انھیں سخت صدمہ پہنچا۔ لیکن اس سے بڑا خطرہ اسلامی آئین کی تدوین ونفاذ کی تحریک کو پہنچنے کا پیدا ہو گیا تھا۔ مولانا تھانوی کی بصیرت وتدبر کی آزمائش کے لیے یہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ ایک مشکل یہ تھی کہ پاکستان میں دیو بندی تھانوی مکتبہ فکر کی اتنی بڑی وسیع العلم، صاحب نظر اور جامع صفات اور ماہر علوم معقولات ومنقولات شخصیت موجود نہ تھی، جو علامہ شبیر احمد عثمانی کی جگہ لے سکتی۔ مولانا تھانوی نے اس سلسلے میں ہندوستان سے مناظر احسن گیلانی، سید سلیمان ندوی وغیرہ کو بلانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ مولانا تھانوی، لیاقت علی خاں سے مشورے کے بعد ہندوستان تشریف لے گئے اور علامہ سید سلیمان ندوی کو لے آئے اور بورڈ تعلیمات اسلام کا انھیں چیرمین بنوایا۔ اسلامی آئین کی تحریک کو موثر بنانے اور اسمبلی پر دباؤ ڈالنے کے لیے جمعیت علماے اسلام کو سرگرم کیا اور حضرت علامہ ندوی کو اس کا صدر منتخب کروایا۔ لیکن بورڈ تعلیمات اسلام اور جمعیت کے نظام کو چلانے کے لیے حالات پر جس گہری نظر، تدبر وبصیرت کی صفات اور دبنگ شخصیت کی ضرورت تھی، حضرت علامہ کی شخصیت میں بہ قدر ضرورت بھی وہ صفات موجود نہ تھیں۔ وہ بہت بڑے اسلامی محقق تھے۔ وہ سیرت النبیؐ کے بے مثال مصنف تھے۔ ان کی علمی، سوانحی، قرآنی تحقیقات سے اردو زبان میں بیش بہا اضافہ ہوا تھا۔ اردو ادب کو ان کے قلم نے ہم پایہ۔ آسمان کر دیا تھا۔ لیکن عملی سیاسیات اور وقت کے تقاضوں سے وہ قطعاً ناآشنا تھے۔ یا کم سے کم یہ کہا جاسکتا ہے کہ برسراقتدار طبقے سے کام لینے کے لیے جس تدبر اور جمعیت علماے اسلام کو ایک فعال اور سرگرم عمل اور موثر جماعت بنانے کے لیے جن انتظامی صلاحیتوں کی ضرورت

تھی۔ وہ ان میں موجود نہ تھیں اور حضرت تھانوی نے ان کے وجود گرامی سے جو توقعات قائم کی تھیں، وہ کما حقہ پوری نہ ہوئیں۔

یہی زمانہ تھا کہ حکومت نے پہلا مسودہ قانون شائع کیا۔ حضرت مولانا تھانوی کو اندازہ ہو گیا کہ ابھی حکومت کا قبلہ درست نہیں ہے۔ ان کی نیتوں میں کھوٹ ہے یا دستور ساز اسمبلی کے اندر اسلامی ذہن رکھنے والے افراد غیر موثر ہیں اور ضرورت اس امر کی متقاضی ہے کہ اسمبلی کے باہر ایک موثر تحریک پیدا کی جائے۔ چناں چہ جنوری ۱۹۵۴ء میں حضرت مولانا تھانوی صاحب نے مختلف مکاتب فکر کے ۳۱ علماء کو اپنے ہاں دعوت دی اور متفقہ طور پر ۲۲ نکات مرتب کر کے حکومت کو پیش کر دیے کہ ان اصول پر پاکستان کا دستور مرتب کیا جائے۔ خود مولانا تھانوی فرماتے ہیں:

"جب پہلا مسودہ آئین سامنے آیا تو قطعاً غیر اسلامی تھا۔ اس پر ملک بھر سے مختلف مکاتب فکر کے ۳۱ ممتاز علما کراچی میں جمع ہوئے۔ احقر (احتشام الحق) ہی کی دعوت پر یہ اجتماع ہوا تھا۔ انھوں نے ۲۲ نکات مرتب کر کے حکومت کو پیش کیے کہ پاکستان کا دستور ان بنیادوں پر مرتب کیا جائے۔ علما کا یہ اجتماع پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔ یہ اجتماع میری دعوت پر منعقد ہوا تھا اور اس اعتراض کا جواب تھا کہ یہاں کون سا اسلام رائج کیا جائے اس کے علاوہ، ہم نے ملک بھر میں نظام اسلام کانفرنسیں منعقد کیں۔ اس کے بعد حکومت نے نیا دستوری مسودہ شائع کیا۔ اس میں اسلام کے بنیادی اصول بڑی حد تک آ گئے تھے۔ مگر کچھ باتیں ترمیم طلب تھیں۔ علما دوبارہ کراچی میں جمع ہوئے اور ایک ایک آرٹیکل پر اپنی سفارشات مرتب کر کے حکومت کو بھجوائیں۔ نتیجتاً ۱۹۵۶ء کا آئین سامنے آیا۔ جس میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ پاکستان میں اسلام کا معاشی و مالیاتی نظام نافذ کیا جائے گا اور اس سلسلے میں پانچ سال کی مہلت رکھی گئی تھی۔ لیکن قوم کی بد قسمتی کہ اس پر عمل نہ ہو سکا اور ۱۹۵۸ء میں اس آئین سے وفاداری کا حلف اٹھانے والے ایوب خاں نے اسے منسوخ کر دیا۔" (ہفت روزہ چٹان۔ لاہور، ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

تحریک ختم نبوت....۱

اکتوبر ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد ملک پر پھر مایوسی کے بادل چھاگئے تھے۔ مولانا تھانوی از سر نو تحریک کے آغاز کا سوچ ہی رہے تھے کہ اسی زمانے میں تحریک ختم نبوت شروع ہو گئی اور اس نے پورے ملک کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی مولانا احتشام الحق تھانوی اس تحریک کے نہایت سرگرم رہنما تھے۔ ساہیوال، اوکاڑہ، راولپنڈی میں بعض ایسے واقعات پیش آئے کہ قادیانیوں کے مرکز ربوہ سے ۱۵۔ جنوری ۱۹۵۲ء کو ایک اعلان شائع ہوا کہ قادیانی اس کا بدلہ خون سے لیں گے۔ اس سلسلے میں جن پانچ صاحبوں کو قتل کرنے کا اعلان کیا گیا تھا اس میں ایک نمایاں نام مولانا احتشام الحق تھانوی کا تھا۔ لیکن مولانا تھانوی نے اس دھمکی کی ذرہ برابر پروانہ کی وہ برابر جلسوں میں شریک ہوتے رہے اور قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا مطالبہ زور وشور سے کرتے رہے۔ لیکن اس تحریک کی اہمیت کے پیش نظر جو غیر منظم کوششیں ابھی تک ہو رہی تھے، وہ بالکل ناکافی تھیں۔ چناں چہ ان کوششوں کو موثر بنانے اور منظم کرنے کے لیے ۳۔ جون ۱۹۵۲ء کو کراچی میں ایک مجلس مشاورت طلب کی گئی جس میں ایک بورڈ تشکیل دیا گیا۔ اس کا صدر مولانا سید سلیمان ندوی کو اور کنوینر مولانا احتشام الحق تھانوی کو مقرر کیا گیا۔ ۱۳۔ جولائی ۱۹۵۲ء کو اس بورڈ کا کراچی میں جلسہ ہوا اور اس امر کا فیصلہ کیا گیا کہ ۱۶ تا ۱۸۔ جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں ایک آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن بلایا جائے جس میں مسئلہ قادیانیت پر غور کر کے کوئی قطعی فیصلہ اور اس کے مطابق لائحہ عمل مرتب کیا جائے۔

اسلامی آئین سازی کی تحریک....۲

اس فیصلے کے بعد جنوری ۱۹۵۳ء کے وسط تک مولانا کو مہلت مل گئی۔ مولانا تھانوی کے نزدیک چوں کہ ملک کے لیے اسلامی آئین کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا تھا۔

مولانا تھانوی نے اس مہلت کو غنیمت جان کر ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) میں ایک کانفرنس بلانے کی کوشش کی۔ نومبر ۱۹۵۲ء میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں ایک بیان کے مطابق پچاس ہزار علما اور ایک لاکھ سے زائد عام مسلمانوں نے شرکت کی۔ اس کی کامیابی کا سہرا مرکزی جمعیت علمائے اسلام کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کے سر تھا۔ کانفرنس کی کامیابی سے حکومت کے حلقوں میں کھلبلی مچ گئی ۱۵۔ نومبر کو کانفرنس ختم ہوئی تھی کہ ۱۹۔ نومبر کو خواجہ ناظم الدین نے ملک کے دس مقتدر علما کو گفتگو کے لیے کراچی آنے کی دعوت دی۔ ان مدعووین کی ایک بہت نمایاں اور دراصل اس دعوت کی اصل باعث اور محرک شخصیت مولانا احتشام الحق تھانوی کی تھی۔ خواجہ ناظم الدین نے پرائم منسٹر ہاوس میں ان علما کا استقبال کیا۔ ان کے ساتھ سردار عبدالرب نشتر اور مولوی تمیز الدین خان بھی تھے۔ مولانا احتشام الحق تھانوی نے رئیس وفد ہونے کی حیثیت سے دستور کے سلسلے میں علما کے خیالات کی ترجمانی کی۔ اس کے نتیجے میں ۱۰۔ جنوری ۱۹۵۳ء کو پاکستان کے مقتدر علمائے کرام کا ایک اور اجتماع ہوا، جس میں ۳۳ علما نے شرکت فرمائی اور اسلامی آئین کے بائیس بنیادی نکات کی توثیق فرمادی اور پہلے ڈھاکہ کانفرنس میں جو اعلان کیا گیا تھا کہ "کوئی ایسا دستور قبول نہیں کیا جائے گا جو اسلام کے نام پر بنایا گیا ہو مگر اس کی روح سے خالی ہو۔" اب مختلف مکاتب فکر کے علما کے اس اجتماع نے اس اعلان پر مہر توثیق ثبت کردی۔ ۱۹۵۶ء کا آئین علما کے انھی متفقہ ۲۲ نکات کی بنیاد پر بنا تھا۔

تحریک ختم نبوت ۲

۱۶ تا ۱۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں ۱۳۔ جولائی ۱۹۵۲ء کے فیصلے کے مطابق آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن ہوا، اس کی کامیابی میں سب سے بڑا حصہ مولانا احتشام الحق تھانوی کی کوششوں کا تھا۔ اس میں متعدد مطالبات کیے گئے اور منظم تحریک

چلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ مختلف مذہبی جماعتوں کی جنرل کونسل بنائی گئی اور ان کے پندرہ ممبروں پر مشتمل ایک مجلس عمل تشکیل دی گئی۔ حکومت کو ایک ماہ کا نوٹس دیا گیا کہ وہ کنونشن کے مطالبات کو مان لے۔ اس سلسلے میں کراچی اور لاہور میں مختلف وفود نے خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کی۔ کراچی میں جو وفد مولانا سید سلیمان ندوی کی سربراہی میں خواجہ صاحب سے ملا تھا اس میں مولانا احتشام الحق تھانوی بھی شریک تھے۔ ایک مہینے کے نوٹس کی مہلت گزرنے کے بعد آئندہ اقدام کے غور کرنے کے لیے ۲۶۔ فروری کو پھر جنرل کونسل کا اجلاس بلایا گیا۔ مولانا تھانوی نے اس میں سرگرم حصہ لیا اور اس تحریک کو آگے بڑھانے کی کوششوں کا آغاز ہوا۔ ۲۶۔ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ پنجاب میں وسیع پیمانے پر گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ منیر انکوائری کمیشن قائم کیا گیا۔ ان حالات کے تسلسل میں ۱۹۵۵ء کا آخر آپہنچا۔

۱۹۵۶ء میں اسلامی آئین کی منظوری کے بعد یہ توقع تھی کہ ۱۹۶۱ء تک ملک میں اسلام کا معاشی ومالیاتی نظام قائم کر دیا جائے گا۔ حضرت مولانا تھانوی اس دوران میں اصلاح و تبلیغ کے کاموں میں مسلسل مصروف ہے۔ ملک اور بیرون ملک کے دورے کیے۔ سیکڑوں مذہبی وسیاسی جلسوں اور سیرت اور دیگر موضوعات پر پچاسوں کانفرنسوں سے خطاب کیا۔

تحریکات ملی میں مولانا تھانویؒ کا حصہ:

تحریک پاکستان تاریخ مسلمانان ہند پاکستان کی اہم تحریک تھی۔ قیام پاکستان کے بعد دستور سازی اور اسلامی نظام کے نفاذ کی تحریک پاکستان کے مقاصد قیام کے لحاظ سے پاکستان کی روحانی زندگی اور صحت فکری کی تحریک تھی۔ اگر دستور سازی کے وقت پاکستان کے قیام کے مقاصد کو فراموش کر دیا جاتا تو پاکستان کے قیام

کا کوئی جواز باقی نہ رہتا۔ مولانا احتشام الحق تھانوی نے تاریخ کی ان دونوں عظیم الشان تحریکوں میں حصہ لیا اور اپنے بے نظیر رہنمایانہ کردار سے پاکستان کی تاریخ میں خود اپنے لیے اور اپنی جماعت کے لیے ایک سنہری باب کا اضافہ کیا۔ ان کا وجود گرامی اکابر اسلاف کے لیے قابل فخر بن گیا ہے اور اخلاف کے لیے وہ اپنی سیرت کے نقوش نمونہ اور نقش قدم رہنما چھوڑ گئے ہیں۔

پاکستان کی تاریخ میں تیسری عظیم الشان تحریک قادیانیوں کے خلاف ناموس ختم رسالت کے تحفظ کی تحریک تھی۔ مولانا تھانوی نے اس میں بھی نہایت سرگرم حصہ لیا۔ شورش کاشمیری مرحوم نے "تحریک ختم نبوت" کے نام سے جو کتاب لکھی ہے، اس میں انھوں نے حضرت مولانا کی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس تحریک میں مولانا تھانوی کا حصہ اس سے بہت زیادہ ہے۔

دارالعلوم ٹنڈوالہ یار کا قیام:

مولانا احتشام الحق تھانوی کی ملی خدمات کا تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا جب تک دارالعلوم ٹنڈوالہ یار (سندھ) کا تذکرہ نہ کیا جائے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کی معیت و مشورت کے بعد انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے طرز و شان کا ایک دارالعلوم قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا کام اور عظیم الشان منصوبہ تھا جس کی تکمیل کا مولانا نے عزم کیا تھا۔ چناں چہ سب سے پہلے مولانا تھانوی نے ۲۰ نومبر ۱۹۴۹ء کو دیوبندی مکتبہ فکر کے متعدد اکابر علمائے کرام کو اس سلسلے میں مشورے کے لیے کراچی آنے کی دعوت دی۔ اس اجتماع میں حضرت علامہ نے ایک مجلس شوریٰ ترتیب دی اور ایک سب کمیٹی قائم کی جس کے ذمے یہ کام تھا کہ دارالعلوم کے قیام کے لیے جگہ کا انتخاب کرے۔ قدیم نظام و نصاب تعلیم پر غور کرے اور حالات و وقت کی ضرورت کے مطابق ان میں اصلاحات تجویز کرے۔

دارالعلوم کے لیے لائق اساتذہ کے انتخاب اور مدرسہ کے لیے مالی وسائل کی فراہمی کے بارے میں بھی تجاویز مرتب کرے۔ مولانا احتشام الحق تھانوی شوریٰ اور سب کمیٹی دونوں میں شامل تھے اور سب سے زیادہ سرگرم اور فعال وہی تھے۔ ابھی یہ کام ابتدائی مراحل سے بھی نہ گزرا تھا کہ اس اجتماع کے صرف ۲۳ دن کے بعد ۱۳۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کو حضرت علامہ عثمانی کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال سے مولانا تھانوی کو شدید صدمہ ہوا اور ان پر گوناگوں ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا۔ حضرت علامہ اگرچہ آخری دنوں میں عملی جدوجہد سے الگ ہو گئے تھے وہ مسلسل بیمار رہتے تھے۔ لیکن مولانا تھانوی کو حضرت کی ذات سے بڑی ڈھارس تھی۔ ان کے انتقال کے حادثے میں مولانا تھانوی کے لیے بڑی آزمائش تھی۔ انھوں نے ہمت نہ ہاری، وہ اس آزمائش سے سرخرو نکلے اور ۱۹۵۰ء کے ختم ہونے سے پہلے مولانا تھانوی کی ہمت بلند نے دارالعلوم قائم کر دیا اس میں وقت کے لائق ترین اساتذہ اور علوم وفنون کے ماہرین کو جمع کر دیا۔ جہاں چند برس کے اندر ملکی اور غیر ملکی طلبہ کی ایک بڑی تعداد جمع ہو گئی اور نہ صرف پاکستان میں بلکہ شمال مغربی اسلامی ممالک سے لے کر جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ ویورپ کے ممالک تک دارالعلوم کی دھوم مچ گئی۔ مولانا احتشام الحق تھانوی دارالعلوم کے قیام سے لے کر اپنی وفات تک اس کے مہتمم اعلیٰ رہے۔ دارالعلوم کی تاریخ کا یہ دور نہایت تابناک تھا۔ دارالعلوم کا قیام حضرت تھانوی کی کتاب زندگی کا ایک روشن باب اور پاکستان میں دینی تعلیمی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔

جیکب لائن کی مسجد اور ملی مرکز:

قیام پاکستان سے قبل مولانا دہلی میں سنٹرل سیکریٹریٹ کی مسجد میں خطیب تھے۔ سیکریٹریٹ کے مسلمان ملازم اور حکام پاکستان تشریف لائے تو انھیں جیکب لائنز میں کوارٹر الاٹ کیے گئے۔ ان میں بہت سے لوگ دہلی سے مولانا تھانوی سے

واقف تھے ان کی خطابت کو پسند کرتے تھے۔ تحریک پاکستان میں ان کے مساعی سے آشنا اور ان کے معترف تھے۔ بہت سے لوگوں سے مولانا کے دوستانہ روابط تھے یہ کئی اسباب تھے، جن کی بنا پر حضرت تھانوی نے جیکب لائنز میں قیام کو پسند کیا۔ اس زمانے میں یہاں پر ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ مولانا نے پاکستان میں اپنی جدوجہد کا مرکز بنانے کے لیے اسی چھوٹی سی مسجد کا انتخاب کیا۔ ان کی طبیعت دشوار پسند نے اسی چھوٹی سی مسجد کو تحریکات ملی کا ایک عظیم الشان مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ آج ہم اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ کر یہ تصدیق کر سکتے ہیں کہ یہ چھوٹی سی مسجد کراچی کی بڑی مساجد میں شمار ہوتی ہے۔ وہ مولانا تھانوی کی زندگی ہی میں ملی مرکز کی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ مدرسہ عربیہ اور دارالافتا یہاں قائم تھا، جس کے فتوے ملک بھر عزت واحترام کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

ایک ایمان افروز واقعہ:

جامع مسجد جیکب لائنز کے بارے میں مولانا تھانوی مرحوم نے ایک نہایت ایمان افروز واقعے کا ذکر فرمایا کہ مولانا عبدالخالق مرحوم بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ کے ایک رکن اور نہایت متقی اور زاہد شب زندہ دار شخص تھے۔ انھوں نے بیان کیا کہ انھوں نے حالت بیداری میں حضرت رسول اکرم علیہ الصلوٰۃ والتسلیمات کی زیارت فرمائی۔ انھوں نے کہا کہ "جمعہ کے دن میں نے دیکھا کہ مسجد (جیکب لائنز) نمازیوں سے خالی ہے اور سرور کونین صلّی اللہ علیہ وسلّم مسجد میں تشریف فرما ہیں۔ مولانا عبدالخالق صاحب کا کہنا تھا کہ ان کو حضور سرور کائنات صلعم کی یہ مقدس زیارت حالت بیداری میں، ہوئی تھی۔"

مولانا تھانوی مرحوم فرماتے تھے کہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اسی تشریف فرمائی کی برکت ہے کہ انھیں کبھی مسجد کے لیے چندے کی اپیل نہیں کرنی پڑی۔

حالاں کہ مسجد کی تعمیر میں لاکھوں روپے صرف ہو چکے ہیں ۔ دوسری اہم بات جو مشاہدے میں آئی، وہ یہ ہے کہ یہ مسجد روز و شب میں کسی وقت تلاوت کرنے والوں، نوافل اور اوراد و وظائف ادا کرنے والوں سے خالی نہیں رہتی۔"

اس سے مسجد کی تعمیر میں مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کے مساعی کا عنداللہ مقبول ہونا ثابت ہوتا ہے۔

آج حضرت تھانوی کے انتقال کے تقریباً بارہ برس کے بعد بھی یہ مسجد دعوت وارشاد اور تبلیغ واشاعت کا بہت بڑا مرکز ہے۔

درس قرآن:

۱۔ حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کو قدرت نے بہترین ذہنی اور فکری صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ مختلف علوم وفنون میں ان کا مطالعہ بہت وسیع اور نظر بہت گہری تھی۔ لیکن انھوں نے ملی خدمت کے لیے عملی زندگی کا جو میدان اپنے لیے چنا تھا یا حالات ووقت کے تقاضوں نے اس میدان تک ان کی رہنمائی کی تھی جہاں فراغتِ وکتابے وگوشہ چمنے کا اطمینان وسکون عنقا تھا۔ اس کے باوجود وہ مطالعے کے لیے تو وقت نکال لیتے تھے۔ لیکن تحریر وانشا کے لیے فرصت ہمیشہ ناپید رہی۔ البتہ قرآن حکیم کی تعلیم واشاعت کی طرف ان کی طبیعت کا میلان فطری تھا اور انقلاب فکر اور اصلاح امت کے لیے قرآن حکیم کی تعلیمات کی اہمیت کا جو نقش زمانہ ، طالب علمی میں دل پر ثبت ہوا تھا وہ روز بہ روز گہرا اور روشن ہوتا چلا گیا تھا۔ قرآن حکیم کے درس وتفسیر سے ان کے ذوق کو خاص مناسبت تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ جب روزنامہ جنگ، کراچی میں ان سے درس قرآن حکیم شروع کرنے کی درخواست کی گئی تو وہ فوراً اس کے لیے آمادہ ہو گئے اور ۲۵۔ دسمبر ۱۹۶۵ء سے اپنی وفات اپریل ۱۹۸۱ء تک برابر وہ جنگ کے لیے تفسیر تحریر فرماتے رہے۔ اور کچھ ذخیرہ وہ اپنے پیچھے بھی چھوڑ گئے جو ان کی وفات کے بعد بھی

ایک مدت تک چھپتا رہا۔

جنگ کا یہ نہایت مقبول کالم تھا جو پورے پاکستان میں تمام مسالک کے مسلمانوں میں یکساں طور پر مقبول تھا۔ حضرت مولانا تھانوی اسے آسان اور عام فہم زبان میں تحریر فرماتے تھے۔ وہ اختلافی مسائل کے بیان سے اپنے قلم کو ہمیشہ بچاتے تھے اور کہیں کوئی ایسا نکتہ بیان نہ فرماتے تھے جس سے کسی مسلک پر ضرب پڑتی ہو یا کسی مسلمان کی دل شکنی ہو۔ ان کی تفسیر کا اسلوب بہت ہی دل کش ہوتا تھا جو دل پر اثر کرتا تھا۔ تفسیر میں وہ ایک مستقل دبستانِ فکر کے مالک تھے۔

۲۔ لیکن جنگ میں تفسیر کی اشاعت سے قبل وہ ریڈیو پاکستان سے اپنے درس قرآن کا آغاز فرما چکے تھے، جو نہ صرف پاکستان میں ریڈیو کے سامعین میں بہت مقبول سلسلہ تھا بلکہ پاکستان کے باہر بھی جہاں کہیں پاکستان ریڈیو کے سامعین پائے جاتے تھے، انھیں درس قرآن کے نشریے کا انتظار رہتا تھا۔ ریڈیو کے درس قرآن کی زبان اور اسلوب بیان کی وہی خصوصیات تھیں جن کا ذکر جنگ میں درس قرآن کے سلسلے میں ہو چکا ہے۔ لیکن ریڈیو پر حضرت تھانوی کی زبان کی شیرینی اور خطابت کی لطافت اس کی دل نشینی میں مزید اضافہ کر دیتی تھی۔ ایک مرتبہ کسی وجہ سے کچھ عرصے کے لیے درس قرآن بند ہو گیا تو ملک و بیرون ملک سے ان کے درس قرآن کے دوبارہ اجرا کے لیے ریڈیو حکام کو اتنے خطوط اور احتجاجی تار اور ٹیلیفون آنے شروع ہو گئے کہ حکام کو بالآخر سر انداز ہونا پڑا اور حضرت تھانوی کا درس قرآن دوبارہ جاری ہو گیا جو مولانا کی وفات تک جاری رہا۔

سیرت کی ایک خوبی:

روزنامہ جنگ میں قرآن کی تفسیر اور ریڈیو پاکستان سے مولانا تھانوی کے درس قرآن سے ان کی سیرت کا یہ پہلو بھی نمایاں ہو کر سامنے آیا کہ وہ دین کی کوئی

خدمت ہو، للہ وفی اللہ انجام دیتے تھے اور اس کے لیے کسی معاوضے کے کبھی روادار نہیں ہوئے ۔ چناں چہ جنگ کے ایڈیٹر اور ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر کی نہایت معقول پیش کش کو انھوں نے قبول کرنے سے قطعاً انکار کر دیا تھا۔

اگر کوئی صاحب ہمت جنگ میں مطبوعہ سلسلہ تفسیر کو جمع کر لے اور کوئی صاحب ایثار اسے چھپوا دے تو یہ نامکمل ہونے کے باوجود وقت کی ایک بے نظیر تفسیر ہو گی، جو اسلامی احکام کی توضیح و تشریح، معرفت و طریقت کے بے شمار ایمان پرور نکتوں، شریعت اسلامیہ کے فکر انگیز رموز اور احکام الٰہیہ کے بصائر و حکم کا ایک بے مثال اور عجیب و غریب مجموعہ ثابت ہو گا۔

بے مثال فقیہ و متکلم:

حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کی عملی سرگرمیوں نے ان کے بے شمار ذہنی و دماغی صلاحیتوں اور علمی و فکری کمالات کو ابھرنے کا موقع نہیں دیا اور خطابت تو گویا ان کے دیگر فضائل کے لیے پردہ پوش بن گئی تھی ۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اگر مولانا تھانوی اپنی ذہنی و دماغی قابلیتوں اور علمی و فکری صلاحیتوں کو تصنیف و تالیف کے میدان میں صرف فرماتے تو دنیا حیرت زدہ رہ جاتی ۔ ان کی تفسیر میں ان کے خصائص علمی کا اظہار ہوا ہے۔

فقہ میں حضرت تھانوی کی دو چیزیں نظر سے گزری ہیں ۔ ان میں سے ایک شادی کمیشن رپورٹ پر ان کا تنقیدی اختلافی نوٹ ہے اور دوسری چیز ذوالفقار علی بھٹو کیس کے حوالے سے اسلام میں "شہادت" کے اصول و شرائط کے بارے میں ایک استفتا یا استفسار کا جواب ہے جو محض جواب یا فتوے کی حیثیت سے شائع ہوا تھا ۔ یہ عام سائز کی کتاب کے تین صفحوں کی آخری سطر تک پہنچنے سے قبل ختم ہو جاتا ہے لیکن اس سے پتا چلتا ہے کہ فقہ و اسلامی قوانین میں ان کی نظر کتنی گہری، مطالعہ کتنا وسیع

اور ذہن کیسا نکتہ رس تھا۔

مولانا احتشام الحق تھانوی ۱۹۵۵ء میں مقرر کیے جانے والے شادی کمیشن کے واحد عالم دین رکن تھے دیگر تجدد پسند ارکان نے ان کے اختلافات کو نظر انداز کر کے رپورٹ کو مرتب کر دیا تھا۔ جب رپورٹ مرتب ہو کر سامنے آئی تو مولانا نے اس پر اختلافی نوٹ لکھنا ضروری سمجھا، لیکن کمیشن نے مولانا کے اختلافی نوٹ کو رپورٹ میں نہ صرف یہ کہ مکمل شائع نہیں کیا بلکہ جو کچھ شائع کیا تھا وہ بھی نہایت ناقص انداز میں تھا۔ اس سے مولانا تھانوی کے بارے میں غلط فہمی پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔ اس لیے مولانا نے اسے الگ کتابچے کی شکل میں شائع کر دیا۔ میری نظر سے مولانا کا وہ کتابچہ نہیں گزرا، البتہ مولانا عبدالماجد دریابادی نے صدق جدید، لکھنو میں اسے قسط وار شائع کر دیا تھا، اسے دیکھا ہے۔ اس کی پہلی قسط ۲۱ ستمبر ۱۹۵۶ء کو اور سترھویں اور آخری قسط ۲۴۔ مئی ۱۹۵۷ء کو شائع ہوئی۔ ہر قسط صدق جدید کے تقریباً دو صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس لیے ایک عام اندازے کے مطابق عام کتاب کے دو سو صفحوں سے زیادہ کا مواد اس میں موجود ہے۔ اس سے حضرت مولانا تھانوی کے علم و نظر اور ان کی سیرت کے کئی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

۱۔۔۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا تھانوی کی نظر فقہ میں کتنی گہری، باریک بین، نکتہ رس اور مطالعہ کتنا وسیع اور علم کتنا مستحضر تھا

۲۔۔۔ اس کے مطالعے سے مولانا کے طرز استدلال کی جو خوبیاں علم میں آتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا وقت کے بہت بڑے متکلم اور منطقی بھی تھے۔

۳۔۔۔ اس کے مطالعے سے حضرت مولانا کی حق گوئی، بے باکی، جرأت اور بے خوفی کا پتا بھی چلتا ہے۔

مولانا تھانوی کی شاعری:

مولانا احتشام الحق تھانوی کو اللہ تعالیٰ نے سخن فہمی میں کمال عطا فرمایا تھا۔ اساتذاے فن کے ہزاروں عربی، فارسی اور اردو کے اشعار ان کے حافظے میں محفوظ تھے۔ جنھیں وہ اپنی خطابت اور عام مجلس کی گفتگو میں موقع بہ موقع استعمال کرتے اور انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑتے چلے جاتے تھے۔ جب کوئی شعر پڑھتے تو معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ شعر اس موقع کے لیے شاعر نے کہا تھا۔ لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گی کہ مولانا خود بھی شاعر تھے اور کچھ کلام حضرت کی بیاضوں میں محفوظ ہے۔ وہ شاکر تخلص کرتے تھے اور مولوی شوقی اسعدی سے مشورہ سخن کرتے تھے۔ مولانا کی دو غزلیں اور چند رباعیات جو روزنامہ جنگ، کراچی میں شائع ہوئی تھیں، نظر سے گزری ہیں۔ بہ طور نمونہ ایک غزل کے چند شعر، جو زمانہ ٔ طالب علمی میں یکم ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ (۱۹۳۴ء) کی یادگار ہے، یہ ہیں:

کسی کو دل میں رکھنا چاہتا ہوں
کہ ویرانہ بسانا چاہتا ہوں
ذرا رک رک کے کرنا قتل مجھ کو
مزے لے لے کے مرنا چاہتا ہوں
مری آنکھیں کیے دیتی ہیں ظاہر
جو راز دل چھپانا چاہتا ہوں

ایک اور غزل جو ان کے ابتدائی زمانہ ٔ شاعری کی یادگار ہے۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

عجب کیا یاد کرتا ہو کوئی نامہرباں مجھ کو
دم آخر جو پیہم آرہی ہیں ہچکیاں مجھ کو

کیا یک بارگی کیوں ختم اے سوز نہاں مجھ کو
نہ کیوں جلنے دیا گھل گھل کے تو نے شمع ساں مجھ کو
کسی کی غفلتوں نے بھر دیا جام شکیب اپنا
نہ یارائے تحمل ہے نہ اب ضبط فغاں مجھ کو

اب ۱۹۳۳ء کی دو رباعیاں بھی ملاحظہ فرمالیجیے۔اس سے مولانا کے طرز کلام کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

صافے میں نہ جبے میں کرامت ہے اب
بس ہیٹ لگانے میں شرافت ہے اب
افسوس صد افسوس کہ مسلم یہ کہے
داڑھی کے بڑھانے میں حماقت ہے اب

****

لوگوں کا ہر اک کام بھی کرنا مشکل
انکار پہ طعنوں کا بھی سننا مشکل
افسوس کہ اعزاز کے ساتھ اے شاکر
دنیا میں شریفوں کا ہے رہنا مشکل

مولانا کی ایک اور رباعی ملاحظہ ہو:

ڈالی ، کہیں تحفہ ، کہیں نذرانہ ہے
صاحب سے کہیں جنٹ سے یارانہ ہے
دنیا کے طلب گاروں کی حالت مت پوچھ
ہر ایک یہاں نام کا دیوانہ ہے !

ان اشعار کے مطالعے سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ غزل میں وہ روایتی شاعری اور رباعیات میں اکبرالہ آبادی کے طرز فکر وشعر سے متاثر تھے۔

خطیب اعظم:

مولانا احتشام الحق تھانوی اس دور کے بہترین خطیب تھے۔ برصغیر نے جو نامور اور گنے چنے عوامی خطیب پیدا کیے تھے ان میں حضرت کا نام بہت نمایاں ہے۔ لیکن ایک بے مثال عوامی خطیب کہہ کر ہم ان کی خطابت کی شان اور ان کے خطیبانہ کمالات کے بیان سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک جادو بیان اور عوام کے نہایت مقبول خطیب تھے۔ اس میں ان کے کمال علمی، وسعت مطالعہ، مشاہدہ، زبان پر عبور، استدلال کی بہترین قابلیت، حاضر دماغی، قوت استحضار کا کمال، عربی، فارسی اور اردو ادب و شعر پر ان کی گہری نظر اور ہزاروں اشعار کا برزبان ہونا، خوش ذوقی وخوش مذاقی پرلطف حکایات اور علمی وادبی لطائف کی فراوانی پھر ان کی بھاری بھرکم اور پر رعب شخصیت جس سے علمی وقار اور عالمانہ شان وغیرہ وغیرہ کمالات علمی اور خصائص ذہن وفکر کا اور شخصیت کی وجاہت کا اظہار ہوتا تھا اور یہ سب خصائص مل کر انھیں ایک سحر بیان خطیب ماننے پر مجبور کر دیتے تھے۔

ان کی تقریر و خطابت کی ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ صرف عوام کے جذبات ہی سے کام نہیں لیتے تھے بلکہ وہ اپنے سامعین کو سوچنے اور دماغ سے کام لینے پر مجبور کر دیتے تھے۔ ان کی خطابت میں شعلہ نوائی کی نسبت، دعوت کا پہلو زیادہ نمایاں ہوتا تھا۔ وہ جذبات کو بھڑکانے سے زیادہ عقل و ہوش سے کام لینا سکھاتے تھے۔ ان کی خطابت میں محض زبان کی رنگینی اور دل کشی ہی نہ ہوتی تھی، اس میں علم و فکر اور تفقہ اور تدبر کی تہیں موجود ہوتی تھیں سہتاں چہ حضرت تھانوی کی تقاریر سے عوام جتنے خوش ہوتے تھے خواص کی دل چسپی کا سروسامان بھی ان میں اسی قدر ہوتا تھا۔ انھیں خوبیوں کی وجہ سے وہ عوام سے لے کر خواص تک کے مقبول ترین خطیب تھے۔

مولانا کے لیے خطیب پاکستان، خطیب الامت، خطیب زماں وغیرہ القابات

وخطابات استعمال کیے گئے ہیں ۔ یہ ہماری محض کم مائیگی ہے کہ ہم ان کی شان خطابت کو بیان نہیں کر پا رہے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا شمار فن خطابت کے تمام اصول وشرائط کے لحاظ سے دنیا کے صف اول اور عظیم ائمہ خطابت میں، ہوتا ہے ۔

اگرچہ خطابت کے تحریر وکتابت میں آجانے کے بعد ان کی اصل شان خطابت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا لیکن اگر کوئی صاحب حضرت مولانا کے خطبات وتقاریر کو مرتب کرکے شائع کر دیں، تو اس مجموعے سے ان کی علمی وفکری خوبیوں اور اصلاحی ودعوتی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ۔ حضرت مولانا کے یہ خطبات بے شبہ فیضان الہٰی کا سرچشمہ ثابت، ہوں گے ۔

کسی صاحب ہمت کو اس طرف متوجہ نہ پاکر خاکسار راقم الحروف نے اس کام کی انجام دہی کا عزم کر لیا ہے ۔ اگر توفیق الہٰی مساعد ہوئی تو انشاء اللہ جلد ہی حضرت مولانا کے خطبات کا ایک مجموعہ قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہو گا ۔

مجموعہ محاسن:

مولانا احتشام الحق تھانوی مشرقی تہذیب اور ہماری قدیم وضع داری کا مجسمہ تھے ۔ جس شخص سے، جس سطح کے اور جس دائرے میں ان کے تعلقات قائم تھے، وہ انھیں نبھاتے تھے ۔ وہ بہت فراخ حوصلہ، وسیع القلب، کشادہ دست اور بلند خیالات کے مالک تھے ۔ حق گوئی اور بے باکی میں ان کا کوئی جواب نہ تھا ۔ وہ ہمیشہ بلاخوف لومتہ لائم اظہار حق فرماتے تھے ۔ کتمان حق کو وہ شدید ترین معصیت اور بدتر از کفر سمجھتے تھے ۔ لیکن ان کی حق گوئی محض اظہار حق اور اعلاے کلمتہ اللہ کے لیے، ہوتی تھی ۔ کسی کی دل آزاری کو وہ گناہ سمجھتے تھے ۔ ان کی مجلس میں ہر مکتبہ ء خیال وفکر کے لوگ آتے تھے، لیکن دل پر کوئی گراں باری لے کر نہ اٹھتے تھے ۔ مولانا کی شگفتہ مزاجی مشہور تھی ۔ وہ بہت باغ وبہار شخصیت کے مالک تھے ۔ پرلطف حکایات اور عمدہ لطائف سے

مجلس کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔وہ دیو بندی، بریلوی یا اہل سنت، اہل حدیث کے اختلافی مسائل کو عام طور پر نہ چھیڑتے تھے۔وہ فرماتے تھے کہ ان مسائل کے سوا بھی دین کی خدمت کا میدان اتنا وسیع اور اصلاح و دعوت وارشاد کے کام اتنے عظیم ہیں کہ ہماری زندگیاں ان کے لیے ناکافی ہیں۔ بدعات کا خاتمہ اور عوائد ورسوم کی اصلاح ان کی زندگی کا بہت بڑا مقصد تھا۔لیکن اس کے لیے وہ کسی ایک فرقے کو نشانہ کبھی نہ بناتے تھے۔ مسلمان مکاتب فکر کے لیے وہ صلح کل کی پالیسی پر عمل پیرا تھے۔لیکن فرق ومذاہب باطلہ کے لیے وہ شمشیر برہنہ تھے۔اسماعیلی، آغاخانی، قادیانی، پرویزی، جماعت اسلامی کے وہ سخت خلاف تھے۔

ان کی حق گوئی کے سلسلے میں انھیں ان مذاہب وفرق باطلہ کی شدید تنقید اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔انھیں سرکاری مولوی اور حکومت سے فائدہ اٹھانے کا مجرم گردانا گیا۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر ان کے مقام کے تعین کی کوشش کی جائے تو ان کا اصل مقام سرکاری اور درباری کے بجائے حکومت کے نکتہ چینوں اور مخالفین میں ہو گا بلاشبہ پاکستان کی پہلی اور بعد میں آنے والی بعض حکومتوں میں ان کے دوستوں اور واقفوں کی ایک تعداد تھی اوران میں سے بعض کو وہ اسلام اور نظریہ۔ پاکستان کا مخلص سمجھتے تھے۔لیکن مولانا نے ان تعلقات سے ذاتی فائدہ اٹھانے کے بجائے لوگوں کو نفع رسانی یا اسلامی آئین سازی کے لیے استعمال کیا۔وہ کسی شخص کی جائز سفارش کے لیے ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔اوراس کی کاربرآری کے لیے اپنی جیب سے اخراجات برداشت کرکے سفارش یااس کا حق دلوانے یااس کی کوئی اور جائز شکایت دور کرانے کے لیے اپنے آرام کو اس کی رفع تکلیف وشکایت پر قربان کر دیتے تھے۔البتہ حکومت میں جوں جوں بیوروکریسی کے اثرات بڑھنے شروع ہوئے ان کی تشویش میں بھی اضافہ ہونے لگا تھااور رفتہ رفتہ حکومت کے دائرے میں ان کے تعلقات کم ہوتے چلے گئے۔

بیورو کریسی سے ناراضگی:

بیورو کریسی سے وہ سخت ناراض تھے اور اپنے ایک انٹرویو میں اس سے اپنی ناراضگی کے اسباب پر انھوں نے ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

"میں نے اپنی اکثر تقریروں میں بلاشبہ بعض سی۔ ایس۔ پی آفیسروں کو سوشل ازم کے فتنے کی سرپرستی کا الزام دیا ہے اور مجھے آج بھی اس پر اصرار ہے کہ ملک میں ۲۳۔ برس تک سرمایہ دارانہ نظام کو چلانے اور اس نظام کی بدعنوانیوں کو فروغ دینے کی ذمے داری انھی پر ہے۔ نیز ملک کی سیاسی جماعتوں کا گلا گھونٹنے اور جمہوریت کا جنازہ نکالنے میں بھی ان کا ہاتھ رہا ہے۔ ملک کے بنیادی مقاصد سے انحراف اور مذہبی اقدار کو پامال کرنے کے لیے سب سے زیادہ سازشیں اسی طبقے نے کی ہیں۔ نظریہ پاکستان کے خلاف سوشل ازم کے لادینی فتنے کی پرورش بھی انھی کے ہاتھوں ہوئی اور اب بھی سوشل ازم اور لادینی کو فروغ دینے میں ان کا مخفی ہاتھ مصروف ہے۔

یہ ممکن ہے کہ اس طبقے میں بعض صحیح الخیال اور اسلامی ذہن رکھنے والے آفیسر بھی ہوں، جو اپنے عقیدے اور ذہن کے اعتبار سے ایسی سازشوں کو پسند نہ کرتے ہوں، لیکن ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ ان میں سے کسی نے ان سازشوں پر احتجاج کرتے ہوئے اپنی ملازمت سے استعفا دیا ہو کہ یہ "آمر" انھیں اپنی "اغراض" اور "سیاست" کا آلہ کار بنا رہے ہیں اور ان سے آئینی اور قانونی ضابطوں کے خلاف کام لیتے ہیں۔ اس لیے میرے نزدیک اس جرم میں تمام اعلیٰ آفیسرز برابر کے شریک ہیں کہ انھوں نے کرسی اقتدار پر بیٹھ کر یا سازش کی یا سازشیوں کے ساتھ خاموشی سے تعاون کرتے رہے۔"

(ہفت روزہ چٹان، لاہور، ۲۷۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء)

وہ اتنی بڑی اور معروف شخصیت، مشہور عالم دین اور بے غرض سیاسی رہنما تھے کہ اگر کسی سے ملتے تو وہ ان سے بے اعتنائی نہیں برت سکتا تھا۔ ایوب خاں کے دور میں تو وہ کھل کر اپوزیشن میں آگئے تھے۔ ڈاکٹر فضل الرحمن کے بعض افکار کی اشاعت

کو انھوں نے ایوب حکومت کی اسلام دشمنی پر محمول کیا۔یہاں تک کہ رویت ہلال کے مسئلے میں ان کے اختلاف نے تو انھیں قید ونظر بندی تک پہنچا دیا۔ اگرچہ ان کی نظر بندی دو ماہ کے لیے تھی لیکن ملک کے اندر سے اور اسلامی ممالک کی طرف سے ان پر اتنا دباؤ ہوا کہ ڈیڑھ ماہ کے اندر حکومت کو انھیں رہا کر دینا پڑا۔

مجاہد اسلام:

مولانا احتشام الحق تھانوی کی شخصیت کے محاسن، سیرت کے خصائص اور گونا گوں خدمات کے تذکرے میں میرے سامنے پچاسوں مضامین ہیں۔ ان سے میں نے اس مضمون میں استفادہ کیا ہے۔ لیکن میں یہاں صرف شورش کاشمیری مرحوم کے انٹرویو کا اقتباس پیش کروں گا۔ شورش مرحوم نے یہ انٹرویو ۱۹۷۱ء میں لیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> " مولانا احتشام الحق تھانوی کا شمار علمائے حق کے اس قافلہ سخت جان میں ہوتا ہے، جنھوں نے اعلاء کلمۃ الحق کے لیے کبھی بھی مصلحت پسندی یا مداہنت سے کام نہیں لیا۔ قیام پاکستان سے قبل آپ نے تحریک پاکستان اور دو قومی نظریے کی آبیاری کی، پاکستان بنا تو یہاں پر اسلامی دستور کی مہم چلی، اس میں بھی مولانا احتشام الحق تھانوی، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے پابہ رکاب رہے۔
>
> بعض امور میں آپ سے سیاسی اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن آپ کی نیت اور خلوص پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی اصولوں پر آپ نے کسی سے کوئی سمجھوتا نہیں کیا۔ عید کے چاند کے سلسلے میں جب صدر ایوب نے آدھی رات کو چاند نکالا تو آپ کو بھی دیگر علمائے کرام کے ساتھ گرفتار کیا گیا۔ لیکن صدر ایوب پر زوال آکر رہا۔
>
> آج جب یہاں کچھ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی اولاد ناخلف

اسلامی سوشل ازم اور سوشل ازم کا نعرہ بلند کر رہی ہے تو آج پھر آپ سینہ سپر ہو کر ان باطل قوتوں کے مقابلے میں نکل آئے ہیں اور اسلام کا پرچم بلند کیے شہر شہر قریہ قریہ جا رہے ہیں اور مسلمانوں کو اس فتنے سے آگاہ کر رہے ہیں۔ آج وہ اس فتنہ کے خلاف لڑنے والوں کی صف اول میں ہیں اور مرکزی جمعیت علمائے اسلام کی تنظیم نو کے بعد ملک کے گوشے گوشے اور کونے کونے کا دورہ کر رہے ہیں تاکہ عوام کو اس فتنے کے صحیح خد و خال سے روشناس کرایا جائے۔

مولانا کی خطابت میں سحر ہے جو سادہ دل اور ان پڑھ عوام اور نئی تعلیم کے پروردہ لوگوں پر یکساں اثر کرتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ جہاں وہ جاتے ہیں سوشل ازم کے مدعی گھبرا جاتے ہیں، مولانا احتشام الحق تھانوی کے مخالفین ان پر الزام لگاتے ہیں کہ انھوں نے صدر ایوب کے دور میں روٹ پرمٹ لیے، فیکٹریاں بنائیں اور متعدد مراعات حاصل کیں۔ لیکن یہ باتیں اور الزامات سراسر غلط ہیں اور مولانا کا کہنا ہے:

> "صدر ایوب کے دور ہی میں نہیں اس سے پہلے بھی میں نے ارباب اقتدار سے اپنے تعلقات کو کبھی ذاتی منفعت کے لیے استعمال نہیں کیا۔ میں شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی کے ساتھ پاکستان بننے سے پہلے کراچی پہنچ چکا تھا، چاہتا تو بہت کچھ اکٹھا کر لیتا، لیکن میں نے اپنی متروکہ جائیداد کے سوا کچھ نہیں لیا اور اگر کوئی شخص یہ ثابت کر دے کہ میری کوئی فیکٹری ہے یا کوئی ٹرانسپورٹ یا اسی نوع کی کوئی اور جائیداد تو میں یہ جائیداد اسی کے حوالے کر دوں گا۔"

مولانا کی پوری زندگی دینی جد و جہد میں گزر رہی ہے، نظریہ۔ پاکستان پر وہ کسی بھی قیمت پر کوئی سمجھوتا نہیں کر سکتے۔ سوشل ازم کی مخالفت میں وہ کتنے آگے بڑھ گئے ہیں اور ایوب خان کے دور اقتدار میں رویت ہلال کے مسئلے پر اس وقت کے صدر ایوب سے ٹکرا گئے اور مولانا کو جیل جانا پڑا، پولو گراؤنڈ (باغ جناح) میں عیدین کی نماز پڑھاتے تھے، تو حکومت نے انھیں امامت سے

روک دیا اور اس کے بعد سے آپ نشتر پارک میں عیدین کی نماز پڑھاتے ہیں۔ یہاں بھی نمازیوں کا بہت بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ آپ نے دین کے لیے کیا، مگر حق و صداقت کا دامن نہیں چھوڑا۔ آپ اس وقت اسلام کے عظیم مجاہد ہیں۔"

مولانا کی آرزو:

اسلامی آئین کی تدوین و نفاذ کے لیے مولانا احتشام الحق تھانوی کے مساعی کا ذکر آچکا ہے۔ مولانا کی زندگی کے نصب العین اور ان کی دلی آرزو کو انھیں مساعی میں تلاش کرنا چاہیے۔ ایک مسلمان، عالم دین اور تحریک پاکستان کے سچے رہنما کی حیثیت سے ان کی یہ دلی آرزو تھی کہ اللہ کا دین کسی خطہ زمین پر عملاً جاری و ساری ہو جائے۔ چناں چہ انھوں نے ایک ملاقات میں فرمایا:

"دینی اور مذہبی رہنما کی حیثیت سے یہ میری دلی آرزو رہی ہے کہ اللہ کا دین کسی بھی خطہ زمین پر اس طرح جاری ہو جائے کہ اسلام کی صحیح صورت سامنے آجائے۔ میری زندگی کی بہترین خواہش یہ ہے کہ سرزمین پاکستان میں اللہ کا دین عملی صورت میں نافذ ہو۔"

اہل و عیال:

١.... حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی پر اللہ تعالیٰ کے جو بے شمار افضال و انعام و اکرام تھے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انھیں ایک وفا پرست اور دین دار شریک حیات ملی تھی۔ جو اپنی نیک سرشت اور پاک طینت کی بدولت مولانا کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور قلب کے لیے مودت و طمانیت کی موجب تھی۔ حضرت مولانا کی اہلیہ کا نام حسنیٰ تھا جو اپنی سیرت اور صورت دونوں سے لحاظ سے اسم بامسمیٰ تھیں۔ وہ بہت کشادہ دست اور مفلسوں اور ناداروں کی مدد کرنے میں فراخ حوصلہ خاتون تھیں۔ ان کا تعلق

تھانہ بھون کے فاروقی خاندانی سے تھا۔ وہ سید محمد حسن کی بیٹی اور اکبر علی تھانوی کی نواسی تھیں۔ اکبر علی تھانوی حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے سگے بھائی تھے۔ حضرت مولانا کی شادی ۱۹۴۰ء میں انجام پائی تھی۔ یہ خاتون دینی علم اور اسلامی تعلیم وتربیت سے آراستہ تھیں۔ جیکب لائنز میں ہر جمعہ کو بعد نماز جمعہ خواتین سے ان کا خطاب ہوتا تھا۔ وہ بہت موثر انداز میں خواتین کو دین کی باتیں بتاتی اور وعظ ونصیحت فرماتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بیان میں تاثیر پیدا کر دی تھی جس کی بدولت سیکڑوں مسلمان خاندانوں میں دینی انقلاب آگیا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں اولاد کی نعمت سے نوازا تھا۔ ان کی زندگی کی سب سے بڑی مصروفیت اور شوق بچوں کی پرورش اور اسلامی تربیت تھی۔ ان کے اس ذوق وشوق نے گھر کے معاملات اور بچوں کی تعلیم وتربیت کی طرف سے حضرت مولانا تھانوی کو بہت مطمئن اور بے فکر کر دیا تھا۔ حضرت مولانا کی مفارقت کا صدمہ ان کے لیے بڑا جاں کاہ تھا لیکن انھوں نے بڑی ہمت اور حوصلے کے ساتھ اسے برداشت کیا۔ ۲۷۔ مارچ ۱۹۸۷ء کو انھوں نے انتقال فرمایا اور جیکب لائنز میں اپنے نامدار شوہر حضرت مولانا تھانوی کے پہلو میں آسودہ۔ خواب ابدی ہیں۔

۲.... حضرت مولانا احتشام الحق کو اللہ تعالیٰ نے آٹھ بیٹے اور پانچ بیٹیاں عطا کیں۔ تمام اولاد اسلامی تعلیم وتربیت سے آراستہ ہے۔ کئی بیٹے مستند عالم دین اور حافظ قاری ہیں۔ ہر کسی نے بہ قدر ہمت وذوق انعامات واکرامات الٰہیہ میں سے حصہ پایا ہے۔ مولانا احترام الحق تھانوی نے اپنے والد کے سیاسی ذوق اور ملت اسلامیہ کی خدمت کے شوق سے خاص حصہ پایا ہے اور مولانا تنویر الحق تھانوی دین کی خدمت میں حضرت مولانا تھانوی کے جانشیں ہیں۔ دیگر بیٹوں نے اپنے اپنے ذوق عمل کے مطابق مختلف میدانوں کا انتخاب کیا ہے۔ تمام اولاد کو اپنے والد گرامی کی شخصیت پر فخر ہے اور ان میں کوئی ایسا نہیں جس کے اعمال اپنے والد گرامی کی پاکیزہ سیرت اور اجلے دامن کے لیے

داغ اور انگشت نمائی کا باعث ہوں ۔ حضرت مولانا تھانوی کے تمام صاحبزادگان کے اسمائے گرامی بالترتیب یہ ہیں؛

۱۔ مولانا احترام الحق تھانوی ، ۲۔ اعتصام الحق تھانوی ، ۳۔ انتظام الحق تھانوی ، ۴۔ انتظار الحق تھانوی ، ۵۔ نظام الحق تھانوی ، ۶۔ شان الحق صدیقی تھانوی ، ۷۔ مولانا تنویر الحق تھانوی اور ۸۔ قاری سفیر الحق صدیقی تھانوی

سانحہء وفات:

حضرت مولانا احتشام الحق کی پوری زندگی اسلام کی تبلیغ واشاعت، مسلمانوں کی اصلاح، دعوت وارشاد اور خدمت قوم وملک میں گزری تھی اور جب وقت موعود آیا تب بھی وہ میدان عمل میں اعلاء کلمتہ الحق اور اسلام کی دعوت اور سیرت نبوی کا پیغام پھیلانے ملک سے باہر اور جنوب مشرقی ہند کے شہر مدراس میں تھے ۔ وہ ۲۶۔ مارچ ۱۹۸۱ء کو کراچی سے دہلی تشریف لے گئے تھے وہاں سے دیو بند، تھانہ بھون، سہارن پور اور مدراس کا سفر اختیار کیا تھا ۔ اس دوران میں انھوں نے سیرت کے موضوع پر بیسیوں تقریریں کیں ۔ ۱۱۔ اپریل کو بعد نماز جمعہ عظیم الشان سیرت کانفرنس (مدراس) منعقد ہونے والی تھی اور حضرت مولانا کی تقریر سننے کے لیے لاکھوں مسلمان بے تاب نظر آرہے تھے ۔ لیکن اسی صبح ان پر دل کا دورہ پڑا اور وہ عالم مسافرت میں اپنے خالق حقیقی سے جاملے ۔ شب کو ان کی میت کراچی لائی گئی، صبح کو نشتر پارک میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی ۔ اب جامع مسجد جیکب لائنز کے ایک گوشے میں آسودہء خاک اور محو خواب ابدی ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ان کی خدمت دین اور غم گساری ملت اور اسلام اور امت مسلمہ کے لیے ان کے مساعی کو قبول فرمائے ۔ ان کے مراتب بلند ہوں اور جوار رحمت الٰہی میں جگہ پائیں ۔

حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کی وفات محض ایک عالم دین اور سیاست

دان کے انتقال کا حادثہ نہ تھا، بلکہ ان کے انتقال سے ایک دور علم وتہذیب کا خاتمہ ہو گیا۔ان کی شخصیت صرف شمع انجمن ہی نہ تھی بلکہ وہ اپنی ذات سے اسلامی اخلاق اور مشرقی روایات کی ایک مستقل انجمن اور مجموعہ۔خوبی تھے۔

حضرت مولانا مرحوم کی وفات پر قومی صحافت اور مذہبی دینی اداروں اور ان کے علمی تعلیمی جرائد نے نیز قومی رہنماؤں، شاعروں، علماے امت، مختلف مذاہب وفرق کے ائمہ وقت نے جس طرح ماتم کیا اور ان کی خدمات کا اعتراف نیز فضائل ومحاسن کو خراج تحسین پیش کیا۔اس کی کوئی دوسری مثال پاکستان کی تاریخ میں مشکل سے پیش کی جاسکے گی۔

پیش لفظ

میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ مجھے مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی کو قریب سے دیکھنے کی سعادت حاصل ہے یا میں نے ان کے سیاسی اور مذہبی فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ میں ان لاکھوں لوگوں میں سے ایک ہوں جو سالہا سال سے کراچی پولو گراؤنڈ میں عیدین کی نمازیں مولانا صاحب کی امامت میں پڑھتے رہے اور ایسے موقعوں پر ان کی روانی تقریر، شیرینی گفتار اور دلکش انداز بیان سے متاثر ہوئے۔ ہمارے معاشرے کے مختلف الخیال دانشوروں اور ہر سطح کے امیر وغریب لوگوں کے سامنے مذہبی اور معاشرتی مسائل پر اپنے نقطہ نظر کو جس سادہ، دلچسپ اور موثر پیرائے میں وہ پیش کرتے ہیں اس سے میں بھی متاثر ہوا۔

سنہ ۱۹۶۸ء میں جب میں نے ملکی سیاست میں عملی طور پر حصہ لینا شروع کیا تب سے اکثر و بیشتر مولانا احتشام الحق صاحب سے ملنے کے مواقع ملتے رہے اور مجھے ان ملاقاتوں سے ہمیشہ مسرت ہوئی۔

مولانا صاحب نے اسلام اور پاکستان کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی وجہ سے انھیں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ مذہبی، معاشرتی اور سیاسی معاملات میں ان کے خیالات ہمیشہ لوگوں کے لیے بہت مفید رہے۔ میں انھیں اپنے ملک کا ایک قابل احترام مذہبی اور سیاسی رہنما سمجھتا ہوں۔

سنہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے بعد ایک ملاقات میں مولانا صاحب نے مجھے اس کتاب کا پیش لفظ لکھنے کو کہا میں نے ان سے معذرت چاہی اس لیے کہ ایک ایسے متبحر

عالم دین کی تصنیف کا پیش لفظ لکھنا مجھے نامناسب معلوم ہوا۔ لیکن مولانا صاحب کی دینی اور سیاسی بصیرت کے علاوہ یا شاید اس کی وجہ سے وہ بہت عمدہ طریقے سے اپنی بات منوا لیتے ہیں، چنانچہ مجھ پر ان کی جادو بیانی کام کر گئی اور میں نے ان کی تجویز قبول کر لی۔ چند ہفتوں کے بعد جب کتاب کا مسودہ میرے پاس پہنچا اور میں نے پڑھا تو مجھے خیال آیا کہ کاش میں نے اس اعزاز کو قبول نہ کیا ہوتا۔ جس کے لیے مولانا صاحب نے ازراہِ مہربانی مجھے منتخب کیا تھا۔

۷۔ دسمبر سنہ ۱۹۷۰ء کو ہونے والے انتخابات میں جس حلقے سے میں نے انتخاب لڑا، اس میں میرے سب سے بڑے حریف پیپلز پارٹی اور جماعت اسلامی کے امیدوار تھے۔ اگرچہ میں اس مقابلے میں کامیاب نہ ہوا۔ میرے لیے یہ تجربہ جو مجھے لوگوں اور سیاسی جماعتوں کو جاننے اور ہمارے سماجی اور مذہبی اختلافات کی گہرائی تک پہنچنے میں ہوا، ایک عظیم تجربہ تھا۔

اگر میری مخالفت اس شدت سے نہ ہوتی تو بہت ممکن ہے کہ میں اس سیاسی تربیت سے محروم رہ جاتا۔ اس قابل قدر تجربے کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی پرخاش نہیں۔ خصوصاً پیپلز پارٹی کے لیے جس کا امیدوار کامیاب ہوا اور جماعت اسلامی کے لیے جس نے کسی وجہ سے مجھے ایسا شخص سمجھ رکھا تھا، جسے انتخابات میں شکست دینا بہت ضروری تھا۔

چونکہ اس کتاب کا بڑا حصہ ہماری سیاست میں جماعت اسلامی کے کردار پر تنقید سے متعلق ہے۔ اس کے پیش لفظ لکھنے سے میں سمجھتا ہوں، یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ جماعت اسلامی کی طرف سے جو نقصان مجھے پہنچا یہ اس کا فطری ردعمل ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں جماعت اسلامی کے بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جن کے خیالات، ذہانت اور اخلاقی جرأت کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ انھوں نے جو کچھ ملکی سیاست میں کیا یا کرنا چاہتے ہیں مجھے ان کے بہت سے

پہلوؤں سے اختلاف ہے۔لیکن میں ان کا بدخواہ نہیں۔

مولانا احتشام الحق صاحب نے جو نتائج اخذ کیے ہیں۔ان کے پاس ان کے کافی وجوہ ہیں۔جو انھوں نے عوام کے سامنے رکھ دیے ہیں۔یہ خیالات ایسے ہیں کہ لوگوں کو ان کا علم ہونا چاہیے۔ان خیالات کی اشاعت سے لوگوں میں بحث وتکرار اور تنقید کی شدت ایک لازمی بات ہے۔اگر اس بحث وتنقید کے نتیجے میں ہم اسلام اور اپنے ملک کی خدمت میں متحدہ کوششوں کو بروئے کار لاسکے، تو یقیناً یہ مولانا صاحب کے ہاتھوں ملک کی ایک زبردست خدمت سمجھی جائے گی۔

اس کتاب کے پڑھنے سے قاری پر ہماری مذہبی گروہ بندیوں اور ان کے رہنماؤں کے افسوسناک اختلافات بھی واضح ہوجائیں گے اور قاری کو یہ احساس بھی ہو جائے گا کہ جن لوگوں کو ہمارے سیاسی اور دینی فکر کی رہنمائی کا شوق ہے۔ان کے درمیان بھی کسی حد تک فکر وعمل کی یک جہتی بہت ضروری ہے اور بعید نہیں کہ یہ احساس ہمارے مذہبی رہنماؤں پر بھی اتنا اثر کرے کہ وہ قومی مسائل اور مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے زیادہ حقیقت پسندانہ طرز عمل اختیار کریں۔ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے سے باز آئیں اور اس دلدل سے باہر نکلیں جس میں یہ لوگ بتدریج پھنستے چلے گئے۔

یہ بالکل واضح ہے کہ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو ملکی سیاست میں ایک طاقت کی حیثیت سے بالکل ختم ہوجائیں گے اور لوگ انھیں سیاسی رہنمائی کے منصب سے بے دخل کرکے ان کے دائرہ عمل کو مذہبی رسموں کی تقریبات کی انجام دہی تک محدود کردیں گے اور ہمارے دور کے سیاسی اقتصادی اور معاشرتی مسائل پر اثر انداز ہونے والے امور میں رہنمائی کا مقام خودبخود دوسرے لوگوں کو منتقل ہوجائے گا۔

ایبٹ آباد — (ائر مارشل ریٹائرڈ) محمد اصغر خان

۲۔جون ۱۹۷۱

حرف آغاز

یہ کتاب سنہ ۱۹۷۱ء کے شروع میں مکمل ہو گئی تھی۔اس کے بعد چند در چند موانع پیدا ہوتے گئے کہ اب کہ سنہ ۱۹۷۳ء قریب الاختتام ہے، پریس کو دی جارہی ہے ان دو ڈھائی برسوں میں ملک کے عام سیاسی حالات سب کے سامنے ہیں لیکن جو امور اس کتاب کی اشاعت میں مانع ہوئے نامناسب نہ ہوگا کہ ان کا یہاں مختصر طور پر تذکرہ کر دیا جائے۔اسلام پسند جماعتوں میں انتشار کی بدولت سنہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے جو نتائج سامنے آئے ان کا ذکر اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ آچکا ہے۔اور انتخابات کے بعد اس ملک کی سالمیت اور نظریہ پاکستان پر جو کچھ بیتی اور اسے جو نقصان پہنچا وہ قطعی طور پر میرے اندازے کے خلاف نہ تھا۔حالات نے جو رخ اختیار کیا تھا یہ اس کا بدیہی نتیجہ تھا۔اس وقت اس کتاب کی اشاعت کا مناسب وقت تھا تاکہ حقائق سے پردہ اٹھتا اور لوگوں کو صحیح حالات کا علم ہوتا ان میں کھرے کھوٹے کی تمیز پیدا ہوتی۔لیکن ایک طرف تو مشرقی پاکستان کے الم ناک حادثے سے قوم پر جو غم واندوہ کا پہاڑ ٹوٹا تھا، اس سے طبیعت انتہائی متاثر اور غم زدہ تھی اور دوسری طرف پھر کچھ لوگ اندوہِ الم کی اس تاریک شب میں امیدِ اتحاد کی شمع فروزاں کرنے کے لیے ساعی تھے۔

میرے نزدیک چونکہ ملک پر یہ المناک مصیبت انتشار ملی کے نتیجے میں نازل ہوئی تھی۔اس لیے میں اتحاد ملی کے کسی ادنیٰ امکان کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا تھا اور

نہ سعی سے دست بردار ہو سکتا تھا۔ اس خیال سے میں نے اس کتاب کی اشاعت کو ملتوی کر دینا مناسب خیال کیا اور سوچا کہ اگر ان حادثات عظیمہ کے بعد بھی دائیں بازو کے رہنما سچے دل سے اتحاد پر آمادہ ہو جائیں اور فی الواقع اتحاد کا خواب شرمندہ تعبیر ہو جائے تو اس کتاب کو اس امکان میں رخنہ نہیں بننے دینا چاہیے۔ ویسے جماعت اسلامی کے بارے میں میرا یہ یقین روز بروز پختہ ہوتا گیا کہ مسلمانوں کے جس اتحاد میں جماعت اسلامی کی سیاست شامل ہوگی وہ اتحاد کبھی قائم نہیں رہ سکے گا۔ صرف اس وجہ سے کہ جماعت اسلامی کہیں جماعتی مفاد کی سطح سے بلند ہو کر نہیں سوچ سکتی۔ یہ اس کے مزاج کی بات تھی اور کوئی جماعت اس طرح اپنا مزاج نہیں بدل سکتی۔

چنانچہ جلد ہی معلوم ہو گیا کہ جن وسیع بنیادوں پر ملک کی سالمیت اور نظریہ پاکستان کی حفاظت کے لیے اتحاد کی ضرورت ہے وہ ضرورت تمام محب اسلام جماعتوں کے اتحاد ہی سے پوری ہو سکتی تھی، لیکن ہوا یہ کہ بھٹو صاحب کے اقتدار سنبھالتے ہی محب اسلام جماعتوں نے اپنے لیے ایک نیا میدان عمل تلاش کر لیا۔ اب ان کے نزدیک ملک میں محب اسلام جماعتوں کے اتحاد کے مقابلے میں اسمبلی میں حزب اختلاف کے نمائندوں میں اتحاد عمل کافی تھا۔ اس اتحاد کا بنیادی نکتہ بھی تعاون علی البر نہ تھا بلکہ یہ اجتماع ضدین حزب اقتدار کی مخالفت اور حکومت کو ناکام بنانے پر ہوا تھا۔ دوسری بات جو ان تمام حضرات کے رویے سے ظاہر ہوئی تھی، وہ یہ تھی کہ اب گویا ملک وقوم کی سب سے زیادہ اہمیت اس مسئلے کو تھی کہ ان کی اسمبلی کی رکنیت بھی خطرے میں نہ پڑ جائے۔ اس کے لیے انھوں نے دوسری اکثریتی پارٹی کا اصول بھی تسلیم کر لیا۔ حالانکہ پہلے وہ اس کے سب سے بڑے مخالف تھے اور جب صدر بھٹو نے اشارتاً یہ بات کہی تھی تو اس کے خلاف بیان بازیوں سے انھیں حضرات نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ لیکن جب یحییٰ خان نے دوسری اکثریتی پارٹی کو اقتدار سونپا تو یہ تمام جماعتیں اس پر خاموش رہیں اور یحییٰ خان کے مارشل لا سے بھٹو صاحب کے غیر فوجی

مارشل لا کے آگے سر نیاز خم کر دیا۔ پھر عبوری آئین کی منظوری کے وقت حزب اختلاف کی پارلیمانی پارٹیوں نے مارشل لا کی دفعات کی شمولیت کو تسلیم کرکے پھر مارشل لا کو قانونی حیثیت سے قوم کے سروں پر مسلط کر دیا۔

جہاں تک نیپ (نیشنل عوامی پارٹی) کا تعلق ہے، تو اس کی ہمنوائی سمجھ میں آتی تھی کہ صدر بھٹو نے یحییٰ حکومت کی لگائی ہوئی نیپ پر پابندی ہٹا کر گویا نیپ پر احسان کیا تھا اور نیپ اس احسان کا بدلہ چکا رہی تھی۔ لیکن جماعت اسلامی کی نیپ سے نیاز مندی اور حکومت کی ہمنوائی اس وقت بھی سمجھ سے بالاتر تھی اور آج بھی، لیکن جب کچھ ہی روز کے بعد ان غلط اقدامات کے نتائج سامنے آنے لگے تو ایک بار پھر اسلامی جماعتوں کے اتحاد کی ضرورت کو محسوس کیا جانے لگا۔ چنانچہ اگست سنہ ۱۹۷۲ء میں نواب زادہ نصر اللہ خان، جماعت اسلامی کے جیلانی صاحب، جمعیت علمائے اسلام کے رانا ظفر اللہ صاحب، جمعیت اہل حدیث کے علامہ احسان الٰہی ظہیر صاحب لسانی ہنگاموں کے بعد کراچی تشریف لائے تو ایک نشست میرے مکان پر ہوئی اور محب اسلام جماعتوں کے اتحاد پر غور کیا گیا۔ لیکن میں نے یہ سمجھ کر پھر اس کتاب کی اشاعت کو ملتوی کر دیا کہ شاید بعد از خرابی بسیار اتحاد کی کوئی شکل پیدا ہو جائے۔ لیکن شدید بے چینی کے ساتھ اس گفتگو کے نتائج و ثمرات کا ابھی انتظار ہی کر رہا تھا کہ ایک روز اخبار میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ)، جماعت اسلامی اور جمعیت علمائے پاکستان نے نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ اتحاد کر لیا ہے اور ایک جمہوری متحدہ محاذ وجود میں آگیا ہے۔ اس خبر سے واقعی محب اسلام عناصر پر ایک قسم کی مایوسی چھا گئی۔ یہ قطعی طور پر ظاہر ہے کہ نیپ اپنے فکر و منشور کے لحاظ سے ایک لادینی جماعت ہے۔ اس کا انداز فکر قطعی غیر اسلامی ہے۔ وہ ملک میں سوشلسٹ نظام کی داعی ہے۔ اس کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے۔ بہت زیادہ دن نہیں ہوئے کہ جماعت اسلامی انھیں بنیادوں پر نیپ کی سب سے بڑی دشمن تھی۔ سوشلسٹ نظام کے قیام کے

لیے اس کے مساعی کی تاریخ پیپلز پارٹی سے بہت پرانی ہے ۔ ایک طرف تو جماعت اسلامی نے اس کے نظریات و داعیات کے خلاف محاذ بنا رکھا تھا ۔ چراغ راہ کا " اسلامی سوشلزم نمبر " اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے ، دوسری طرف اسمبلی کی سیٹوں کے تحفظ کے لیے اور بھٹو صاحب کی مخالفت کے جوش میں اب اس سے اتحاد کر لیا تھا ۔ محب اسلام عناصر جماعت اسلامی کے اس تضاد پر حیران تھے ، ان کے ذہنوں میں یہ سوالات پیدا ہو رہے تھے کہ آخر جماعت اسلامی یہ کیا کر رہی ہے اور بھٹو صاحب کی مخالفت کے جوش میں یا اسمبلی کی چند سیٹوں کے تحفظ کے لیے رہنمائی کی باگ ڈور کس جماعت کے ہاتھ میں دے رہی ہے ۔

اسی طرح مفتی محمود صاحب اور ان کی جماعت ایک عظیم تضاد میں مبتلا تھی ۔ یہ معلوم ہے کہ مفتی صاحب اسلامی سوشلزم کی حمایت میں نہایت پرجوش تھے ۔ بھٹو صاحب سے اتحاد اور ان کی جماعت میں ان کی مستعدی بھی معلوم ہے ۔ لیکن اب وہ اور ان کی جماعت اقتدار کی خاطر بھٹو صاحب کی مخالفت میں جمہوری متحدہ محاذ میں نہایت سرگرم تھی ۔

ان متضاد عناصر اور متبائن اغراض و مقاصد رکھنے والی جماعتوں کے اس گٹھ جوڑ سے خیر کی نہ صرف رہی سہی امید بھی ختم ہوئی ، بلکہ اس سے ملک کی سالمیت اور اسلام کے خلاف اور زیادہ خطرات پیدا ہو گئے ۔ اس کا اندازہ دستور سازی کے دوران میں اور دستور پاس کرانے اور حلف اٹھانے کے موقع پر اس کے انتہائی گھناؤنے اور مایوس کن کردار سے لگایا جا سکتا ہے ۔

جمہوری متحدہ محاذ کے قیام کی خبر پر میں نے ایک پریس کانفرنس طلب کی اور ایک بیان دیا ۔ چونکہ یہ بیان حالات و واقعات کے تجزیے میں ممد و معاون ثابت ہو گا اس لیے اس کی اہمیت کے پیش نظر بطور ضمیمہ اسے کتاب کے آخر میں شامل کر دیا ہے ان حالات نے مجھے اس رائے پر پھر مستحکم کر دیا کہ اس کتاب کی اشاعت میں تاخیر

نہیں کرنی چاہیے ۔ لیکن جس چیز نے اس رائے پر نہ صرف ذہن کو استوار کر دیا بلکہ سمندِ شوق کے لیے تازیانہ ثابت ہوئی وہ حال ہی میں تحریک سول نافرمانی کا اقدام ہے، جو فی نفسہ غلط تھا اور غلط موقع پر بھی تھا۔ اس سے محبِ اسلام جماعتوں کے اخلاص پر بھی حرف آتا ہے اور ان کی سیاسی عدم بصیرت اور بے تدبیری کا فیصلہ بھی ہو جاتا ہے۔

تحریک سول نافرمانی ہر دو اعتبار سے غلط تھی؛

اولاً: اس لحاظ سے کہ اس کا فائدہ بہرحال ان عناصر کو پہنچنا تھا، جو اسلام اور اسلام پسند عناصر سے اس سے زیادہ ہمدردی نہیں رکھتے بلکہ اپنے سیاسی اور سوشلسٹ مقاصد کے لیے وقتاً فوقتاً اسلام کا نام لیتے ہیں۔ ثانیاً: سول نافرمانی کی تحریک ایک نہایت غلط موقع پر شروع کی گئی اور بعض مخلصین کی آرا کو قطعاً نظر انداز کر دیا گیا۔ گزشتہ جولائی کے بعد سیلاب کی وجہ سے ملک کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا وہ معلوم ہے۔ جولائی میں کراچی کی زندگی تہ و بالا ہوئی، پھر اگست میں پنجاب اور سندھ کی زندگی تلپٹ ہو گئی۔ ہزارہا افراد سیلاب کی نذر ہو گئے، ہزاروں خاندان تباہ ہو گئے، آبادیوں کی آبادیاں صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ لیکن ٹھیک یہ وقت جب کہ قوم اور ملک پر مصیبت کے یہ پہاڑ ٹوٹ رہے تھے، جمہوری متحدہ محاذ نے اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے صدر بھٹو اور موجودہ حکومت کے خلاف تحریک چلانے کے لیے منتخب کیا اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ انتظامیہ کے ساتھ عدم تعاون کا اعلان کر کے ایک ایسے وقت میں حکومت کی مشینری کو فیل کرنے کی کوشش کی، جب کہ ملک اور قوم کو تعاون اور امداد کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ اس وقت قوم کسی تحریک میں آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہیں تھی بلکہ اسے آپ کی امداد و تعاون کی امید تھی۔ لیکن جیسی کہ توقع تھی تحریک ناکام ہو گئی، اس کا ایک برا نتیجہ یہ نکلا کہ اب ایک مدت تک عوام کسی صحیح تحریک کا ساتھ دینے میں بھی مذبذب رہیں گے اور کامیابی کی صورت میں اس کا فائدہ تو شاید ان جماعتوں کے چند لوگوں کے حصے میں آتا لیکن نقصان میں پورا ملک

شریک ہوتا۔ آخر اس سے بڑی شقاوت اور بے بصیرتی کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں میرا مقصد سول نافرمانی کی تحریک اور اس کے عواقب و نتائج کی بحث نہیں ہے، میں ان کے اس غلط اور بے موقع اقدام سے متحدہ جمہوری محاذ کے اس عدم تدبر کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ اس نے جب قدم اٹھایا غلط اٹھایا۔ اس کی روداد بڑی طویل ہے اور بعض اشارات اس کتاب میں کیے جا چکے ہیں۔ لیکن یہ کتنی بڑی حیرت کی بات ہے کہ پہلے جب عدم تعاون کا صحیح وقت تھا اور ان کے لیے جواز بھی موجود تھا تو انھوں نے اکثریتی پارٹی کے حق حکومت کو تسلیم نہ کیا اور عارضی دستور اور مارشل لا کو تسلیم کر کے حکومت سے تعاون کیا اور جب واقعی ہنگامی حالات پیدا ہوئے اور ملک اور قوم پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور حکومت سے تعاون اور ملک اور قوم کو ان کی امداد کی ضرورت تھی تو سول نافرمانی کی تحریک کا اعلان کر دیا۔ اس کے نتیجے میں جو مایوس کن صورت حال پیدا ہوئی وہ ہمارے سامنے ہے۔

دیباچہ

اسلامی دستور کی تدوین میں، اسے پاس کرانے میں اور اسلامی نظام حیات کو بروے کار لانے کی جدوجہد میں مختلف جماعتوں اور افراد کا کردار کیا رہا ہے اور اس مقصد میں ناکامی کے عوامل کیا تھے۔یہ پاکستان کی دستوری وسیاسی تاریخ کا نہایت اہم باب ہے اور ابھی تک پردہ۔ خفا میں ہے۔اگر زندگی نے مہلت دی تو انشاء اللہ ضرور قلم بند کیا جائے گا۔

اس وقت ایوب خان کی گول میز کانفرنس کے بعد مختلف جماعتوں کے کردار اور اسلام پسند عناصر کے اتحاد میں ناکامی کے اسباب وعوامل سے بحث مقصود ہے۔

انتخابات میں اسلام پسند جماعتوں کی ناکامی کا ردعمل، مختلف حلقوں میں مختلف ہوا ہے اور مختلف ذہنوں نے اس سے مختلف اثرات قبول کیے ہیں۔

* ایک خاص حلقے میں اسلام پسند عناصر کی شکست کو اسلام کی شکست سے تعبیر کیا جارہا ہے۔
* حتی کہ بعض ذہن اب پاکستان میں اسلام کے مستقبل کو تاریک سمجھنے لگے ہیں۔
* بعض اطراف سے اس ناکامی کا الزام مختلف اسلام پسند جماعتوں پر ڈالا جارہا ہے

جماعت اسلامی اس معاملے میں سب سے زیادہ مستعد ہے۔اس وقت اس کی

تمام تر صلاحیتیں اس امر میں صرف ہو رہی ہیں کہ اس ناکامی کی ذمہ داری وہ دوسروں پر ڈال کر اپنے دامن کو پاک وصاف ثابت کر دے۔ جماعت اسلامی نے حقائق کو پس پشت ڈال کر اسباب ونتائج کی جو تصویر لوگوں کو دکھانی شروع کی ہے۔ اس نے صرف اسی کے اخلاق ودیانت کا فیصلہ نہیں کر دیا ہے بلکہ اس کا ایک خطرناک پہلو یہ ہے کہ آئندہ صحیح راہ اور طرز عمل اختیار کرنے کی راہیں مسدود ہوتی جائیں گی۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر ہم ہار گئے تو حقیقت پسندی کا ثبوت دیں اور صاف صاف اس کا اعتراف کر لیں۔ اگر اس ناکامی میں ہمارا کچھ حصہ ہے تو اس کو بلا چون وچرا تسلیم کریں اور اگر اس میں کسی دوسری جماعت کی ذمہ داری ہے تو الزام کے جذبے کی بجائے افہام واظہارِ حق کے نقطہ نظر سے اس کے اسباب کو سامنے لائیں اور یہ سمجھ لیں کہ پردوں کو ہٹائے اور نقابوں کو الٹے بغیر ہم حقیقت کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے اور اس کے بغیر نظر بصیرت وا نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ناگزیر فرض ہے جسے ہم ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ اس تحریر کا اصل مقصد کسی شخص یا کسی جماعت کی مخالفت یا اس پر کیچڑ اچھالنا ہرگز نہیں ہے۔ جماعت اسلامی اور اس کے رہنماؤں کا رویہ اگر ہدف تنقید بنا ہے تو یہ حالات کا ناگزیر تقاضا اور ادائے فرض کی مجبوری ہے۔

میں نے اپنی پوری زندگی میں یا پاکستان کی ۲۳ سالہ تاریخ میں جب کہ میں سیاسیات سے بہت قریب رہا ہوں اور ہر سطح کی اور ہر قسم کی شخصیتوں سے میرا سابقہ پڑا ہے اور قومی زندگی کے مختلف مراحل میں مختلف جماعتوں کے کردار پر میری نظر رہی ہے۔ نیز خوش گوار اور ناخوش گوار بہت سے تجربات ہوئے ہیں۔ لیکن کسی کی مخالفت بے جا یا کسی کو رسوا کرنے کی معصیت سے کبھی زبان وقلم کو آلودہ نہیں کیا۔ جب بھی اس قسم کا خیال آیا تو اس جماعت یا افراد کی مجبوریوں پر نظر گئی۔

یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ جماعت اسلامی سے مجھے شدید اختلافات ہیں۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کے دینی تصورات اور فقہی اجتہادات سے میں نے ہمیشہ اختلاف کیا۔ جماعت اسلامی کی سیاست اور اس کے طریقہ کار کو بھی میں نے اپنی

دینی اور اسلامی بصیرت کی بنا پر پسندیدہ نہیں سمجھا۔ میں نے ان کی علمی تحقیقات اور ان کے تاریخی کارناموں کو حقیقت کے برعکس بھی سمجھا اور مصالحِ امت کے خلاف بھی پایا۔

ان کے بعض خیالات میرے نزدیک صریح گمراہی اور بے دینی پر مبنی ہیں۔ مختلف مواقع پر میں نے خود مودودی صاحب کو ٹوکا بھی ہے اور ان سے ان کی علمی تحقیقات اور فقہی اجتہادات میں رویے کی تبدیلی اور فقہ وحدیث کے معاملات میں رائے دینے سے گریز کی درخواست بھی کی ہے کہ یہ علوم وفنون ان کے دائرہ علم و تعلیم میں نہیں آتے ہیں۔ ان کی طبع آزمائی کے اظہار کے لیے ہماری ادبی وسیاسی زندگی کے بہت سے موضوعات ہیں جن میں ان کی جولانی طبع اور قلم فرسائی سے قوم کو فائدہ بھی پہنچ سکتا ہے۔ لیکن میں یہ نہیں کہتا کہ اگر کسی نے مولانا مودودی صاحب کے فکر واجتہاد کے بارے میں مجھ سے کوئی بات دریافت کی ہے تو میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ الحمدللہ کہ کتمان حق کی معصیت سے بھی میرا دامن پاک رہا ہے اور میں نے کبھی یہ پسند نہیں کیا کہ گونگے شیطان کی وعید نبوی (علی صاحبہا الصّلوٰۃ والسلام) کا مورد بنوں۔ لیکن محض مخالفت، الزام اور کیچڑ اچھالنا میرا مقصد کبھی نہیں رہا۔

ہمارے ملک میں شروع سے اسلام اور لادینی افکار، بے دین جماعتوں اور اسلامی نقطہ نظر رکھنے والی جماعتوں اور دشمن اسلام قوتوں اور اسلام پسند عناصر کے مابین مقابلہ اور تصادم رہا ہے۔ اس تصادم میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کی مخالفت کو مسئلہ بنالینا میں نے ہمیشہ اسلامی مفاد کے خلاف سمجھا اور میں ہمیشہ اپنے اس یقین پر قائم رہا کہ جماعت اسلامی سے مقابلہ وتصادم میں جماعت اسلامی کو نقصان پہنچے یا نہ پہنچے، لادینی عناصر کو فائدہ ضرور پہنچے گا، اور یہ بات کسی مرحلے میں بھی میرے نزدیک پسندیدہ نہیں تھی۔ اس لیے جماعت اسلامی کی مخالفت کو کبھی مسئلہ نہیں بنایا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ میں جماعت اسلامی کے افکار وخیالات کا حامی یا مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کا معتقد ہوں، لیکن لادینی عناصر

کا دشمن ضرور ہوں اور اپنے کسی فکری ونظری اختلاف سے انھیں فائدہ پہنچانا کبھی مطلوب ومحبوب نہیں رہا۔

سنہ ۱۹۵۰ء کے انتخابات میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب اس وقت کی مسلم لیگ اوراس کے لیڈر نواب زادہ لیاقت علی خان کی مخالفت میں اس سے بہت زیادہ شدید تھے۔ جتنے کہ وہ آج مسلم لیگ کے مخالف ہیں اور اس وقت ان کے اخبارات، روزنامہ تسنیم اور کوثر وغیرہ میں اس سے بہت زیادہ شدید مضمون نکلے تھے جتنے شدید اور تیز وتند زندگی، جسارت وغیرہ میں سنہ ۱۹۷۰ء میں نکلے ہیں اور میرا تعلق اس وقت کی مسلم لیگ اور حکومت کے سربرآوردہ اصحاب سے آج کے مقابلے میں بہت زیادہ اور قریبی تھا۔

نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم نے جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کے خلاف ہمارا تعاون بھی چاہا مگر ہم اپنی اسی پالیسی پر قائم رہے جو ہماری بصیرت نے ہمیں صحیح بتائی تھی اور جس سے ملت اسلامیہ کا اور اسلام کا مفاد وابستہ تھا لیاقت علی خان مرحوم نے ہم سے مایوس ہو کر بعض دوسرے علما کا تعاون حاصل کیا اور انھوں نے جماعت اسلامی کی بری گت بنادی۔

اس کے بعد بھی خواجہ ناظم الدین، مسٹر غلام محمد، میجر جنرل اسکندر مرزا اور سب سے آخر میں ایوب خان کے مختلف زمانوں میں جماعت اسلامی کے خلاف محاذ بنائے گئے اور اس میں ہمارا تعاون حاصل کرنے کی بہت کوشش کی گئی۔ لیکن ہمارے پیش نظر جماعت اسلامی کی مخالفت سے زیادہ اہم اسلام اور پاکستان میں اسلامی تحریک کا مفاد تھا۔ اس لیے ان تمام حکومتوں کو ہمارا تعاون حاصل کرنے میں مایوس ہونا پڑا۔ اور جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب سے شدید اختلافات کے باوجود ان کے مقابلے میں کسی حکومت کا آلہ کار بننا ہم نے پسند نہ کیا۔

جماعت اسلامی کی مخالفت میں ایوب خان کو مایوس کرنے ہی کا نتیجہ تھا کہ دیوبندی مکتبہ فکر کے علما ان کے معتوب قرار پائے اور ایوب خان کے یہ طعنے سنے کہ

" دیوبندی مکتبہ فکر بھی جماعت اسلامی کی ایک شاخ ہے " ۔ حالانکہ اسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے بعض علما نے اس موقع پر جماعت اسلامی اور مولانا مودودی صاحب کے خلاف ایک زبردست مہم چلائی ۔ ان کے افکار ونظریات پر سخت تنقیدیں کیں اور ان کے اصولی وفقہی اجتہادات پر سخت گرفت کی اور اس طرح جماعت اسلامی کا ناطقہ بند کر دیا ۔ اس وقت بھی ہم نے مولانا مودودی صاحب یا جماعت اسلامی کے خلاف زبان کھولنا اسلامی مفاد کے خلاف سمجھا اور یہی یقین کیا کہ اس سے نقصان اسلامی اخوت اور اسلام پسند عناصر کو پہنچے گا اور فائدہ بے دین حکومت اٹھائے گی ۔

ہماری اس حکمت عملی اور پالیسی کی بنا پر خود ہمارے بعض بزرگوں نے ہمیں چھوڑ دیا اور ہم سے ناراض ہو گئے ۔ ہم نے اپنے بزرگوں کی خفگی اور ناراضگی کو ان کے اخلاص کے خلاف نہیں سمجھا ۔ لیکن ہمیں اپنی رائے کے بارے میں بھی یمین ویسار کا تذبذب نہیں پیدا ہوا ۔ اللہ تعالیٰ مولانا حسرت موہانی کو غریق رحمت کرے ۔ کیا خوب کہہ گئے ہیں:

طعن احباب سنے ، سرزنش خلق سہی
ہم نے کیا کیا ، تری خاطر سے گوارا نہ کیا !

اگست سنہ ۱۹۶۹ء میں جب سوشلزم کے خلاف ملک گیر پیمانے پر مہم چلائی گئی تو ہم پر جگہ جگہ مودودی کے ایجنٹ اور مودودی کے پٹھو، کے آوازے کسے گئے اور صرف مولانا مودودی صاحب کی مخالفت نہ کرنے کے جرم میں ہدف تنقید واستہزا بننا پڑا یہاں تک کہ حضرت مولانا غلام اللہ خان صاحب مدظلہ ہم سے صرف اس بات پر جدا ہو گئے کہ انھیں ہمارے اسٹیج پر مولانا مودودی صاحب کا نام لے کر ان کی مخالفت کی اجازت نہیں دی گئی:

اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بے گانے بھی ناخوش
میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اس کے برعکس مولانا مودودی صاحب ان کے رفقا اور ان کے اخبارات

ورسائل نے ہمارے اس تعاون کا کتنا اعتراف اور اسلامی مفاد و مصالح کا کتنا لحاظ کیا؟ اس کا اندازہ اس کتاب میں پیش کردہ حقائق کے مطالعے سے لگایا جاسکتا ہے۔

علما کے وقار سے۔ جماعت اسلامی کی تعصب پسندی کی داستان بڑی طویل اور افسوسناک ہے۔

اس باب میں اس نے بے دین عناصر کو بھی بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ جماعت اسلامی کے ادب و شاعری میں علما کی عزت اور ان کا ناموس طنز اور مزاح کا ایک خاص موضوع رہا ہے۔

انھوں نے "اسلامی ادب" کے نام پر جو کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کا تجزیہ اور اس پر تبصرہ ایک الگ موضوع ہے اور کسی دردمند نقاد کی توجہ کا منتظر۔

جماعت اسلامی نے علما کو کبھی قابل احترام سمجھا ہی نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے لے کر مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا ابو الکلام آزاد، حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی، اکابر دیو بند اور اس وقت کے علما تک ہر کوئی ان کی قلم کاریوں کا نخچیر اور ہر دامن ان کی دست درازیوں کا شاکی ہے۔

حتیٰ کہ انتخابات سے دو تین روز پہلے مولانا عبدالحلیم صدیقی مرحوم کی صاحبزادی کے سلسلے میں اور مرحوم کے صاحبزادے اور جمعیت علمائے پاکستان کے رہنما مولانا احمد شاہ نورانی کے بارے میں جسارت میں جو کیچڑ اچھالی گئی وہ اس درجہ شرمناک تھی کہ اس کے تصور سے گھن آتی ہے اور اپنی نجی مجلسوں میں ان ہر دو کے اخلاق و سیرت کے بارے میں جو جو افسانے تخلیق کیے گئے اور جس طرح مزے لے لے کر بیان کیے گئے اور انھیں پھیلایا گیا اس سے جماعت اسلامی کی خاص ذہنی و فکری تربیت کا پتا چلتا ہے۔

لیکن اب اس سے اس کی شکایت بھی نہیں کرنی چاہیے، جس نے صحابہ۔ کرامؓ کے بارے میں جو کفر کی ظلمت میں ہدایت کے روشن ستارے ہیں، تنقید سے بالاتر نہ ہونے کا صرف عقیدہ ہی نہیں رکھا، بلکہ عملاً ہدف تنقید بھی بنا ڈالا ہو اور ان کے

ناموس کا لحاظ نہ کیا ہو۔ اس سے علمائے عہد یا کسی محترم خاتون کی عزت واحترام کی توقع چہ معنی دارد؟ یہاں تک کہ وہ علما جو جماعت اسلامی کے ساتھ تعاون واشتراک سے کبھی دست کش نہیں ہوئے وہ بھی ان کی تغافل کیشیوں کے شاکی ہیں۔ جماعت اسلامی نے علما کی پگڑیاں اچھالنے میں، ان کی کمزوریوں کو طشت از بام کرنے میں، انھیں رسوا کرنے میں اور انھیں آپس میں لڑانے میں افسوسناک کردار ادا کیا ہے۔

لیکن اب تاریخ اس موڑ پر آگئی ہے کہ اگر اس تاریخ کو محفوظ نہ کر دیا گیا تو ایک تاریخی نقصان بھی ہوگا اور اگر پہلے اختلاف کرنا اسلامی مفاد کے خلاف تھا، تو اب اس اختلاف اور جماعت اسلامی کے کردار سے پردہ نہ اٹھانا بھی دینی وسیاسی مصالح کے خلاف ہے۔

میرا مقصد شکایات کے یہ دفتر کھولنا نہیں ہے، بلکہ جماعت اسلامی کا وہ کردار بیان کرنا ہے، جس کا مظاہرہ اس نے پچھلے ڈیڑھ دو سال کی سیاسی زندگی میں سوشلزم اور اسلام کی جنگ کے دوران میں اسلامی نقطہ۔ نظر رکھنے والی جماعتوں کے مابین اتحاد کے مذاکرات میں اور انتخابات میں اسلامی عناصر سے اشتراک وتعاون میں کیا اور یہ اس لیے ضروری ٹھہرا کہ آئندہ سیاسی سفر میں ہم ان غلطیوں کا اعادہ نہ کریں، جو کر چکے ہیں۔

اتحاد کی راہ میں جماعت اسلامی کے کردار کو سامنے لانے کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسئلے کے تمام پہلو روشنی میں اور تمام نقطہ ہائے نظر سامنے ہوں تاکہ صحیح نتائج تک پہنچ سکیں اور اتحاد کی صراط مستقیم سے ادھر ادھر نہ ہونے پائیں۔ یہ مقصد بے لاگ تجزیے اور حقائق کے بے غرضانہ اظہار وانکشاف کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اگر کہیں لہجے میں درشتی اور قلم میں تیزی آگئی ہو تو جائے تعجب نہیں۔ حالانکہ اگر جماعت اسلامی پر محض تنقید کا جذبہ بھی کار فرما ہو تو اس کے لیے بھی وجہ جواز موجود ہے۔ آخر جماعت اسلامی کے اکابر واصاغر نے اور اس کے اخبارات ورسائل نے ہمارے ساتھ کیا برتاؤ کیا ہے؟ ہمارے اسلاف اور وقت کی دینی وسیاسی جماعتوں، تحریکوں اور شخصیتوں کے بارے میں اس کی جو روش رہی ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس

لیے اگر اضطرار واضطراب میں ضبط کا دامن ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ جائے یا جفاو ستم سے گھبرا کر ہمارے منہ سے آہ نکل جائے تو کوئی شکوہ سنج کیوں ہو۔ آخر ہم بھی انسان ہیں اور پہلو میں پتھر کا بے حس ٹکڑا نہیں حساس دل رکھتے ہیں:

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

جماعت اسلامی اپنے انداز اور طریقہ کار کے مطابق اپنا کام کر رہی ہے۔

میرے دوستوں اور مخلصوں کا خیال تھا کہ چونکہ پچھلے ڈیڑھ دو سال میں جو حالات پیش آئے ہیں میں ان سے خود گزرا ہوں اور مختلف جماعتوں کے کردار کا بہت قریب سے مطالعہ کیا ہے۔ اس لیے میں بھی اپنے تجربات اور مشاہدات کو قلم بند کر دوں تاکہ لوگوں کے سامنے واقعات کا صرف وہی رخ نہ آئے جو جماعت اسلامی لوگوں کو دکھانا چاہتی ہے، بلکہ انھیں اس رخ سے بھی واقفیت ہو جائے، جن پر جماعت اسلامی کے مصالح پردہ ڈالنے، غلط فہمیاں پیدا کرنے یا اسے مسخ کر کے پیش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ فیصلہ کرنا کہ اتحاد کے مذاکرات اور انتخابات کی ناکامی میں ہمارا، دوسروں کا اور جماعت اسلامی کا کتنا حصہ ہے؟ ہمارا نہیں، قارئین کا کام ہے۔

باب اول:

جماعت اسلامی۔ افکار کے آئینے میں

ایک سرسری نظر

جماعت اسلامی کے فکر و عمل میں کئی موڑ آئے اور اس کا کاروان سیاست بہت سے نشیب و فراز سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہے۔

* پہلے وہ ایک اصولی جماعت تھی اور صالح فکر ہی نہیں صالح طریقہ کار کی بھی پابند تھی اور اس میں اتنی متشدد تھی کہ " مسلم لیگ سے اشتراک و تعاون " کا سوال اٹھایا تو اس کے غیر صالح معیار کی بنا پر امیر جماعت اسلامی کے نزدیک خواجہ ناظم الدین مرحوم سے تو کیا اس کے پلیٹ فارم پر آسمان سے فرشتے اتر آتے تو ان سے تعاون کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔
* پہلے وہ ایک ایسی جماعت تھی جو جلسوں ، جلوسوں ، نعروں ، ہنگاموں ، استقبالیوں ، خیر مقدموں ، ایڈریسوں اور استقبالیوں کو اسلام کے مزاج کے خلاف سمجھتی تھی۔
* پہلے اس کے نزدیک اقتدار میں آنا کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا۔
* الیکشن میں حصہ لینا اس کے نزدیک گویا کتوں کی دوڑ میں حصہ لینا تھا۔
* مصر میں فوجی انقلاب کے بعد عورتوں کے سیاست میں حصہ لینے کا سوال اٹھا

اور ایک اخبار میں خبر آئی کہ مولانا ابو الکلام آزاد نے مصر کے بعض علما کے اس فتوے سے اختلاف کیا ہے جس میں عورتوں کے سیاست میں حصہ لینے اور پارلیمنٹ کا ممبر بننے کے عدم جواز کی رائے ظاہر کی گئی تھی تو جماعت اسلامی نے اس "بے دینی" کے خلاف اخبار ورسائل میں ایک محاذ قائم کر دیا اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے ترجمان القران میں مولانا آزاد کے بیان واستدلال کے رد میں ایک نہایت مفصل مقالہ لکھا۔

لیکن جب حالات بدل گئے اور محترمہ فاطمہ جناح کی سیاسی سربراہی میں شوق حکومت کی تکمیل ہوتی نظر آئی تو اس کے لیے بھی ایک فلسفہ حکمت عملی تخلیق کر لیا گیا

.جماعت اسلامی کو احساس ہوا کہ اس کے سفر کا رخ اور انداز اسے منزل سے اور دور رکھ رہا ہے اور یوسفِ مقصود اس کے ہاتھ سے نکلا جارہا ہے۔

خدایا ! جذبہ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

تو جہاں بہ تقاضائے وقت وبر بنائے مصلحت "اسلامی حکمت عملی" کے تحت صاحبِ امر وامارت فرائض منصوصہ۔ قرآنیہ وواجباتِ شرعیہ۔ اسلامیہ میں تبدیلی کر سکتا ہو وہاں ان امور سیاسی کی حیثیت ہی کیا رہ جاتی ہے ۔چنانچہ

* جماعت اسلامی کے فکر اور طریقہ۔ کار میں بھی تبدیلی آگئی اور ضروری ہو گیا کہ سیاسی مسائل کے حل وتصفیہ کے لیے وقتی وسیاسی مصالح پر مبنی طریقہ۔ کار اختیار کیا جائے۔
* قیام خلافتِ الہیہ کے اسلامی نصب العین سے اسلامی جمہوریت اور پھر صرف "جمہوریت" کے نصب العین اور حصول مقصد کے لیے ان جماعتوں تک سے اشتراک وتعاون پر آمادہ ہو گئی جو جماعت اسلامی کی بلند پروازیوں میں نہ پہلے اس کا ساتھ دے سکتی تھیں اور نہ اس "متحدہ محاذ" کی شرائط میں ان کے لیے

جماعت اسلامی کے منشور سے اتفاق اور مقاصد کی تائید کی شرط لازم تھی، نہ وہ جماعتیں "اسلامی فکر" کی حامل تھیں اور نہ صرف صالح طریقہ کار پر ایمان رکھتی تھیں۔

* جلسوں، جلوسوں، نعروں، استقبالیوں، خیر مقدموں، ایڈریسوں وغیرہ کی اہمیت کا اعتراف بھی نہ صرف زبانی اور فکری طور پر کیا بلکہ ان کے اہتمام میں تاریخ سیاست کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔

* پھر اس کے لیے اقتدار میں آنا اتنا ضروری ہو گیا کہ اس کے بغیر جماعت کے اسلامی مشن کی تکمیل ممکن ہی نظر نہ آتی تھی اور اس کے لیے استدلال میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ خلافتِ الٰہیہ کے قیام کا مقصد اقتدار و حکومت کے بغیر نامکمل محسوس ہونے لگا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی مکی زندگی اسلام کی دعوت و تبلیغ کا ایک نقش ناتمام اور ہجرت مدینہ اقدام تکمیل دعوت کی بجائے اس پر خط تنسیخ نظر آنے لگا۔

* سیاست میں عورتوں کے حصہ لینے کے جواز کے حق میں اخباری نمائندے کی رپورٹ کو جس کی مولانا آزاد سے نسبت کی تصدیق بھی نہیں ہوئی تھی اسے "امام الہند کے فتوئ شرعیہ" کی حیثیت سے پیش کیا گیا اور پاکستان کے صدارتی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کی تائید میں اپنے رویے کی اسلامی حیثیت پر اس بیان سے استدلال کیا گیا اور مصلحت وقت نے انھیں "عالم دین اور" مفتی شرع متین" کی حیثیت سے پیش کرا دیا۔

پہلے ان کا فتوئ بھی قابل رد تھا پھر مفاد و مصالح کا تقاضا ہوا تو ان سے متعلق ایک اخباری رپورٹ بھی حجت شرعیہ بن گئی۔

ایک وقت تھا کہ مولانا آزاد بے دینی کی علامت تھے پھر وہ وقت بھی آیا کہ داڑھی کے مسئلے میں اور اسلامی قوانین کے نفاذ کے سلسلے میں ان کے افکار سے مولانا مودودی صاحب کے خیالات کی تائید کی گئی۔

مولانا آزاد کے خیالات کا رد اور ان کی شخصیت کی نفی جماعت اسلامی کے اکابر اور ان کے اخبار و رسائل کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔ لیکن جب اکابر دیو بند اور دیگر علماے اسلام نے مولانا مودودی صاحب کا رد اور تعاقب کیا اور انھیں کوئی جاے پناہ نہ ملی تو مولانا آزاد ہی کے دامن افکار میں پناہ ڈھونڈی۔ حتیٰ کہ مولانا مرحوم کی طرف سے مودودی صاحب کی مدح و توصیف میں ایک جعلی خط بھی وضع کر لیا گیا:

تمھاری زلف میں آئی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامہ٫ سیاہ میں ہے

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی کے فکر و کردار کا کون سا رخ صحیح اور اسلامی تعلیمات کے مطابق ہے؟، تو یہ ایک الگ بحث ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علم و بصیرت، اعتدال و توازن اور اخلاص و بے غرضی سے اس کے فکر و کردار کے دونوں رخ خالی ہیں۔

* اللہ اللہ ایک وہ زمانہ بھی تھا کہ فرنگی سرکار کی "حسن خدمات" اور برٹش حکومت کے قیام و استحکام میں تعاون اور اہل وطن کے خلاف مخبری کے عوض، مجاہدین آزادی کو پھانسی کے تختوں پر لٹکوانے کے صلے میں اور انعام میں جو زمینیں انگریزوں نے دی تھیں ان کے لیے "اسلامی زمینداریاں" کی اصطلاح جماعت اسلامی کی علمی و فقہی ٹکسال سے ڈھل کر نکلی تھی اور ان زمینداریوں کے تحفظ و بقا کے لیے اس کا مکتبہ فکر جدید علم کلام کی تدوین میں کوشاں تھا اور کہاں یہ وقت بھی آیا کہ بلا کسی استثنا کے ایک خاص حد سے زائد زمین کو حکومت کے قبضے میں لے لینے اور کاشتکاروں کو اس کے مالکانہ حقوق کے عطا کا مژدہ۔ جانفزا سنایا گیا۔
* اور جن سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کو ان کے سرمایوں اور صنعتوں کے "اسلامی نظریہ۔ تحفظ" کی بشارتیں سنائی جا رہی تھیں اب انھیں بھی قومی

ملکیت میں لیے جانے کے عوامی مطالبے کو جماعت کے "اسلامی منشور" میں شامل کر لیا گیا۔

یہ اور اس قسم کی پچاسوں باتیں ہیں جن سے اسلامی علوم وفنون کی تاریخ میں کسی نئے فن کا اضافہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، اس کا فیصلہ تو اہل علم وفن ہی کریں گے، لیکن شیخ محمد اکرام صاحب کو برصغیر کے مسلمانوں کی علمی وتہذیبی تاریخ (موج کوثر) کے نئے ایڈیشن میں تو معتزلہ یا معتزلین جدید کے عنوان سے ایک نئے باب کا اضافہ ضرور کرنا چاہیے۔ جس میں افکار وسیرت جماعت اسلامی کے نشیب وفراز کی پوری تاریخ مرتب ہو جائے۔ اور اگر کوئی چاہے تو تعبیرات وتاویلات جماعت اسلامی سے ایک نئی "کتاب الحیل" بھی مرتب کی جا سکتی ہے۔

اس کا اور کوئی نتیجہ نکلا ہو یا نہ نکلا ہو اور نکلے یا نہ نکلے لیکن اس بات میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ جماعت اسلامی کے کردار نے اس کا اعتبار کھو دیا۔ اب کوئی جماعت اس سے معاہدہ کرتے ہوئے اس کی یقین دہانیوں پر اعتماد نہیں کر سکتی۔

چنانچہ یکم جنوری سنہ ۱۹۷۰ء کو سیاسی جدوجہد کا باب مقصود کھلتے ہی نشتر پارک کراچی کے پہلے مشترکہ جلسہ عام میں میاں طفیل محمد صاحب کی تقریر کے بعد ہی یہ بحث چھڑ گئی تھی:

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف!
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا!

اور حالات نے اس خدشے کو درست ثابت کر دیا۔ جماعت اسلامی نے اتحاد وتعاون کی ہر امید پر پانی پھیرا۔ آخر میں چند ایسی جماعتوں کے اتحاد کا ڈراما کھیلا گیا جن پر خود جماعت کے فلسفہ اجتماع کے مطابق جماعت کا اطلاق نہیں ہوتا تھا لیکن اس وقت وہ ملک کی مقتدر جماعتیں تھیں۔ لیکن جب اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہوا تو خود ان کے اخبار کے مطابق ان کی حیثیت محلہ کمیٹیوں سے زیادہ نہیں تھی اور جن جماعتوں سے اتحاد ملک وملت کی بہی خواہی اور اسلام کے بہترین مفاد کا تقاضا تھا۔ ان سے نہ خود

اتحاد کیا نہ دوسری جماعتوں کو مل بیٹھنے کے قابل رکھا۔

پہلے ایسے حالات پیدا کیے کہ جمعیت علماے پاکستان ان کی بزم ناز سے اٹھی، پھر جمعیت علماے اسلام کے اعتماد کو مجروح کیا، پاکستان جمہوری پارٹی نے دور تک ساتھ دیا لیکن۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں!

نواب زادہ نصر اللہ خان بھی ان کی تیر افگنیوں کا شکار ہوئے اور بالآخر ان سے بھی ٹھن گئی۔غالب مرحوم نے کیا خوب کہا ہے:

بوے گل ، نالہ دل ، دودِ چراغِ محفل
جو تیری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

ایک وقت وہ بھی تھا کہ نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب کی اسلام پسندی اور سوشلسٹوں کے خلاف ان کی جہد آزمائی، اتحاد کی راہ میں ان کے ایثار، بے نفسی اور ان کے جذبات صالحہ وصادقہ کے تذکرے میں مولانا مودودی صاحب رطب اللسان تھے اور صاحب "زندگی" کو ان کے اس قرب و اعتماد پر رشک آتا تھا اور "زندگی" میں با حسرت و یاس اس کی روداد چھاپتے تھے:

جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے ترے
ہم کہاں تک ترے پہلو سے سرکتے جائیں

اور پھر چرخ کہن سال نے یہ منظر بھی بادیدہ حیراں دیکھا کہ "زندگی" کے ایک کارٹون میں مولانا مودودی صاحب انھیں نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب کی تیر افگنیوں سے برنگ بسمل تڑپ رہے ہیں اور نواب زادہ صاحب اپنی کمین گاہ سے رقص بسمل کا یہ تماشا دیکھ رہے ہیں۔اس کارٹون پر مولانا مودودی صاحب کی زبان سے یہ شعر کیا خوب اور بر محل تھا!

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی!

جماعت اسلامی فکر و عمل کے جن نشیب و فراز سے گزری ہے۔ یہ اس کی مختصر روداد تھی۔ اگلے صفحات میں اسلامی نقطہ نظر رکھنے والی جماعتوں کے مابین اتحاد کی کوششوں اور راہ کی ناکامیوں کا تذکرہ ہے۔ اس میں بھی جماعت اسلامی کا کردار زیر بحث آیا ہے۔ اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ جماعت اسلامی کا اب تک وہی رویہ ہے۔

زمانہ بدل گیا لیکن اس نے اپنی خو نہیں چھوڑی

کرسی اقتدار اور منصب سیاست سے ایوب خان کے دستبردار ہوتے ہی تاریخ پاکستان کی بدترین آمریت کے دور کا خاتمہ تو ہو گیا۔ لیکن اس دور میں آزاد خیال اور اشتراکیت کے جو بیج بوئے گئے تھے وہ اب تناور درخت بن چکے تھے اور پھل پھول رہے تھے۔ سوشلزم کا فتنہ تہذیب و اخلاق اور روحانی قدروں ہی کے لیے نہیں، ملکی سالمیت کے لیے بھی ایک عظیم خطرہ بن چکا تھا۔ لادینی ازموں کے تیز و تند حملوں سے نظریہ۔ پاکستان کے نقوش دھندلے پڑ گئے تھے۔ علاحدگی پسندی کے نعرے زور و شور سے لگ رہے تھے۔ ملکی سیاست پر ایسے افراد اور گروہوں کی اجارہ داری قائم ہوتی جارہی تھی، جو مکمل ضابطہ۔ حیات کی حیثیت سے اسلام پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ محمود علی قصوری نے پنڈی میں وکلا سے خطاب کرتے ہوئے برملا اس کا اظہار بھی کیا تھا کہ قرآن صرف ضابطہ۔ اخلاق ہے۔ سیاسی و معاشی ضابطہ نہیں ہے۔ قیام پاکستان کی بنیادوں میں سے اسلام کو خارج کرنے اور تحریک پاکستان کی اساس ہدف معاشی و اقتصادی منصوبوں کو قرار دینے کی سازشیں کی جارہی تھیں۔ علاقائی تہذیبوں اور زبانوں کے مسائل کو اچھالا جارہا تھا۔ مختلف قسم کے تعصبات کو ہوا دی جارہی تھی۔ غرض یہ کہ ملک کے حالات اس درجہ پیچیدہ اور خطرناک صورت اختیار کر چکے تھے کہ ان سے نمٹنا اور مخالف قوتوں سے نبرد آزما ہونا تنہا کسی ایک جماعت کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ سوشلزم اور علاحدگی پسندی کی مخالف، نظریہ۔ پاکستان پر ایمان اور اسلامی نقطہ۔ نظر رکھنے والی تمام سیاسی جماعتیں اور تمام مکاتب فکر کی دینی

جماعتیں متحد ہوں اور عوام میں ایک منظم اور زبردست تحریک شروع کی جائے۔

اخباری پروپیگنڈے نے بڑھا چڑھا کر جماعت اسلامی کی جو حیثیت لوگوں کے ذہنوں میں قائم کر دی تھی اس کی بنا پر جماعت اسلامی کی طرف لوگوں کا ذہن جا سکتا تھا کہ وہ ان حالات میں رہنمائی کے لیے آگے بڑھے اور اسلام و نظریہ ۔ پاکستان کو "مختلف ازموں" کی زد سے بچائے ۔ مگر جیسا کہ سطور بالا میں کہا گیا ہے ، جماعت کا قلعہ صرف پروپیگنڈہ کی ہوا پر قائم تھا ۔ کسی شہر، کسی صوبے اور کسی طبقے میں بھی جماعت کو مقبولیت اور رسوخ حاصل نہیں تھا ۔ اور جو تھوڑے بہت اثرات تھے بھی تو مولانا غلام غوث صاحب ہزاروی اور مفتی محمود صاحب نے نہ صرف یہ کہ ان کا قلع قمع کر دیا تھا بلکہ پورے ملک میں منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا تھا ۔ ہزاروی گروپ نے جماعت کی سیاسی قلابازیوں اور فکری و اعتقادی گمراہیوں کو قوم کے سامنے پیش کر کے اس کے خلاف اتنی زبردست تحریک چلائی کہ جماعت میں کسی کے سامنے ٹھیرنے اور مقابلہ کرنے کی سکت باقی نہیں رہی تھی ۔ اس موقع پر جماعت اسلامی کے لیے لادینی عناصر کے خلاف تحریک چلانا تو درکنار اپنی مدافعت بھی مشکل تھی بلکہ جماعت کی تمام صلاحیتیں مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی کے مظالم کی دہائی اور فریاد کے لیے وقف ہو گئی تھیں۔

اگر مشرقی و مغربی پاکستان میں لادینی ازموں کے خلاف مرکزی جمعیت علمائے اسلام کے بروقت اور کامیاب جہاد سے پیدا شدہ اسلامی فضا کا زبردست سہارا جماعت اسلامی کو نہ ملا ہوتا تو جماعت اسلامی پورے ملک میں کسی جگہ ایک جلسہ بھی نہیں کر سکتی تھی ۔ مشرقی و مغربی پاکستان کے متعدد شہروں کے رہنے والے دردمند مسلمان اس پر گواہ ہیں کہ ہم نے اپنی جانوں پر کھیل کر ایسے مقامات پر سوشلزم کے خلاف جلسے کیے جہاں جماعت اسلامی سمیت کسی اسلام پسند جماعت کو جلسہ کرنے کی ہمت نہ تھی ۔ ملتان ، بنوں ، کوہاٹ ، ڈیرہ اسماعیل خان اور مردان وغیرہ مقامات پر ہم یہ سمجھ کر جلسوں میں شریک ہوتے رہے کہ ممکن ہے وہاں سے صحیح سلامت واپسی

ممکن نہ ہو۔

جماعت اسلامی نے مرکزی جمعیت کی ان مجاہدانہ خدمات کی داد اور نتیجے میں پیدا شدہ اسلامی ماحول سے فائدہ اٹھانے کا شکریہ اس طرح ادا کیا کہ مرکزی جمعیت کی تنظیم کو سبوتاژ کرنے اور اپنے مقصد میں استعمال کرنے کے لیے ہر جگہ جماعت اسلامی اور اس کی ذیلی تنظیم اتحاد العلما کے ارکان جمعیت کے عہدے دار بن جاتے تھے اور اندرونی طور پر یہ کوشش کرتے تھے کہ مرکزی جمعیت علمائے اسلام منظم و مستحکم نہ ہونے پائے۔ جب اس صورت حال سے بچنے کی ہماری طرف سے تدابیر اختیار کی گئیں اور ان حضرات کے رویے کے خلاف آواز اٹھائی گئی تو یہ بات بھی طبع نازک پر گراں گزری اور امیر جماعت اسلامی سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے بڑے تند اور تہدید آمیز لہجے میں جمعیت کے جلسوں کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔

نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم
کہ ہو گا باعث افزائش دردِ نہاں وہ بھی !

لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے ارادوں کے علی الرغم جمعیت کو سوشلزم کے مقابلے میں ہر جگہ امید سے زیادہ کامیابی عطا فرمائی۔ سوشلزم کے خلاف مرکزی جمعیت علمائے اسلام کی تبلیغی مہم میں جماعت اسلامی کی جو افسوسناک روش رہی، اس سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ جماعت اسلامی سوشلزم کے خلاف جدوجہد میں اتنی سنجیدہ نہیں تھی، جس درجے سوشلزم سے مسلمانوں کو ڈرا کر ملک کا انتخاب جیتنے کے لیے وہ بے چین و بے قرار تھی۔ علاحدگی پسند اور لادینی ازموں کے خلاف ہماری تبلیغی مہم کے ساتھ ساتھ مرکزی جمعیت علمائے اسلام کی تنظیم کا کام بھی جاری رہا اور الحمدللہ کہ وہ بہت جلد ملک کی ایک فعال جماعت اور مؤثر قوت بن گئی۔

باب دوم:

اتحاد کی کوششیں اور جماعت اسلامی

کا

انتشار پسندانہ رویہ

۲۸ - اکتوبر سنہ ۱۹۶۹ء کو پاکستان کے صدر محمد یحییٰ خان کی نشری تقریر نے انتخابات کی منزل کو بھی متعین کر دیا اور یہ خوش خبری بھی سنائی کہ یکم جنوری ۱۹۷۰ء سے تمام جماعتوں کو سیاسی جدوجہد کے لیے آزادی مل رہی ہے - اس طرح انتخابات اور جمہوریت کی بحالی کے سلسلے میں لوگوں کے ذہنوں میں جو شکوک وشبہات پائے جاتے تھے وہ دور ہونے لگے -

ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ یقین کرتے تھے کہ محب اسلام عناصر کی یک جہتی اور اسلام پسند جماعتوں کے اتحاد کے بغیر لادینی فتنوں اور اشتراکی وعلاحدگی پسند تحریکوں کے مقابلے میں انتخابات میں کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی - اس لیے پورے خلوص کے ساتھ چاہتے تھے کہ

۱.... مسلم لیگ کے تینوں دھڑوں کے اختلافات ختم ہو جائیں اور وہ بصورت ادغام ایک ہو جائیں یا باہمی سمجھوتے سے ایک دوسرے کے قریب ہو جائیں -

۲.... تمام اسلام پسند عناصر اور اسلامی نقطہ نظر رکھنے والی تمام سیاسی ومذہبی

جماعتوں کا متحدہ محاذ بن جائے۔

۳۔۔۔ اگر متحدہ محاذ نہ بن سکے تو ایک دوسرے سے اشتراک وتعاون کے لیے کم از کم ایک ضابطہ۔ اخلاق ہی بن جائے۔اس کے لیے ہم چاہتے تھے کہ ملک میں جو جلسے ہوں، وہ محب اسلام جماعتوں کے اشتراک سے متحدہ طور پر ہوں۔ یہ مشترکہ جلسے عوام میں اتحاد واسلام کی روح پھونکنے اور انھیں لادینی نظریات کے خلاف منظم ہونے میں بڑی مدد دیں گے۔

چنانچہ نشتر پارک کراچی میں یکم جنوری سنہ ۱۹۷۰ء کو جو جلسہ ہوا تھا وہ ہماری تحریک اور ہماری تجویز پر ہوا تھا، جس میں؛

* جماعت اسلامی کی طرف سے میاں طفیل محمد صاحب
* کونسل مسلم لیگ کی طرف سے یحییٰ بختیار صاحب
* پاکستان جمہوری پارٹی کی طرف سے نواب زادہ نصراللہ خان صاحب
* جمعیت علماے پاکستان (اہل سنت) کی طرف سے مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا سید سعادت علی قادری صاحبان
* اہل حدیث حضرات کی طرف سے مولانا عبدالخالق رحمانی صاحب
* مرکزی جمعیت علماے اسلام ونظام اسلام پارٹی کی طرف سے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور یہ احقر (احتشام الحق تھانوی) شامل ہوئے تھے

اس متحدہ جلسے کی غرض وغایت ملک میں اتحاد کی فضا پیدا کرنا تھا۔ لیکن اس پہلے جلسے ہی میں جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد صاحب اور پی ڈی پی کے نواب زادہ نصراللہ خان صاحب نے جو تقریریں کیں وہ دوسری جماعتوں کی مخالفت اور نکتہ چینی پر مبنی تھیں۔ جن سے پہلے ہی مرحلے میں ہمارے مقاصد کو نقصان پہنچنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

اگلے دن جب میری قیام گاہ پر نواب زادہ نصراللہ خان صاحب سے میری ملاقات

ہوئی تو میں نے اپنے اس یقین کا اظہار کر دیا تھا کہ اگر سوشلزم کے خلاف ہمارے جہاد کا آغاز باہمی مخالفت اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے سے ہوا تو اس جنگ کے جیتنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

نہیں کہا جاسکتا کہ جماعت اسلامی اور پی ڈی پی کے مابین دوسروں پر کیچڑ اچھالنے کا سمجھوتا کسی منصوبے کے تحت پہلے سے ہو چکا تھا یا اتفاقی طور پر یہ دونوں جماعتیں ایک ہی راستے پر چل پڑی تھیں۔ میری گذارش کا ان حضرات پر کوئی اثر نہیں ہوا اور جماعت اسلامی اور پی ڈی پی دونوں ہر جگہ کونسل مسلم لیگ کے خلاف کیچڑ اچھالتی رہیں۔

سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ تھا کہ جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد صاحب نے جماعت اسلامی کی تعریف میں بعض تاریخی حقائق کو اس قدر مسخ کر کے پیش کیا کہ اس افسوسناک جسارت کی کسی اسلام پسند جماعت کے لیڈر سے ہرگز توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ میاں طفیل محمد صاحب نے اپنی تقریروں میں برملا یہ اعلان کیا کہ

* پاکستان بنانے میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی اور جماعت اسلامی کی بڑی خدمات ہیں۔
* قرارداد مقاصد بھی جماعت اسلامی نے پاس کرائی ہے۔
* اور دستور ساز اسمبلی کو کالعدم قرار دیے جانے پر مسٹر غلام محمد گورنر جنرل کے خلاف مولانا تمیز الدین خان صاحب کے مقدمے کے تمام اخراجات جماعت اسلامی نے برداشت کیے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ اسے ملک کی آزادی سے یا تحریک پاکستان سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے اس وقت کے انداز فکر کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ قائد اعظم اور مسلم لیگ کے دوسرے رہنماؤں کے خلاف تو مضمون لکھتی تھی لیکن جماعت اسلامی کے پٹنہ اجلاس میں آنجہانی گاندھی جی کو مدعو کیا گیا تھا

اور ان سے راز و نیاز کی باتیں ہو رہی تھیں:

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف
افسوس وہ دل ربا ادائیں !

قیام پاکستان تک بلکہ جب تک ان پر پٹھان کوٹ کی زمین تنگ نہیں ہو گئی اور انھیں بھاگ کر پاکستان میں پناہ نہیں لینی پڑی، پاکستان کے بارے میں اس کا یہی انداز فکر رہا اور پاکستان کے بانیوں اور رہنماؤں کے بارے میں تو اب تک اس کی وہی خو ہے۔

لیکن اب جماعت اسلامی نے طے کر لیا ہے کہ اگر تحریک پاکستان میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا تو وہ خود ایک ایسی تاریخ وضع کر لیں گے جس میں انھیں زبردست خراج عقیدت پیش کیا گیا ہو اور پاکستان کے قیام میں ان کے کارناموں کا تذکرہ جلی الفاظ میں لکھا ہو گا۔

مخلصین نے مشورہ دیا کہ اس مہم کو بند کیجیے اور رویہ تبدیل کیجیے۔ لیکن اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ جماعت کے آرگن ہفت روزہ " زندگی " لاہور نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ

> "جماعت اسلامی کو واضح طور پر اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس نے پاکستان کی فکری نشو و نما کی آبیاری کی، لیکن اس وقت کے ذہنی اور فکری مزاج کے باعث تحریک پاکستان میں عملی حصہ نہ لے سکی۔" (۱)

اس میں بھی نہایت ہوشیاری کے ساتھ جماعت اسلامی کے منفی کردار اور مخالفانہ رویے کو چھپانے اور اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہی نہیں اور اعتراض صرف یہی نہیں تھا کہ اس نے تحریک پاکستان میں عملی حصہ نہیں لیا تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ

* جماعت اسلامی نے نظریہ۔ پاکستان کا مذاق اڑایا تھا۔

* تحریک پاکستان سے الگ ہی نہیں رہے بلکہ اس کی مخالفت کی تھی۔
* قائداعظم محمد علی جناح جو تحریک پاکستان کے روح رواں تھے ان پر پھبتیاں کسی تھیں اور مسلمانوں میں ان کی بے دینی کو خوب اچھالا تھا۔

اس کے باوجود اب تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ جماعت اسلامی نے پاکستان کی فکری نشوونما میں کیا حصہ لیا تھا اور آخر وقت کا وہ ذہنی و فکری مزاج کیا تھا جس کے باعث جماعت اسلامی اس تحریک سے نہ صرف یہ کہ الگ رہی تھی بلکہ اس کی مخالف اور اسے نقصان پہنچانے کے درپے تھی۔ کہیں ایسا تو نہ تھا کہ کانگریس اور گاندھی جی سے کچھ توقعات تھیں اور تحریک پاکستان کی تائید اور قائداعظم کی حمایت سے انھیں نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا۔

"غرض یہ کہ ہفت روزہ "زندگی" کے مشورے کا مطلب یہ تھا کہ اگر جماعت اسلامی نے تحریک پاکستان میں حصہ نہیں لیا تو کوئی گناہ نہیں کیا تھا اور اگر قائداعظم سے اختلاف کیا تو یہ وہ عمل صالح تھا جس کی قدر قائداعظم بھی کرتے تھے۔اسی "زندگی" نے مشورہ دیا کہ

> "جماعت اسلامی کے رہنماؤں کو چاہیے کہ وہ اس اختلاف کو پوری جرأت سے قبول کریں۔ آخر سنجیدہ اختلاف رائے کوئی جرم تو نہیں، قائداعظم خود اختلاف رائے کو قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔" (۲)

پھر آگے چل کر یہ خیال پیش کرتے ہیں کہ اگر تحریک پاکستان کے کارکنوں کا "مقصد پاکستان" بھول جانا اور اپنی ذاتی اغراض و مفاد کے پیچھے پڑ جانا گناہ نہیں تو تحریک پاکستان کے مخالفین کا عمل جرم کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اپنا مشاہدہ پیش کرتے ہیں کہ

> "ایسے افراد بھی ہمارے سامنے ہیں جو قائداعظم کی قیادت میں پاکستان کی منزل تک پہنچے اور بعد میں کھوٹے سکے ثابت ہوئے اور ایسے

ہزاروں افراد بھی موجود ہیں جو تحریک پاکستان میں زیادہ سرگرم نہ تھے۔ مگر آج کل پاکستان کی بقا کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں" (۳)۔

بلاشبہ یہ ایک معقول بات تھی لیکن یہاں سوال یہ نہیں تھا کہ ان کا رویہ اخلاص پر مبنی تھا یا نہیں اور اب ان کی روش پاکستان کے مفاد میں ہے یا نہیں؟ سوال صرف یہ تھا کہ جماعت اسلامی تحریک پاکستان سے نہ صرف الگ رہی تھی بلکہ اس نے شدید مخالفت کی تھی، قائداعظم اور اس کے رہنماؤں کے خلاف کیچڑ اچھالی تھی اور اب وہ پاکستان بنانے کا سہرا اپنے سر باندھنے پر مصر ہے تو یہ بات تاریخی طور پر غلط ہے اور حقائق کے خلاف ہے، یہ صریح جھوٹ ہے، اس سے دوسروں کی دل شکنی ہوتی ہے اور ان میں اشتعال پیدا ہوتا ہے۔ نیز اس قسم کے دعوے اور نعرے ہمارے مقاصد کو نقصان پہنچانے والے ہیں اور اتنے ہی غلط ہیں جتنا کہ سنہ ۱۹۴۷ء سے قبل تحریک پاکستان کی مخالفت میں جماعت اسلامی کی سرگرمی غلط تھی۔

لیکن انھوں نے ان مخلص ناصحوں کی صداؤں اور التجاؤں کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ اکبر الہ آبادی مرحوم نے سرسید احمد خان مرحوم کے بارے میں کہا تھا، سید ابوالاعلیٰ مودودی پر بھی وہ صادق آتا ہے:

وہ بھلا کسی کی بات مانے ہیں
بھائی سید تو کچھ دوانے ہیں

یہ انانیت کا جنون اور خود پرستی کا نشہ تھا جو محض نصیحتوں سے نہیں اتر سکتا تھا اس کے لیے وقت کے کسی بڑے اور سخت تازیانے کی ضرورت تھی اور وہی مفقود تھا۔

غرض یہ کہ اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ

* جماعت اسلامی نے تحریک پاکستان میں کوئی حصہ نہیں لیا۔
* اس کی ساری صلاحیتیں تحریک پاکستان اور اس کے رہنماؤں پر تنقید اور ان کے خلاف کیچڑ اچھالنے میں صرف ہو رہی تھیں۔

* اس حقیقت کو بھی جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ قرار داد مقاصد کی ترتیب میں اور اس کے پاس کرانے میں جن دو شخصیتوں کا سب سے بڑا حصہ تھا وہ
* شہید ملت نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم اور
* شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی تھے۔
* ان کے علاوہ دیگر ان علماے کرام اور اکابر ملت کا تعاون بھی انھیں قدم قدم پر حاصل تھا جو تحریک پاکستان میں بھی شیخ الاسلام کے رفقاے کار تھے۔
* مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے قرار داد مقاصد کی تکمیل میں اسلامی نظام کی جدوجہد میں ایک دن بھی شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کا ساتھ نہیں دیا، نہ انھوں نے لیاقت علی خان مرحوم اور خواجہ ناظم الدین مرحوم کی کوششوں کو سراہا اور یہیں تک بس نہیں کیا بلکہ جماعت اسلامی نے اسے ناکام بنانے کے لیے اپنی پوری کوششیں صرف کر دی تھیں۔

لیاقت علی خان کے خلاف زور و شور کے ساتھ پروپیگنڈہ جاری رہا ان کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائی جاتی رہیں۔ دورہ امریکہ کے موقع پر شراب کی مد میں خطیر رقم خرچ کرنے کا الزام بھی ان پر لگایا گیا۔ "قرار داد مقاصد کے پاس کرانے کے سلسلے میں حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کے تعاون اور ان کی مساعی کے اعتراف کی بجاے ان کے خلاف خطوط کی ایک مہم شروع کی گئی۔ سیکڑوں خطوط روزانہ حضرت شیخ الاسلام کے نام آتے تھے۔ جن کا مضمون یہ ہوتا تھا:

* اسلامی نظام قائم کرنا آپ کے بس کی بات نہیں۔
* آپ راستے سے ہٹ جائیے۔
* جماعت اسلامی ارباب اقتدار سے نمٹ لے گی۔

جماعت اسلامی کے ادیبوں نے علما کے کردار پر فیچر لکھے۔ انھیں اپنے طنز ومزاح کا موضوع بنایا اور "اسلامی ادب" کے ایسے ایسے شہہ پارے تخلیق کیے جن سے

اسلامی اخلاق و تہذیب کو حیا آنے لگی۔ نعیم صدیقی صاحب کے بعض مضامین اور منظومات اس سلسلے میں خاص طور پر مشہور ہوئیں۔

علمائے کرام کے بارے میں کہا گیا کہ یہ ملک وآئین کے مسائل کو کیا جانیں انھیں تو میونسپلٹی کے قوانین کا بھی علم نہیں۔ پرائمری اسکول کی چوتھی جماعت کا طالب علم ان سے زیادہ معلومات رکھتا ہے اور پھر یہ نصیحت کہ

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

جماعت اسلامی کی یہی وہ ادبی روایت تھی جس نے بعد میں علما کے خلاف ایک مستقل تحریک کی صورت اختیار کر لی یہاں تک کہ جب مولانا امین احسن اصلاحی صاحب، مولانا سلطان احمد صاحب، مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب وغیرہ جماعت اسلامی سے الگ ہوئے تو خود ان کے رد میں بھی فکری تبلیغ کے طور پر یہی رسوا کن حربہ خوب خوب استعمال ہوا۔ بہت سے قارئین کے ذہنوں میں "ادب اسلامی" کے وہ شاہکار افسانے ابھی تک ضرور محفوظ ہوں گے جن کے کردار حسنو، شرفو، وغیرہ تھے۔

غرض یہ کہ اس بارے میں کوئی اختلاف موجود نہیں کہ قرار داد مقاصد شیخ الاسلام علامہ عثمانی، نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم وخواجہ ناظم الدین مرحوم کی کوششوں اور دوسرے اکابر علما کے تعاون سے پاس ہوئی تھی اور جماعت اسلامی کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔

لیکن اب نائب امیر جماعت اسلامی کی زبانی اہل علم اور واقفین حال یہ سن کر حیرت زدہ رہ گئے کہ یہ عظیم کارنامہ بھی جماعت اسلامی کی ہمت دشوار پسند کا رہینِ منت تھا۔

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

اسی طرح کہا گیا کہ مولانا تمیز الدین خان صاحب کے مقدمے کے جملہ اخراجات جماعت اسلامی نے پورے کیے تھے۔ یہ دعوی نہ صرف یہ کہ غلط تھا بلکہ ایسے موقع پر جب کہ ملک ایک نازک دور سے گزر رہا تھا اور ملک کی سلامتی وبقا کے لیے اسلامی نقطہ نظر رکھنے والے عناصر میں باہمی تعاون کی ضرورت بھی شدید تھی۔ یہ بحث چھیڑنی مصلحت اندیشی کے خلاف بھی تھی۔ لیکن میاں طفیل محمد صاحب نے یہ سہرا بھی جماعت اسلامی کے سر باندھا اور بھرے جلسے میں۔

"حالانکہ خواجہ ناظم الدین مرحوم جو اس زمانے میں پس پردہ مولانا تمیز الدین خان مرحوم کے ساتھ کام کر رہے تھے انھوں نے مقدمے کے اخراجات کے سلسلہ میں میری معرفت چند تاجروں کو الگ الگ مدعو کیا تھا اور اس سلسلے میں بڑی رقم خواجہ صاحب مرحوم کے ذریعے مہیا کی گئی تھی جو غیر ملکی وکیل اور مقدمے کے دیگر اخراجات اور مقامی وکلا پر صرف ہوتی تھی۔"

اور اگرچہ اس موقع پر نہیں لیکن اس سے پہلے جماعت اسلامی کی ایک خاتون مصنف نے قائد اعظم سے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کے تعلقات وروابط کی تاریخ اور تذکرے میں ایک مضمون رقم فرمایا تھا اور میاں طفیل محمد صاحب نے جو اس قسم کی گل افشانیوں میں سب سے زیادہ مستعد رہے ہیں، انھیں دنوں اپنی ایک تقریر میں یہاں تک دعوا فرما دیا کہ تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں مولانا مودودی صاحب کی خدمات کسی بڑے سے بڑے مسلم لیگی لیڈر سے کم نہیں ہیں

غالب کی گل افشانی گفتار کے تماشے کے لیے ضروری تھا کہ

رکھ دے کوئی پیمانہ وصہبا میرے آگے

میاں صاحب کو اسٹیج پر کھڑا کر دیا جائے۔

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار

میاں صاحب کی اس تقریر نے ملک میں بے چینی پیدا کر دی اور یہ سوالات کیے جانے لگے کہ

* کیا جماعت اسلامی واقعی اتحاد کی خواہش رکھتی ہے۔
* اس قسم کے بے سروپا دعوؤں سے جماعت اسلامی کیا فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔
* اس قسم کے دعاوی کے نتائج میں جو بے چینی اور انتشار پھیلے گا اس کا اصل فائدہ کون اٹھائے گا۔

میاں طفیل محمد صاحب کے اس بیان کا محسوس اور غیر محسوس طریقے پر شدید رد عمل ہوا۔

محسوس طریقے پر اس طرح کہ اخبارات میں اس پر تنقیدوں اور تبصروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ہفت روزہ " زندگی " جو جماعت اسلامی کے افکار کا سب سے بڑا نقیب تھا اور جس نے ہمیشہ جماعت اسلامی کی جا و بے جا تائید و حمایت کی تھی وہ تک چیخ پڑا ۔ اس نے اس قسم کے نعروں کو " مارفیا کے انجکشن " سے تعبیر کیا اور خدا کے نام پر دہائی دی کہ " ان انجکشنوں سے قوم کے جسدِ سیاست کو ماؤف اور بے حس نہ کیجیے ۔ "

" زندگی " نے اپنے اداریے میں میاں طفیل محمد صاحب کے رویے اور ان کی تقریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

> " سیاسی سرگرمیوں کے نشیب و فراز میں ایک بڑی ہی عجیب و غریب بات سامنے آئی ۔ جماعت اسلامی جو اپنی متین، شائستہ اور غیر جذباتی سیاست کی وجہ سے اچھی شہرت رکھتی ہے ۔ اس کے ایک ذمہ دار قائد میاں طفیل محمد صاحب یک بیک ایسی ڈگر پر چل نکلے جو ان کے ماضی اور ان کے سیاسی مزاج سے یکسر مختلف ہے ۔ انھوں نے بعض عناصر کے خلاف ایسا رویہ اختیار کیا اور

بعض واقعات کے بارے میں ایسے بیانات دیے، جن میں بے موقع جارحیت اور بے پناہ سنسنی خیزی تھی، ایک ایسے موقع پر جب سنجیدہ اور مضطرب اذہان صرف پاکستان کی بقا اور استحکام کے بارے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ انھوں نے جماعت اسلامی کی وہ تاریخ، غیر ضروری تشریح کے ساتھ بیان کرنا شروع کر دی جس کا تعلق پاکستان سے پہلے کے ادوار سے ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے میاں صاحب کسی وجہ سے احساس کہتری کا شکار ہو گئے اور ان کے ذہن میں کوئی ایسی کش مکش موجود ہے جو انھیں جارحانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔" (۴)

غیر محسوس طریقے پر اس طرح کہ بعض دردمند اور سنجیدہ حضرات نے خود مولانا مودودی صاحب کو اس قسم کی بیان بازیوں کے مضمرات کی طرف متوجہ کیا۔ کینیا (مشرقی افریقہ) کے ایک دردمند مسلمان تاجر جنھوں نے پاکستان میں اسلامی پریس کے قیام کے لیے ایک بڑی رقم فراہم کی تھی۔اس بات کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا اور اسے جماعت اسلامی کے اکابر کا مصلحت نااندیشانہ رویہ قرار دیا۔ انھوں نے مولانا مودودی صاحب کو ایک نہایت پرسوز اور درد بھرا خط لکھا (۵) جس میں انھوں نے تحریر کیا:

" اسلام پسند جماعتوں کے عملی اتحاد کے بعد جوں ہی سوشلسٹ جماعتوں کی پسپائی کا آغاز ہوا اور یکم جنوری سنہ ۱۹۷۰ء سے سیاسی سرگرمیوں کی آزادی ملی تو اسلام پسند جماعتوں کے بعض ذمہ دار افراد کے رویے سے ایسا محسوس ہونے لگا گویا کہ وہ سوشلسٹوں کی اس ابتدائی پسپائی کی صورت ہی کو کافی قطعی اور مکمل شکست تصور کرتے ہوئے اپنے اسلامی اتحاد کو غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں اور آپس میں کیچڑ اچھالنے لگے ہیں اور اپنے اتحاد کے اس قلعے میں شگاف کاری شروع کر دی ہے جس کو سوشلزم کی یلغار کے خلاف نبرد آزمائی میں کافی طویل عرصے تک کام میں لانا تھا۔ اگر اسلام کی داعی اور سوشلزم کی مخالف جماعتیں ہی ایک دوسرے کے خلاف پالا بندی سے کام لیں گی اور عملی اتحاد سے

روگردانی کریں گی تو یقیناً ان کی موجودہ متحدہ قوت جو میری نظر میں اب بھی کمزور ہے، بے اثر اور ضائع ہو جائے گی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ جنگ کا پانسہ دشمنان اسلام کے حق میں پلٹ جائے گا اور ملک میں اسلامی نظام کی نشاۃ ثانیہ کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔"

یکم جنوری کے جلسے میں میاں طفیل محمد صاحب کی تقریر کے بارے میں انھوں نے اپنے تاثرات بھی بیان کیے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"میں یکم جنوری سنہ ۱۹۷۰ء کو نشتر پارک کے جلسہء عام میں شریک تھا، جس میں کئی اسلام پسند جماعتوں کے رہنماؤں نے تقریریں کیں۔ میاں طفیل محمد صاحب نے بھی تقریر فرمائی۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ دوسری جماعتوں کو ان کی بعض باتیں ناگوار ہوئیں۔ مثلاً ان کی تقریر میں جماعتی پروپیگنڈہ اتنا غالب تھا کہ مشترکہ مقاصد مغلوب ہو گئے۔ انھوں نے قرارداد مقاصد کی منظوری کو سراسر آپ کا (مولانا مودودی صاحب) کا کارنامہ قرار دیا جس سے مرکزی جمعیت علمائے اسلام کے حضرات کو شکایت ہوئی۔ نیز مولوی تمیزالدین خان مرحوم کے مقدمے میں مختلف جماعتوں اور افراد نے جو مالی اور عملی کوششیں کیں ان سب کو پس پشت ڈال کر میاں صاحب نے صرف جماعت اسلامی کی کوشش اور امداد قرار دیا۔"

اس کے بعد میاں طفیل محمد صاحب کی ۹۔ جنوری کی تقریر کے بارے میں بھی یہی دردمند تاجر تحریر فرماتے ہیں:

"اسی طرح ۹۔ جنوری سنہ ۱۹۷۰ء کے جلسہء عام میں بھی میاں طفیل محمد صاحب نے کونسل مسلم لیگ پر شدید نکتہ چینی کی اور اس کے انھیں لیڈروں کو پاکستان کے لیے تباہ کن قرار دیا جن کی قیادت کے تحت محترمہ فاطمہ جناح کا صدارتی الیکشن لڑا اور جن کے ساتھ مل کر بحالی جمہوریت کی تحریک کا محاذ بنایا اور بڑی چالاکی کے ساتھ مشترکہ محاذ کی بدولت سیاست کے میدان میں اپنے قدم جمائے۔"

اسی خط میں جماعت اسلامی کی ایک اہم بے اصولی بلکہ عہد شکنی کی طرف توجہ دلائی گئی، ہے جس کی بدولت مشرقی پاکستان میں صرف جماعت ہی کو نہیں تمام محب اسلام عناصر کو زبردست نقصان پہنچا۔ انھوں نے لکھا:

"میرے علم میں یہ بات بھی لائی گئی ہے کہ تمام اسلام پسند جماعتوں نے بشمول جماعت اسلامی متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ ۲۵۔ جنوری سنہ ۱۹۷۰ء کو ڈھاکہ میں ایک مشترکہ جلسہ عام منعقد کریں گی۔ اس کے ضمن میں یہ بھی طے کر لیا گیا تھا کہ اس مشترکہ جلسہ عام سے قبل کوئی بھی جماعت اپنا الگ جلسہ نہیں کرے گی، لیکن مشرقی پاکستان کے امیر جماعت پروفیسر غلام اعظم صاحب نے اس متفقہ فیصلے کو نظر انداز کرتے ہوئے غالباً ۱۸۔ جنوری سنہ ۱۹۷۰ء کو ڈھاکہ میں اپنے الگ جلسہ عام کا اعلان کر دیا۔ جب بعض افراد نے ان سے اس فیصلے سے رجوع کرنے کی تلقین کی تو انھوں نے صاف فرما دیا کہ مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی اور مجیب الرحمن کا مقابلہ ہے یہاں کوئی اور دوسری جماعت قابل ذکر نہیں ہے۔"

ہمارے محترم دردمند مسلمان تاجر نے جو کچھ لکھا وہ ایک ناقابل انکار حقیقت تھی۔ مشرقی پاکستان کی تمام محب اسلام جماعتوں کے لیڈروں کی مشترکہ مجلس میں طے شدہ قرار داد کے ذریعہ ۲۵۔ جنوری کو مشترکہ جلسہ ہونا قرار پایا تھا۔ لیکن جماعت اسلامی نے اپنی انفرادیت کا مظاہرہ کرنے کے لیے مشترکہ قرار داد کے خلاف ۱۸۔ جنوری کے لیے پلٹن میدان میں ایک جلسہ عام کا اعلان کر دیا جس میں شرکت کے لیے سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب بنفس نفیس ڈھاکہ تشریف لے گئے تھے۔ لیکن علاحدگی پسند اور لادینی قوتوں سے نمٹنا جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ تنہا جماعت اسلامی کے بس کا کام نہ رہا تھا۔ چنانچہ جلسے میں زبردست ہنگامہ ہوا اور جماعت اسلامی کی بدولت تمام اسلام پسند عناصر کی وہ درگت بنی کہ کسی اسلامی ملک میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ تقریباً پانچ سو افراد اس بری طرح زخمی ہوئے کہ انھیں ہسپتال جانا پڑا (۵)۔

امیر جماعت سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب جو اس جلسے کے مہمان خصوصی بلکہ ہیرو تھے وہ جلسہ گاہ کے دروازے پر روک دیے گئے اور انھیں باہر ہی سے ناکام واپس ہونا پڑا اسٹیج اور شامیانے کو آگ لگا دی گئی۔

جماعت اسلامی چونکہ خود کو تنہا اسلام کا نشان ظاہر کرتی ہے اس لیے پلٹن میدان کے جلسے میں ناکامی بلکہ پسپائی سے عام طور پر اسلامی ذہن رکھنے والے مسلمانوں کا دل ٹوٹ گیا اور مغربی پاکستان میں لادینی عناصر نے یہ پروپیگنڈہ کیا کہ مشرقی پاکستان سے اسلام کا نام ونشان مٹ گیا اور اس غلط تاثر کو اس امر نے اور ہوا دی کہ امیر جماعت ناسازگار ماحول کو دیکھتے ہی ڈھاکہ چھوڑ کر مغربی پاکستان آگئے۔ حالانکہ اول تو اسلام کا نام ونشان مٹنے کا یہ غلط تاثر محض جماعت کے مفاد پرستانہ پروپیگنڈے سے پیدا ہوا تھا اور وہ بھی صالحین کے مخصوص حلقوں میں، دوسرے یہ کہ اگر اس میں کچھ بھی صداقت تھی اور واقعی اسلام کی عظمت کا نشان سرنگوں ہو گیا تھا تو نشان بننے کی شیخی بگھارنے والوں کا فرض تھا کہ وہ اپنی جان پر کھیل کر بھی ایک جلسہ ضرور کرتے اور کھوئی ہوئی عظمت کو بحال کرنے کی خاطر ہر ممکن قربانی دیتے، مگر افسوس ہے کہ ایسا ہو نہ سکا۔

جو سختی منزل کو سامان سفر سمجھے
اے وائے تن آسانی ناپید ہے وہ راہی

جماعت اسلامی نے اپنی انانیت اور انفرادی شان کو دکھلانے میں ذلت ورسوائی کی جو سیاہی ہر محب اسلام کے چہرہ پر مل دی تھی اس کو دھونے کے لیے بھی مرکزی جمعیت علمائے اسلام ہی نے حوصلہ مندانہ قدم اٹھایا اور صرف ایک ہفتے کے بعد ۲۴۔جنوری سنہ ۱۹۷۰۔ کورمناریس کورس کے وسیع میدان میں ایک عظیم الشان تاریخی جلسہ کیا۔تقریباً دولاکھ سے زیادہ مسلمان جلسے میں شریک ہوئے۔میں نے اور مولانا ظفر احمد عثمانی نے جلسے سے خطاب کیا۔بچوں اور جوانوں کی طرف سے اسلام

کے لیے مرمٹنے کے جس جذبے اور جوش کا مظاہرہ کیا گیا اس نے پورے ملک میں عموماً اور مشرقی پاکستان میں خصوصاً مسلمانوں کے حوصلوں کو از سرنو بلند کر دیا (۶) اور مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ جماعت اسلامی اسلام کا نہیں خود پسندی وخود پرستی کا نشان ہے۔ ورنہ جماعت اسلامی سے بیزاری اور نفرت کا مظاہرہ کرنے والے بھی نہایت پرجوش اور جانباز مسلمان ثابت ہوئے۔یہاں ہمارے قارئین کو یقین آئے یا نہ آئے، مگر اس حقیقت کے بے شمار شاہد موجود ہیں کہ جماعت اسلامی کے حلقوں نے اس جلسے کو بھی ناکام بنانے کی آخر وقت تک کوشش کی، جس میں انھیں کامیابی نہ ہو سکی۔ جماعت نے ڈھاکہ میں اسلام اور تمام محب اسلام جماعتوں کو ہزیمت وذلت کے دلدل میں پھنسا کر جو کھیل کھیلا وہ نیا اور اتفاقی نہیں تھا بلکہ جماعت کا ہمیشہ سے یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ پہلے اسلام کو "سکرات موت" کی حالت میں مبتلا کرتے ہیں اور پھر اس کے بچاؤ کی دہائی اور حفاظت کی فریاد سے دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے سوا اسلام کا کوئی وارث اور نام لیوا موجود نہیں ہے۔ سادہ لوح مسلمان اسی بے بنیاد اور مصنوعی دہائی کا شکار ہو جاتے ہیں:

تاویل کا پھندا کوئی صیاد لگا دے
پھر شاخ نشیمن سے اترتا ہے بہت جلد

اس ہنگامے کی نہایت غم ناک روداد ہفت روزہ زندگی میں تفصیل کے ساتھ شائع ہو چکی ہے اور اس سلسلے میں جماعت اسلامی کے اکابر کے متضاد بیانات کا کافی چرچا اخبارات کی زینت بن چکا ہے۔ لیکن افریقہ کے وہ تاجر مسلمان چونکہ وقت کی تنگی اور اپنی عدیم الفرصتی کے باعث اس فیصلے کی تصدیق، جماعت اسلامی کا اس سے انحراف اور جلسے کے انعقاد وغیرہ امور کے بارے میں تحقیق نہیں کر سکے تھے اس لیے انھوں نے لکھا ہے کہ:

"میں اس اطلاع کی تحقیق سے معذور رہا البتہ اگر یہ امر واقعہ ہے تو یہ

ایک افسوس ناک واقعہ ہے اور اخلاقی حدود سے تجاوز کے مترادف ہے جس کا بہر حال ہر جماعت کو اور خاص طور پر جماعت اسلامی کو ہر قیمت پر لحاظ رکھنا لازم تھا۔ نہ صرف اس لیے کہ یہ ان کے اپنے قول وفعل کا سوال تھا بلکہ اس لیے کہ جس دین مبین کا جھنڈا اس ملک میں لہرانے کی جد وجہد کی جارہی ہے، اس کی خاطر بھی ایسی تمام چھوٹی بڑی باتوں پر سختی سے عمل کرنا ناگزیر ہے اور جس کو معاشرہ میں نافذ کرنا چاہتے ہیں اس میں عہد وپیمان کا بڑا درجہ ہے۔"

موصوف نے مزید تحریر فرمایا کہ

"میں سمجھتا ہوں کہ میاں طفیل محمد صاحب اور غلام اعظم صاحب کے انھیں غیر محتاط بیانات و پیمان شکنی ہی کا یہ رد عمل ہے کہ کراچی سے کونسل مسلم لیگ نے بھی جماعت اسلامی کے خلاف اپنی مہم کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ صورت ایسی ہے کہ دونوں جماعتوں میں سے خواہ کوئی متاثر ہو یا نہ ہو لیکن سوشلزم کے خلاف جو اسلامی محاذ بنا تھا وہ ضرور متاثر ہو گا جس کا فائدہ دشمن ہی کو پہنچے گا اور نتیجے کے طور پر خدا نہ کرے، خدا نہ کرے ہر اسلام پسند جماعت کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔"

اسی خط میں انھوں نے اپنے ایک احساس کا بھی ذکر کیا ہے جس سے ملت اسلامیہ کے ساتھ ان کی نہایت دردمندی اور اسلام سے ان کی حد درجہ شیفتگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"مجھے بار بار یہ سوال پریشان کر رہا ہے کہ آئندہ انتخابات میں جماعت اسلامی یا کوئی بھی دوسری اسلام پسند جماعت تنہا رہ کر دشمن اسلام تنظیموں کا مقابلہ کر سکے گی۔ اگر نہیں تو پھر یہ جماعتیں اپنے فروعی اختلافات کو زیادہ سے زیادہ دبا کر یا پس پشت ڈال کر اپنے اتحاد کو مزید مستحکم کرنے کے بجائے جو کچھ بھی اتحاد کی صورت قائم ہو چکی ہے اس پر ہتوڑے چلانے اور اپنی توانائیاں ضائع کر کے جس شغل کی طرف بڑھ رہی ہیں آخر اس کا انجام ان جماعتوں کی نظر میں کیا ہے۔ ایسے عناصر سے غفلت یا چشم پوشی برتنا جن کی عقلوں پر جذبات کا

غلبہ ہو۔ سارے کیے دھرے کو ملیامیٹ کر کے رکھ دے گا۔"

ان باہمی مناقشات اور اختلافات و انتشار نے مجھے سخت تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر اس قسم کی نکتہ چینیوں اور الزام تراشیوں کا سلسلہ چل کھڑا ہوا تو اس اتحاد کے بیڑے کا خدا ہی حافظ ہے۔ چنانچہ میں نے ایک طرف سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کو اور جماعت اسلامی اور پی ڈی پی کے رہنماؤں کو اس طرف توجہ دلائی کہ جماعت اسلامی اور پی ڈی پی کی موجودہ روش اسلامی مفاد کے حق میں اور مصلحت اندیشی کے مطابق نہیں ہے اور آپ کی توجہ کی مستحق ہے۔ دوسری طرف ایک اخباری بیان کے ذریعے غلط اور افتراق انگیز پروپیگنڈہ کی روک تھام کی کوشش کی میں نے اس بیان میں کہا تھا:

"سیاسی سرگرمیوں کے لیے آزادی کا جو دور یکم جنوری سنہ ۱۹۷۰ء سے شروع ہوا ہے اس کو ابھی صرف ایک عشرہ گزرا ہے، جس میں لادینی نظریات سے متعلق جماعتوں کی مخصوص جارحانہ روش کے سوا سیاسی جدوجہد کے حالات عام طور پر خوشگوار رہے ہیں۔ مگر سوشلزم، نوکر شاہی، آمریت اور مشرق و مغرب میں علاحدگی کے فتنوں کے مقابلے میں اسلامی نظام جمہوریت اور پاکستان کی سالمیت کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعتوں کے مابین نکتہ چینی، الزام تراشی اور ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے کی مہم جو ابھی ابتدائی منزل میں ہے، انتہائی افسوس ناک ہے اور اگر ابھی سے اس کی روک تھام نہ کی گئی تو سیاسی سرگرمیوں کے لیے دی ہوئی آزادی سے لادینی اور علاحدگی پسند جماعتیں فائدہ اٹھائیں گی اور اسلامی نصب العین والی جماعتوں میں زبردست انتشار پیدا ہو جائے گا۔"

میں نے اپنے اس بیان میں مولانا تمیزالدین خان کے مقدمے کے اخراجات اور قرارداد مقاصد پاس کرانے کے سلسلے میں خلاف واقعہ بیانات کی تردید بھی کی اور کہا:

"مولانا تمیزالدین خان مرحوم کے مقدمے کے سلسلے میں دوسری

جماعتوں اور افراد کی مدد کو نظرانداز کر دینا یا تحریک پاکستان اور قرار داد مقاصد کے سلسلے میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی، پیر مانکی شریف مرحوم، مولانا ابراہیم سیالکوٹی، مولانا ظفر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا داؤد غزنوی علیہم الرحمہ اور دوسرے اکابر علما کو نظرانداز کر دینا، تاریخی حقائق اور واقعات کے خلاف ہے۔ جس طرح شریعت کے مختلف فیہ مسائل کو چھیڑنے سے فرقہ واریت کے ابھرنے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح اسلام پسند جماعتوں کے مابین کیچڑ اچھالنے سے زبردست انتشار پیدا ہونے کا خطرہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب باہمی تصادم کو روکنے کے لیے اسلام پسند جماعتوں کی رہبری کریں گے۔"

میرا یہ بیان جنوری سنہ ۱۹۷۰ء کے اخبارات میں شائع ہوا ہے۔

میاں طفیل محمد صاحب اپنی تقریروں میں جو گہر افشانیاں فرما رہے تھے وہ صرف جلسوں تک ہی محدود نہیں تھیں، جماعت اسلامی کے طریق جنگ کے مطابق اس میں ادیب اور صحافی بھی شامل تھے جو ادب وصحافت کے محاذ پر مصروف جہاد تھے اور جماعت کے اکابر اپنے افکار خاص کے جو بیج لوگوں کے ذہنوں میں بوتے تھے یہ ان کے لیے زمین ہموار کرنے اور ان کی آبیاری میں لگے ہوئے تھے۔

کونسل مسلم لیگ کے خلاف روزنامہ "جسارت" اور ہفت روزہ "زندگی" نے زبردست محاذ قائم کر لیا تھا اور میاں ممتاز دولتانہ کے خلاف "زندگی" میں ایک نہایت تیز وتند مضمون انہی دنوں نکلا تھا۔ جس میں ان کی سیرت وکردار پر حملے کیے گئے تھے۔ صرف یہ ایک مضمون اتنا شدید اور زہریلا تھا کہ اگر دولتانہ صاحب میں غیر معمولی تحمل نہ ہوتا تو ان کے لیے جماعت اسلامی کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھانے کا سوال کبھی پیدا نہ ہوتا (۶)۔

جماعت اسلامی کے کارکن بھی تھے جو گلی کوچوں میں جماعت اسلامی کے نظریات کے پرچار میں مصروف اور مخالفین وناقدین سے جنگ آزما تھے۔ افریقہ کے

مذکورالصدر تاجر اپنے مختصر قیام میں جماعت اسلامی کی صحافت کے اس رخ کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو جو دردمندانہ خط لکھا تھا اور رہنمائی کی اپیل کی تھی اس میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ:

"میں نے اور میرے بعض احباب نے پاکستان میں اسلام کی سربلندی اور تحفظ کی نیت سے اسلام پسند جماعتوں کو اخبارات کی سہولت فراہم کرنے کی غرض سے جو رقم بطور امداد مہیا کی تھی اور جس میں تمام اسلام پسند جماعتوں کا مساوی حصہ ہے۔ ان حالات کے پیش نظر جو میں اوپر لکھ چکا ہوں اس بات کا پورا پورا احتمال ہے کہ یہ رقم غلط استعمال ہو سکتی ہے اور اس سے صرف ایک جماعت کا اثر و نفوذ قائم کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ جس سے رقم جمع کرنے والوں اور رقم دہندوں کے درمیان بدگمانی بھی پیدا ہو سکتی ہے نیز آئندہ کے لیے راستے بھی مسدود ہو سکتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے جس مقصد کے لیے یہ سب کچھ ہوا وہ بھی حاصل نہ ہو گا کیونکہ ان ہنگامی حالات ہی میں جب اسلام پسند جماعتیں ہم آہنگ نہ ہو سکیں گی تو پھر آخر وہ کونسا وقت آئے گا جب ملت کی شیرازہ بندی کا کام ہو گا اور دلوں سے کدورتیں نکلیں گی۔ اسلام پسند جماعتوں میں فکر و عمل کے اتحاد کی ذمہ داری اس جماعت پر زیادہ عائد ہوتی ہے جو اسلام کے مذاق کو زیادہ سمجھتی ہے، علم و فہم کے اعتبار سے اپنا ایک مقام رکھتی ہے اور اسلامی کہلاتی ہے۔"

لیکن جماعت اسلامی نے ان مخلصانہ التجاؤں اور توقعات کی درخواست کو درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ جماعت اسلامی اپنی اسی روش پر قائم رہی، صرف محاذ بدلتی رہی۔ اگر ایک محاذ پر دباؤ بڑھ جاتا تو وہ پسپا ہو جاتی اور دوسرا محاذ کھول لیتی۔ اب اس کے نزدیک مسئلہ اشتراکیت نواز یا سوشلسٹ اور علاحدگی پسند جماعتوں کے ساتھ مقابلے کا نہیں تھا، بلکہ اب وہ اسلام پسندوں ہی کے خلاف نبرد آزما تھی۔

۱۱۔ اپریل کو مجھے ایک جلسے کے سلسلے میں لاہور جانا پڑا۔ سمن آباد میں ایک

عزیز کے یہاں میرا قیام تھا۔ اسی دوران میں بریگیڈیر گلزار احمد صاحب اور رانا اللہ داد صاحب روزنامہ "کوہستان" لاہور کے مالک تشریف لائے۔ بریگیڈیر صاحب سے پہلے سے واقف تھا۔ انھوں نے رانا صاحب کا تعارف کرایا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں ان کے یہاں کھانے پر مولانا مودودی صاحب کے ساتھ شرکت کروں۔ تاکہ کچھ ملکی حالات و مسائل پر تبادلہ خیال بھی ہو جائے۔ وقت کی تنگی کے باوجود میں نے ان کی اس خواہش کی تعمیل کی اور رانا صاحب کے مکان پر مولانا مودودی صاحب سے نہایت تفصیل کے ساتھ باتیں ہوئیں۔ مولانا نے اپنی عادت اور مزاج کے خلاف سوشلزم کے خلاف میری ناچیز کوششوں کا سراہنے کے انداز میں ذکر فرما کر میری ہمت افزائی کی۔

میں نے اس موقعے پر مولانا سے عرض کیا تھا:

"آپ کو معلوم ہے کہ اگست سنہ ۱۹۶۹ء میں جب ہم نے سوشلزم اور لادینی تحریکوں کے خلاف اس جہاد کا آغاز کیا اور دورے شروع کیے تھے، اس وقت پورا ملک سوشلزم اور اسلامی سوشلزم کے نعروں سے گونج رہا تھا اور حالت یہ تھی کہ ہماری بات سننے پر لوگ آمادہ نہ تھے۔ لیکن چند ماہ کی مختصر سی مدت میں جو کامیابی ہمیں حاصل ہوئی ہے، اس کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ کافی حد تک فضا اسلام کے حق میں ہموار ہو چکی ہے اور نظریاتی طور پر ہم یہ جنگ تقریباً جیت چکے ہیں۔ لیکن اگر انتخابات میں تمام اسلام پسند عناصر متحد نہ ہوئے تو اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ ہم یہ جیتی ہوئی بازی ہار جائیں گے۔ اس لیے میری تجویز یہ ہے کہ اس مرتبہ اسلام کے وسیع تر مفاد، نظریہ پاکستان کے تحفظ اور ملک کی سالمیت کے پیش نظر جماعتیں اپنا اپنا الیکشن نہ لڑیں۔ بلکہ تمام اسلام پسند جماعتیں مسلم لیگ کے تینوں گروپ، پی ڈی پی، مرکزی جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان (اہل سنت) مل کر ایک انتخابی بورڈ بنائیں یہ انتخابی بورڈ جن امیدواروں کو ٹکٹ دے وہ امیدوار انتخاب میں حصہ

لیں - کوئی ایک جماعت یا افراد آزاد امیدوار کی حیثیت سے انتخاب نہ لڑیں۔
اس طرح ہماری طاقت یکجا ہو جائے گی اور کامیابی کے امکانات زیادہ روشن ہو جائیں گے۔"

مولانا مودودی صاحب نے اتحاد کی ضرورت اور اس کی اہمیت کو تسلیم کیا اور فرمایا:

"تجویز اچھی ہے مگر اس میں مشکلات بہت ہیں۔"

اس موقع پر انھوں نے سنہ ۱۹۶۵ء میں محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی انتخاب کے موقع پر متحدہ انتخابی بورڈ کی بعض بد عنوانیوں کا ذکر بھی فرمایا کہ اتحاد کے باوجود جماعتیں آزاد امیدوار کھڑا کر دیتی ہیں - میرا خیال اس سلسلے میں دوسرا تھا اور میں نے مولانا مودودی صاحب کے سامنے بھی اس کا اظہار کیا کہ:

"کوئی جماعت یا کوئی شخص اگر اس متحدہ انتخابی بورڈ کے فیصلے کی خلاف ورزی کرے گا اور اس کے فیصلے کے برعکس اگر انتخاب میں حصہ لینا چاہے گا تو پورا بورڈ اس کے خلاف قوم سے اپیل کرے گا اور یہ متحدہ اپیل صدا بہ صحرا ثابت نہیں ہوگی، قوم اس کا ضرور احترام کرے گی۔"

مولانا مودودی صاحب نے اس کی افادیت کو تسلیم کیا اور کہا:

"مجھے یہ تجویز پسند ہے لیکن میں اس وقت آپ سے وعدہ نہیں کر سکتا جب تک جماعت کے لوگوں سے مشورہ نہ کر لوں۔"

مولانا نے اس کے لیے چند دن کی مہلت مانگی۔

میں لاہور سے کراچی چلا آیا اور مولانا مودودی صاحب کے جواب کا منتظر رہا۔ تقریباً دو ہفتے کے بعد ٹیلیفون پر میں نے ان کے جواب کے بارے میں یاد دہانی کرائی مجھے بتایا گیا کہ ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچے ہیں - اس پر غور کیا جا رہا ہے۔

الیکشن کے ہنگامے اور سیاسی مصروفیتیں روز بروز بڑھتی جا رہی تھیں تمام جماعتیں اپنی اپنی جدوجہد میں مصروف تھیں - لیکن اسلامی عناصر کے اتحاد کی ابھی تک

کوئی صورت نہ نکلی تھی۔ جماعت اسلامی کا رویہ انتہائی پراسرار اور مشکوک تھا۔ وہ نہ تو اتحاد کے سلسلے میں سنجیدہ تعاون کرتی تھی نہ صفائی کے ساتھ اپنی پالیسی کا اعلان کرتی تھی۔ لیکن اس دورخی سیاست کو سمجھنے میں زیادہ دن نہیں لگے اور بہت جلد ظاہر ہو گیا کہ جماعت اسلامی کا رخ کیا ہے اور وہ کیا چاہتی ہے۔

اپریل کے آخر میں اشتراکی اور لادینی عناصر کے مظاہرے کے لیے عبدالحمید خان صاحب بھاشانی نے اعلان کیا کہ یکم جون کو پورے ملک میں "لانگ مارچ" کا دن منایا جائے جن کے ذریعے چین میں اشتراکیت کا مکمل قبضہ قائم ہو گیا تھا۔ اسلام پسند عناصر کے لیے یہ ایک بہت بڑا چیلنج تھا اور ضرورت تھی کہ اس کے مقابلے کے لیے اسلام پسند عناصر سر جوڑ کر بیٹھیں اور کوئی متفقہ پروگرام بنائیں۔

لیکن ابھی یہ سوچا ہی جارہا تھا کہ مولانا مودودی صاحب نے ایک مختصر سی پریس کانفرنس بلا کر اعلان کر دیا کہ ۳۱۔ مئی کو پورے ملک میں "یوم شوکت اسلام" منایا جائے اور اس سلسلے میں دوسرے اسلام پسند عناصر کو یک قلم نظرانداز کر دیا اور ان جماعتوں سے بھی مشورہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جو سوشلزم کے خلاف تحریک میں جماعت کے ساتھ نہ صرف شریک تھیں بلکہ جن کی مؤثر کوششوں سے پیدا شدہ اسلامی ماحول سے جماعت نے پورے طور پر فائدہ بھی اٹھایا تھا۔ اگرچہ مولانا مودودی صاحب کے رویے کے خلاف اس وقت کوئی آواز نہیں اٹھی۔ لیکن ان کی آمرانہ روش کو پوری قوم نے محسوس کیا۔ نوابزادہ نصراللہ خان، جنرل سرفراز خان، مسٹر نورالامین، میاں ممتاز دولتانہ، خان عبدالقیوم خان اور جمعیت علمائے پاکستان کے رہنماؤں کے جذبات کو بڑی شدید ٹھیس پہنچی۔ مولانا مودودی صاحب کے اس فیصلے اور اعلان نے دیگر اسلام پسند جماعتوں کو "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" والی کشمکش میں مبتلا کر دیا۔ ان کے لیے نہ عواقب و نتائج پر سوچنے کا موقع تھا، نہ جماعت کی تیرافگنی سے ڈر کر اس سے کھل کر اختلاف کیا جاسکتا تھا۔ جیسا کہ بعد میں اختلاف

کرنے والوں کے ساتھ اس نے یہی کام کیا۔ چنانچہ جن لوگوں نے جماعت اسلامی کے رویے پر انگشت نمائی کی یا "یوم شوکت اسلام" میں شریک نہ ہونے کا عزم کیا ان پر کیچڑ اچھالنے، انھیں سربازار رسوا کرنے اور ان کے خلاف بہتان تراشنے کا ایک سلسلہ شروع کر دیا گیا اور عجیب عجیب افسانے تراشے گئے۔ اور اس بہتان طرازی میں اتنی دور تک چلے گئے کہ خدا کے خوف اور عاقبت کی جواب طلبی کو بھی نظر انداز کر دیا۔ اس کی وجہ دراصل یہ تھی کہ جماعت اسلامی نے بھاشانی کے "لانگ مارچ" کے مقابلے میں منفرد اور تنہا "یوم شوکت اسلام" کا اعلان کر کے ایک تیر سے دو شکار کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیوں کہ شوکت اسلام کا عنوان ہی مسلم قوم کے لیے بے پناہ جاذبیت رکھتا ہے بالخصوص جب کہ بھاشانی کے لانگ مارچ کے جواب میں اور سوشلزم کے خلاف تحریک کے ایام میں ہو۔ جماعت کو یقین تھا کہ اگر تمام محب اسلام سیاسی و مذہبی جماعتوں نے عوامی کشش اور دباؤ کے تحت یوم شوکت اسلام کے اعلان کی پیروی کی تو گویا جماعت اسلامی کی قیادت قبول کی اور امیر جماعت سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی امامت کی پوری ملت کی طرف سے عملاً توثیق ہو جائے گی اور جو مذہبی و سیاسی جماعتیں اور ان کے رہنما اس تجویز سے گریز کریں گے وہ پوری قوم کی نظروں میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اس صورت حال کا فائدہ بھی جماعت اسلامی کو پہنچے گا اور اس کی قیادت اور مودودی صاحب کی یکتائی و بے ہمتائی کا نقش مسلمانوں کے دل پر نقش ہو جائے گا۔

مذہبی و سیاسی تنظیمیں اور رہنما جماعت اسلامی کی شان یکتائی کے اس مظاہرے اور اس گھٹیا سیاسی کھیل سے متنفر بھی تھے اور متفکر و پریشان بھی۔

محب اسلام سیاسی جماعتیں اور ان کے لیڈر ممکن ہے کہ یوم شوکت اسلام سے متعلق بے ضابطہ اعلان کی ناگواری کے علاوہ جماعتی اور تنظیمی رقابت کی وجہ سے بھی متردد ہوں۔ مگر مرکزی جمعیت علمائے اسلام و نظام اسلام پارٹی اور دوسری مذہبی

جماعتوں کی مشکلات کچھ اس نوع کی تھیں کہ نہ انھیں کسی طرح نظر انداز کیا جاسکتا تھا اور نہ ان کا کوئی حل نظر آتا تھا۔ جماعت اسلامی کے امیر سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب نے دین کے اصولی و فروعی مسائل پر گزشتہ تیس سال میں جو کچھ لکھا ہے اور برصغیر ہند و پاکستان کے علما، مشائخ اور مشاہیر امت کا جس بے دردی کے ساتھ استہزا اور تمسخر کیا ہے اس نے جماعت کے خلاف ہر مکتب فکر کے مسلمانوں میں زبردست بے چینی اور بے انتہا بیزاری پیدا کر دی ہے۔ ہر فرقے اور ہر مکتب خیال کے علما کو یقین ہے کہ جماعت اور امیر جماعت کا بنیادی مقصد سلف اور قدیم طرز کے علما کے اثرات کو نقش کہن سمجھ کر مٹا دینا ہے، تاکہ ملت کے ذہن کی دھلی ہوئی لوح پر جماعت کے نقوش جمائے جاسکیں۔ یہی وجہ ہے جماعت اسلامی کے لٹریچر میں علمائے سلف اور مشاہیر اسلام کی ان چودہ صدیوں میں اس کے نزدیک کسی عالم دین کی خدمات قابل اعتنا نہیں ہیں۔

"خلافت و ملوکیت" میں خلفائے راشدین اور صحابہ کرامؓ کی کھلی اہانت کے تازہ شاہکار نے معاملہ اور زیادہ سنگین بنا دیا۔ ہر مکتب خیال کے علما میں جماعت کے ساتھ نفرت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جو عالم یا جو طبقہ جماعت پر برسر ممبر تبرا نہ بھیجے اس کو جماعت کا حامی قرار دے کر مطعون کیا جاتا تھا۔ چنانچہ مرکزی جمعیت علمائے اسلام جو ملک میں اسلامی و غیر اسلامی نظریات اور قوتوں کے درمیان تصادم کے اس موقعے پر دوسروں کی طرح جماعت پر تبرا نہیں بھیجتی تھی۔ اس کے خلاف پورے ملک میں زور شور سے یہ پروپیگنڈہ ہوتا رہا کہ مرکزی جمعیت علمائے اسلام جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیم بن گئی ہے۔ حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان نے ہمارے ساتھ اس وقت تک کھل کر تعاون نہیں کیا جب تک انھیں پورا یقین نہیں ہوگیا کہ جماعت سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ان حالات میں یوم شوکت اسلام کے لیے سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کے

منفرد اور بے ضابطہ اعلان پر لبیک نہ کہنے میں اصل مسئلہ ذاتی یا جماعتی انانیت اور وقار کا نہ تھا بلکہ مرکزی جمعیت کے شیرازے کو بکھیرنے کی ایک سازش اور اکابر علماے امت کے دینی وقار کا تھا، جسے جماعت اسلامی اپنے لیے راستے کی رکاوٹ سمجھ رہی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے اعلان ہوتے ہی جمعیت علماے پاکستان (اہل سنت) کے رہنما مولانا سعادت علی قادری سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے مولانا مودودی صاحب کی جانب سے کسی سے مشورہ کیے بغیر یوم شوکت اسلام کے اعلان پر اپنی برہمی کا اظہار کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ ۳۱۔ مئی سے پہلے ۱۸۔ مئی کو چونکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت پاک کا دن ہے۔ لہذا یوم شوکت اسلام ۱۸۔ مئی کو منایا جائے۔ یہ بات چیت چار پانچ مئی کو ہوئی تھی۔ ہمارے نزدیک بھی یہ ایک معقول تجویز تھی۔ مرکزی جمعیت علماے اسلام اور جمعیت علماے پاکستان کے مابین طے پایا گیا کہ ایک مشترکہ اعلان اس سلسلے میں کیا جائے۔

۹۔ مئی کو پریس میں بھیجنے کے لیے ایک اعلان پر ہمارے دستخط بھی ہوگئے۔ ۱۰۔ مئی کی صبح کو جب میں لائل پور جناب مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف صاحب کے مکان پر طے شدہ پروگرام کے مطابق پہنچا تو جناب صدیق حسن گیلانی امیر جماعت اسلامی لاہور مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے اور فرمایا کہ مجھے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے ۳۱۔ مئی کے یوم شوکت اسلام کے سلسلے میں آپ کے پاس بھیجا ہے۔ لائل پور کی ہماری اس گفتگو میں مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف اور مدیر وفاق لاہور جناب مصطفی صادق بھی شریک تھے۔

میں نے گیلانی صاحب سے پہلے اس امر کا گلہ کیا کہ اوائل اپریل میں رانا اللہ داد صاحب کے مکان پر اسلام پسند عناصر کے متحدہ انتخابی بورڈ کے متعلق جو گفتگو ہوئی تھی اور جس پر غور کرنے کے لیے انھوں نے مہلت مانگی تھی ایک ماہ کی مدت گزر گئی مگر یاد دہانی کے باوجود کوئی جواب نہیں ملا۔ گیلانی صاحب نے انکشاف کیا کہ مولانا مودودی

صاحب نے اپنا جواب جناب ظفر احمد انصاری کی معرفت بھیج دیا تھا معلوم نہیں اب تک وہ آپ کے پاس کیوں نہیں پہنچا۔

گروہ صالحین کے عجیب عجیب تجربوں سے میں حیران تھا کہ قول وقرار اور عہد وپیمان کی پاسداری کا اس سے کہیں زیادہ خیال تو غیر صالحین کی جماعتوں میں موجود ہے۔ حالانکہ لائل پور کی اس گفتگو سے دو تین روز پہلے ظفر انصاری سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ انھوں نے مودودی صاحب کا مجھے کوئی جواب اور پیغام نہیں پہنچایا۔ لائل پور سے واپسی کے دو دن بعد ظفر الاحسن لاری کے مکان پر کھانے پر ظفر انصاری سے ملاقات ہو گئی۔ اس کھانے پر سابق جسٹس زیڈ ایچ لاری اور سابق وزیر سردار بہادر خان بھی تھے۔ سب کی موجودگی میں ظفر انصاری سے میں نے کہا کہ مودودی صاحب نے میرے متعلق آپ کو کوئی پیغام دیا تھا۔ فرمایا" نہیں" مجھے یاد نہیں۔ میں نے وہ گفتگو نقل کی جو لائل پور میں گیلانی صاحب کے ساتھ ہوئی تھی۔ ظفر انصاری صاحب نے فرمایا کہ "شاید کچھ کہا تو تھا مگر یہ یاد نہیں رہا کہ کیا کہا تھا۔ میں ٹیلیفون پر مودودی صاحب سے رابطہ قائم کر کے کل بتاؤں گا۔"

اگلے روز ظفر احمد انصاری صاحب نے ٹیلیفون پر مجھے بتایا کہ لاہور سے رابطہ قائم کرنے پر یہ معلوم ہوا کہ مودودی صاحب نے یہ پیغام دیا تھا کہ میں ابھی اتحاد کے مسئلے پر غور کر رہا ہوں:

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خوں نہ نکلا

لائل پور کی گفتگو میں میرے ایک گلے کا حشر یہ ہوا۔ دوسرا گلہ میں نے یہ کیا کہ یوم شوکت اسلام کے اعلان کے متعلق کم از کم ٹیلیفون پر ہی ہم سے اور دوسری جماعتوں سے مشورہ کر لیا ہوتا، اعلان میں دوسری جماعتوں کو نظر انداز کر دینے سے بڑی برہمی اور مایوسی پیدا ہوئی ہے۔ جماعت اور اس کے ہم نوا جو ہر قسم کے اختلاف کے

موقع پر بطور ایک طے شدہ پالیسی کے یہ کہا کرتے ہیں کہ " یہ وقت اور یہ دور باہمی اختلاف کا نہیں ہے " انھوں نے کبھی اس نصیحت کی ضرورت سید ابو الاعلیٰ مودودی کے لیے نہیں سمجھی کہ اسلام کے حق میں نازک حالات کے پیش نظر ایسے اقدامات سے کیوں گریز نہیں کیا جاتا جو ملت میں اختلاف کا باعث بنیں ۔ کیا " خلافت و ملوکیت " کی تالیف کے بغیر اقامت دین کی مہم سر نہیں کی جا سکتی تھی اور کیا " یوم شوکت اسلام " منانے کے فیصلے کا اعلان باہم مشورے سے نہیں کیا جا سکتا تھا؟

میں نے بتایا کہ:

" مجھے مولانا مودودی صاحب کے فیصلے سے اتفاق نہیں ہے اور میں جمعیت علمائے پاکستان کے رہنماؤں کے مشورے اور اتفاق سے ۳۱ ۔ مئی کی بجائے ۱۸ ۔ مئی مطابق ۱۲ ۔ ربیع الاول کو " یوم شوکت اسلام " منانے کی اپیل کر رہا ہوں ۔ اور اس سلسلے میں ایک بیان پریس کو جا رہا ہے ۔ میں نے ان سے کہا کہ جو مسائل کسی ایک جماعت کے نہ ہوں ، عمومی نوعیت کے ہوں اور دوسری جماعتیں بھی جو مختلف مراحل میں شریک سفر رہی ہوں ، ان مسائل میں دلچسپی رکھتی ہوں انھیں نظر انداز کر کے اس طرح فیصلے کرنا اور تنہا اعلان کر دینا ، ان کے وقار کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے ۔ "

یہی جواب میں نے اس سے پہلے آغا شورش کاشمیری صاحب ایڈیٹر ہفت روزہ چٹان ، لاہور کو دیا تھا کہ مسئلہ میرا یا کسی خاص فرد کا نہیں مختلف جماعتوں اور مکاتب فکر کا ہے ۔ ان کی مستقل خصوصیات ہیں ۔ وہ اپنے اثر و رسوخ کے الگ الگ دائرے رکھتے ہیں ۔ اگر جماعتوں میں دوسروں سے اسی طرح فیصلے منوانے کی رسم چل نکلی ہو یہ نہایت نقصان دہ ہو گا ۔ اس لیے جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں آپ کے حکم کے سامنے سر جھکا سکتا ہوں اور غیر مشروط طور پر مجھے آپ کا مشورہ منظور ہے ، لیکن مسئلہ میری ذات کا نہیں جمعیت علمائے اسلام کا ہے ۔ اس کا وقار سب سے مقدم ہے ، اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

بہر حال گیلانی صاحب کو پریس جانے والے بیان کا علم ہوا تو انھوں نے درخواست کی کہ اس بیان کو ابھی پریس میں جانے سے روک دیا جائے ۔ چنانچہ میں نے اس خیال سے کہ شاید تمام اسلام پسند عناصر کے مشورے سے کسی متفقہ فیصلے تک پہنچا جاسکے ، کراچی فون کرکے اس بیان کو پریس جانے سے رکوادیا۔ فون ہی پر اس کا متن بھی گیلانی صاحب کو لکھوادیا گیا تھا۔ میں نے گیلانی صاحب سے صاف صاف کہہ دیا تھا:

> " مولانا مودودی صاحب کو اسلام پسند جماعتوں کے سربراہوں کی ایک میٹنگ بلانی چاہیے اور اس میں متفقہ فیصلہ کرنا چاہیے اور جو تاریخ مقرر ہو اس پر یوم شوکت اسلام منانا چاہیے ۔"

گیلانی صاحب نے میری تجویز سے اتفاق کیا اور وہ تجویز لے کر لاہور روانہ ہوئے اور میں کراچی آکر مولانا مودودی صاحب کے جواب یا مشورے کے لیے کسی میٹنگ کے اعلان کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن وہاں یہ مقصود ہی کب تھا کہ کوئی جواب دیا جائے ۱۵ ۔ تک کوئی جواب نہیں آیا اور صاف معلوم ہو گیا کہ یہ ڈراما محض اس بیان کو رکوانے اور جمعیت علمائے پاکستان اور جمعیت علمائے اسلام کے فیصلے کو ناکام بنانے کے لیے کھیلا گیا تھا۔ تاکہ وقت گزر جائے اور ۱۸ ۔ مئی کو یوم شوکت اسلام منانے کے لیے انتظام واہتمام کا وقت نہ رہے اور اگر یہ جرأت کر ہی لی جائے تو وقت کی قلت کی وجہ سے اس کے مناسب اعلان وتشہیر کا موقع نہ ملے اور تحریک ناکام ہو جائے۔

۱۶ ۔ مئی کو لاہور میں مرکزی جمعیت علمائے اسلام کی کانفرنس تھی ۔ جس میں پاکستان کے دونوں بازوؤں کے اکابر علما اور جمعیت کے رہنما جمع ہوئے تھے ۔

۱۷ ۔ مئی کو جمعیت کی مجلس خصوصی میں یوم شوکت اسلام کا مسئلہ پیش ہوا اور تمام حالات سے اکابر جمعیت کو مطلع کیا گیا۔ اس مجلس میں

مشرقی پاکستان سے:

۱۔۔۔ مولانا اطہر علی خلیفہ مولانا اشرف علی تھانوی صاحب

۲۔۔۔ حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب ہٹ ہزاروی چاٹگام خلیفہ حضرت تھانویؒ

۳۔۔۔ مولانا صدیق احمد صاحب ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت علماے اسلام

مغربی پاکستان کے:

۱۔۔۔ حضرت مولانا محمد رسول خان صاحب خلیفہ حضرت تھانوی صاحب

۲۔۔۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب خلیفہ حضرت تھانوی صاحب

۳۔۔۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی صدر کل پاکستان مرکزی جمعیت علما اسلام

۴۔۔۔ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ، لاہور

۵۔۔۔ مفتی رشید احمد صاحب سابق شیخ الحدیث دارالعلوم، کراچی اور

۶۔۔۔ اس احقر (احتشام الحق تھانوی) نے شرکت کی تھی۔

مجلس خصوصی نے ایک قرارداد کے ذریعے یہ فیصلہ کیا کہ

۳۱۔ مئی کے یوم شوکت اسلام سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرارداد کے الفاظ یہ ہیں:

"بھاشانی کے یکم جون والے لانگ مارچ کے مقابلے میں مولانا مودودی صاحب نے ۳۱۔ مئی کو یوم شوکت اسلام منانے کا جو اعلان بغیر کسی مشورے سے کر دیا ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس کی موافقت نہ کی جائے، البتہ ممکن ہو سکے تو سکوت بہتر ہے اور اگر ضرورت سمجھی جائے تو اظہار برءت کر دیا جائے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ اگر تاریخ بدل کر سب کے مشورے سے کوئی دوسری تاریخ مقرر کی جائے تو اتفاق کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

یہ قرارداد متفقہ طور پر پاس ہوئی اور اس پر جمعیت کے مندرجہ ذیل اکابر کے دستخط ہیں؛

۱) ... مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی

۲) ... مولانا مفتی محمد شفیع صاحب

۳) ... مولانا اطہر علی صاحب

۴) ... مولانا محمد رسول خان صاحب

۵) ... مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی

۶) ... مولانا عبدالوہاب صاحب

۷) ... مولانا رشید احمد صاحب اور

۸) ... یہ احقر (احتشام الحق تھانوی)

۱۷۔ مئی کی شام کو عصر کے وقت جماعت اسلامی کے سیکریٹری چودھری رحمت الہیٰ میری قیام گاہ پر تشریف لائے۔ انھیں دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ شاید وہ یوم شوکت اسلام کے سلسلے مین مولانا مودودی صاحب کا جواب یا جماعت کے کسی فیصلے کی خبر لائے ہوں گے، لیکن ایسا نہیں تھا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ مشرقی و مغربی پاکستان کے اکابر جمعیت کو ایک استقبالیہ دینا چاہتے ہیں۔ انھیں بتایا گیا کہ تمام علما آج رات کو واپس جا رہے ہیں، اور روانگی کے انتظامات میں معروف ہیں۔ اس لیے حاضری سے معذوری ہے۔ اس طرح استقبالیہ کا پروگرام نہیں بن سکا۔ چودھری رحمت الہیٰ صاحب سے اور کسی مسئلے میں کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔

لیکن اسی روز نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب اور جنرل سرفراز خان صاحب تشریف لائے ان سے یوم شوکت اسلام کے موضوع پر بات چیت ہوئی۔ ان دونوں رہنماؤں نے مولانا مودودی صاحب کے خودرایانہ اقدام اور آمرانہ فیصلے پر اپنے تاسف کا اظہار کیا۔

میں نے ان سے بھی عرض کیا کہ:

• بھاشانی صاحب نے لانگ مارچ کے پروگرام کے التوا کا چونکہ ابھی

حال میں اعلان کر دیا ہے ۔ اس لیے اسی عنوان سے مشورے کی ایک میٹنگ بلائی جائے ۔ جس میں موجودہ صورت حال کے بارے میں غور کیا جائے اور اسی طرح دوسری جماعتوں کے وقار کو جو ٹھیس مولانا مودودی صاحب کے یوم شوکت اسلام کے فیصلہ واعلان سے پہنچی ہے ۔ اس کی تلافی کا بھی یہ مناسب موقع ہے ۔ اس میں تاریخ کی تبدیلی پر بھی غور کیا جاسکتا ہے اور اس پر بھی کہ آیا اب اس کی ضرورت ہے یا نہیں ؟

اگر اس کے بعد بھی فیصلہ یہی ہو کہ ۳۱ ۔ مئی کو یوم شوکت اسلام منایا جائے تو جمعیت اس میں تعاون کرے گی اور کوئی وجہ نہیں کہ جمعیت علمائے پاکستان بھی تعاون نہ کرے ۔"

ان دونوں رہنماؤں نے میری اس رائے کی تائید کی اور یہ کہہ کر گئے کہ ہم ابھی ابھی مولانا مودودی صاحب کے پاس جاتے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ مودودی صاحب اس تجویز کو ضرور قبول کر لیں گے ۔ لیکن جس طرح ۱۱ ۔ مئی کو صدیق الحسن گیلانی صاحب تشریف لے گئے تھے اور پھر ان کی کوئی خبر نہیں ملی تھی ۔ ان دونوں حضرات نے بھی واپس جاکر اپنی خیریت کی اطلاع نہیں بھیجی ۔

۱۸ ۔ تاریخ کو میں لاہور سے کراچی آگیا ۔ ۲۲ ۔ کو مجھے زیمبیا (افریقہ) جانا تھا ۔ اس کے لیے ایک ماہ قبل پروگرام بنا ہوا تھا اور بکنگ ہو چکی تھی ۔ واپسی میں عمرے کا ارادہ تھا ۔ لیکن جانے سے پہلے ڈھاکہ ، پشاور اور بنوں میں چند جلسوں کا پروگرام بن چکا تھا ۔ چنانچہ کراچی پہنچنے کے فوراً بعد ڈھاکہ کے لیے روانہ ہو گیا ۔ جہاں پلٹن میدان میں ایک جلسہ تھا ۔ ۲۰ ، ۲۱ ۔ کو پشاور اور بنوں کے جلسون میں شریک ہوا اور نائٹ کوچ سے کراچی لوٹ آیا ۔ ۲۲ ۔ کا دن گزار کر رات کی فلائٹ سے زیمبیا روانہ ہو گیا ۔

مرکزی جمعیت علمائے اسلام کی لاہور کانفرنس کے بعد جماعت اسلامی کے اخبارات نے جمعیت اور اس کے اکابر کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ کہا گیا کہ جمعیت میں انتشار ہے ، جمعیت کے ارکان کو اپنی

قیادت پر اعتماد نہیں ہے، علما کے مابین شدید اختلافات ہیں ۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اعلان کر دیا کہ جمعیت کے ۲۵ علما نے جمعیت کے اکابر اور ان کے فیصلے کے خلاف بغاوت کر کے "یوم شوکت اسلام" میں شرکت کا فیصلہ کر لیا ہے ۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بات بھی درست نہ تھی ۔

* نہ جمعیت کے علما میں اختلاف تھا،
* نہ جمعیت کسی انتشار کا شکار تھی،
* نہ جمعیت کے کارکنوں کو اس کی قیادت سے اختلاف تھا اور
* نہ اس خبر میں ذرہ برابر صداقت تھی کہ جمعیت کے کسی کارکن نے یا کسی عالم نے جمعیت کے کسی فیصلے سے بغاوت کی ہے ۔

جماعت اسلامی کے اخبارات اور رسائل اور اس کے کارکنوں کی جانب سے مسلسل اور تواتر کے ساتھ یہ غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی تھیں ۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہو گیا کہ ۳۱ ۔ مئی کے یوم شوکت اسلام کے بارے میں جمعیت کی پالیسی کا اعلان کر دیا جائے ۔ چونکہ ۳۱ ۔ مئی کے یوم شوکت اسلام سے بیشتر اسلام پسند جماعتوں کو بھی اختلاف تھا اور وثوق کے ساتھ ان کی رائے معلوم تھی اور ان جماعتوں کے رہنماؤں سے گفتگو ہو چکی تھی ۔ اس لیے ۳۱ ۔ مئی کے یوم شوکت اسلام سے ان کے اختلاف کا اظہار بھی کر دیا ۔

مرکزی جمعیت علماے اسلام کے رہنماؤں کے علاوہ

جمعیت علماے پاکستان کی طرف سے مولانا سعادت علی صاحب قادری

کونسل مسلم لیگ کی طرف سے میاں ممتاز دولتانہ صاحب،

پاکستان جمہوری پارٹی کے صدر جناب نور الامین صاحب اور میں نے اس بیان پر دستخط کیے تھے ۔

اس بیان کا متن یہ ہے:

"بھاشانی صاحب نے چیئرمین ماؤ کی نقالی میں یکم جون کو لانگ مارچ کے ذریعہ سوشلزم کے مظاہرے کا ڈھونگ رچانے کا جو اعلان کیا تھا۔ اس کے مقابلے میں جماعت اسلامی کی طرف سے ۳۱۔ مئی کو یوم شوکت اسلام منانے کا اعلان کیا گیا ہے۔ جہاں تک سوشلزم کی مخالفت اور اسلامی شان و شوکت کے مظاہرے کا تعلق ہے وہ تو تمام اسلام پسند جماعتوں کا مشترکہ نصب العین ہے۔ لیکن اس مشترکہ مقصد کے لیے تمام جماعتوں کے مشورے کے بغیر اقدام کرنا دوسری جماعتوں کے بارے میں عوام میں یہ غلط تاثر دینا ہے کہ تعاون کرنے والی تمام جماعتیں ذیلی اور ثانوی ہیں۔ جن کا اپنا کوئی مقام نہیں ہے اور یہ تاثر اسلام پسند جماعتوں کے لیے موجب انتشار ثابت ہوگا۔ اس لیے ہم اعلان کرتے ہیں کہ ۳۱۔ مئی کے یوم شوکت اسلام سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

یہ بیان میرے زیمبیا کو روانہ ہونے کے بعد ۲۴۔ جون سنہ ۱۹۷۰ء کو اخبارات میں شائع ہوا۔

میں زیمبیا کے تبلیغی دورے اور عمرے سے تقریباً دس روز کے بعد واپس آیا تو معلوم ہوا کہ جماعت اسلامی کے اخبارات نے غلط بیانیوں اور افترا پردازیوں سے میرے اور مرکزی جمعیت علمائے اسلام کے حق میں ملک کی فضا کو انتہائی مسموم بنا رکھا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ مولانا ظفر احمد عثمانی صاحب اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب جن کے دستخط جمعیت کی مجلس خصوصی کی قرارداد پر تھے ان کے بیانات کو توڑ مروڑ کے پیش کیا اور قوم کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یوم شوکت اسلام کے فیصلے میں یہ بزرگ جماعت اسلامی کے ساتھ ہیں۔ حالانکہ مفتی محمد شفیع صاحب نے فیصلے سے پہلے لاہور میں بیٹھ کر اس امر کی پوری کوشش کی کہ مولانا مودودی صاحب سے اس سلسلے میں گفتگو ہو جائے۔ وہ اس کا موقع نہ دیں کہ اختلاف بڑھے اور یوم شوکت اسلام سے لاتعلقی کا اعلان کرنا پڑے۔ لیکن مفتی صاحب کو مودودی صاحب کے ساتھ فون پر بھی رابطہ قائم کرنے نہیں دیا گیا۔ لیکن مولانا

مودودی صاحب کے یوم شوکت اسلام سے متعلق ان کی دعاؤں اور دل چسپوں کی خبریں جلی سرخیوں کے ساتھ شائع کی جا رہی تھی اور اخلاق و دیانت اور صداقت کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا۔

زیمبیا کے دورے اور عمرے سے فارغ ہو کر میں ۳۔ جون کو کراچی پہنچا تو معلوم ہوا کہ فضا انتہائی مکدر ہے اور جمعیت علمائے اسلام اور اس کے رہنماؤں کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں غلط فہمی پیدا کر دی گئی ہے۔ چنانچہ ۴۔ جون کو میں نے ایک پریس کانفرنس میں ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی، جو اس مدت میں پھیلائی گئی تھیں۔ اس موقعے پر جو بیان میں نے پریس کو دیا اس کا مکمل متن یہ ہے

"زیارت و عمرہ اور زیمبیا کے لیے سفر پر روانگی سے ایک روز پہلے ۳۱۔ مئی کے یوم شوکت اسلام سے لاتعلقی کے بارے میں مرکزی جمعیت علمائے اسلام کے صدر مولانا ظفر احمد عثمانی صدر عامل مولانا اطہر علی صاحب (مشرقی پاکستان) ناظم اعلیٰ مولانا صدیق احمد صاحب، مسلم لیگ کے صدر میاں ممتاز دولتانہ، پاکستان جمہوری پارٹی کے صدر نور الامین صاحب، جماعت اہل سنت کے ناظم اعلیٰ مولانا سعادت علی قادری اور میرے نام سے ایک بیان اخبارات کو دیا گیا تھا۔ سفر سے واپسی پر اس بیان کے متعلق مجھے یہ احساس ہوا کہ بعض لوگوں کے ذہنوں میں کچھ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے ان کا ازالہ ضروری سمجھا گیا۔

بعض اخباری بیانات میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یوم شوکت اسلام کے خلاف جماعتوں کے لیڈروں کو ہم خیال بنانے کے لیے میں نے کوئی مہم چلائی تھی اور دستخط لینے کی کوشش کی تھی۔ یہ بالکل بے بنیاد اور حقیقت کے خلاف ہے۔ اس مقصد کے لیے نہ میں نے کسی جگہ کا سفر کیا اور نہ کسی لیڈر سے ملاقات کی۔ اس کے برعکس ۱۱۔ مئی لائل پور میں روزنامہ وفاق کے ایڈیٹر جناب مصطفیٰ صادق صاحب اور جماعت اسلامی لاہور کے امیر صدیق الحسن

گیلانی صاحب مجھ سے ملے تھے اور میں نے بیس روز پہلے اس خیال کا اظہار کر دیا تھا کہ یوم شوکت اسلام منانے کے سلسلے میں تمام اسلام پسند جماعتوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک اجتماع بلایا جائے۔ جس میں تاریخ اور دن کا فیصلہ متفقہ طور پر کیا جائے۔ صرف جماعت اسلامی کے اعلان پر جماعتوں کی شرکت سے باقی دوسری جماعتوں میں انتشار کا اندیشہ ہے اور اس وقت کسی قسم کا انتشار بھی ہمارے لیے انتہائی مضر ہے۔ ان دونوں حضرات نے یہ پیغام مولانا مودودی صاحب کو ضرور پہنچایا ہو گا۔ جس کا جواب مجھے نہیں ملا۔ پھر بھی اعلان کا مقصد یوم شوکت اسلام کی مخالفت نہ تھا بلکہ اسلام پسند جماعتوں کو نظر انداز کرنے پر متنبہ کرنا مقصود تھا۔ یہ روش انتہائی افسوس ناک ہے کہ اسلام کے نام پر عائد ہونے والی ذمہ داریاں سب مل کر انجام دیں اور اس کے سیاسی فوائد صرف ایک جماعت اپنے حق میں حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

شوکت اسلام کا مظاہرہ خواہ کتنا ہی شان دار ہوا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جماعت اسلامی کے سوا باقی تمام اسلام پسند جماعتوں میں ایک قسم کا تنظیمی انتشار ہو گیا ہے جو شوکت اسلام کی روح کے خلاف ہے

ابھی وقت ہے کہ اسلام پسند جماعتوں کے متحدہ محاذ کے بارے میں عملی قدم اٹھایا جائے۔ جس کے بغیر لادینی فتنوں کے مقابلے میں کامیاب ہونا بہت مشکل اور دشوار ہے۔"

اس پریس کانفرنس کی روداد ۶۔جون ۱۹۷۰ء کے اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ جماعت اسلامی کے اخبارات ورسائل نے اپنی مہم جاری رکھی اور مرکزی جمعیت علمائے اسلام اور میرے متعلق جو قسم قسم کی باتیں اور جس طرح پھیلاتے رہے، اس کا اندازہ ان اقتباسات سے لگایا جاسکتا ہے۔ جماعت اسلامی کے ایک رکن اور مشہور اہل قلم جناب نعیم صدیقی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"لاہور والوں کو کراچی کے برادران گرامی سے بڑی ہمدردی ہے کہ

انھیں یوم شوکت اسلام مولانا احتشام الحق تھانوی مدظلہ کی برکات سے محروم رہ کر منانا پڑا ۔ دولتانہ صاحب کم سے کم یہاں موجود تو رہے ۔ احتشام صاحب ملک ہی چھوڑ کر چلے گئے کہ یوم شوکت اسلام کا جلوس نکلنا ہے تو ان کے پیچھے نکلتا رہے وہ اس گنہگارانہ سرگرمی کے دوران موجود رہ کر اپنا تقویٰ کیوں خراب کریں ۔ کیا معلوم شوکت اسلام کے جلوسوں کی وجہ سے کوئی عذاب ہی نازل ہو جائے ۔ ایسے موقعوں پر کنارے ہو جانا ہی بہتر ہے ۔ سو وہ ہوائی جہاز پر بیٹھے اور سمندر پار چلے گئے ۔ طیارے کے ٹیک آف کے وقت انھوں نے کراچی پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا ہوگا کہ لو ہم تو تبلیغ اسلام کے لیے چلے تم مناتے رہو شوکت اسلام ۔"

اس کے بعد لکھتے ہیں:

"ویسے لاہور میں اکثر لوگ ایک سوال پوچھتے ہیں کہ اگر یوم شوکت اسلام کے اعلان پر یہ اعتراض تھا کہ اس کے لیے مشورہ نہیں کیا گیا تو آخر اس کے خلاف مشترکہ بیان جاری کرنے کے لیے تمام سیاسی اور دینی جماعتوں کی کون سی مشاورت منعقد کی گئی تھی ۔ دو چار افراد کا سمجھوتا کر لینا مشاورت نہیں گٹھ جوڑ کہلاتا ہے ۔"

یوم شوکت اسلام آیا اور گزر گیا ۔ سوشلسٹ عناصر پر اس کا جو اثر پڑا وہ اخبارات میں آچکا ہے ۔ ان پر اس مظاہرے اور شوکت اسلام کا رعب تو کیا پڑتا اس کے تذکرے میں انھیں علمائے اسلام پر پھبتیاں کسنے کا اچھا موضوع ہاتھ آیا تھا اور کس کس طرح اسلام کے اس یوم شوکت کا استہزا اور تمسخر اڑایا گیا ۔ وہ انتہائی افسوس ناک اور ناگفتنی ہے ۔

دوسری طرف جماعت اسلامی کے اخبارات اور رسائل نے اس پر تبصرے اور شخصیتوں کے تجزیے اور تذکرے میں علمائے اسلام پر کس کس طرح کیچڑ اچھالی ہے ۔ اس کا اندازہ جناب الطاف حسن قریشی صاحب کے اس مضمون سے لگایا جاسکتا ہے جو

پہلے جسارت میں ۴، ۵، ۶ جون کی تین اشاعتوں میں شائع ہوا تھا، پھر اسے ۱۵- جون کے زندگی میں نقل کیا گیا تھا اور جس کی تردید کے لیے مرکزی جمعیت علمائے اسلام کے ناظم اعلیٰ مولانا صدیق احمد صاحب کو بیان دینا پڑا تھا اور مجھے بھی ایک بیان اخبارات کو دینے کی ضرورت پیش آئی تھی۔

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جماعت اسلامی کا انداز فکر کیا تھا اور اس کا رجحان کیا تھا اور اس کی ان قلم کاریوں سے اتحاد یا انتشار میں سے کس چیز کو تقویت پہنچ رہی تھی۔

جون کے پہلے عشرے میں مغربی پاکستان میں چند جلسوں کا پروگرام تھا۔ اس سلسلے میں مجھے لاہور جانا پڑا۔ نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے میں نے عرض کیا کہ میں آپ کی قیام گاہ پر آپ سے ملتا ہوا جاؤں گا۔

چنانچہ مصطفیٰ صادق صاحب کی معیت میں نواب زادہ صاحب کی قیام گاہ پر ان سے ملاقات ہوئی۔ شوکت اسلام کے سلسلے میں مولانا مودودی صاحب کی جارحانہ پالیسی پر انھوں نے اظہار تاسف کیا۔ اور نواب زادہ صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا کہ انتخابات میں صرف چار ماہ باقی رہ گئے ہیں اور اسلام پسند جماعتوں میں شیرازہ بندی کی کوئی شکل اب تک پیدا نہیں ہو سکی۔

انھوں نے مولانا مودودی صاحب کا شکوہ کرتے ہوئے فرمایا کہ مولانا مودودی صاحب نہ اتحاد کے لیے قدم اٹھاتے ہیں اور نہ کھل کر انکار کرتے ہیں، معلوم نہیں ان کا مقصد کیا ہے۔ اس پر میں نے مسلم لیگیوں کے مابین اتحاد کی کوشش کی سرگزشت بھی سنائی اور مولانا مودودی صاحب کے ساتھ اتحاد کے سلسلے میں اپریل والی گفتگو کا بھی تذکرہ کیا۔ نواب زادہ صاحب نے فرمایا کہ آخر مولانا مودودی صاحب کا کب تک انتظار کیا جائے کیوں نہ ہم، آپ اور دوسری جماعتیں مل کر اتحاد کی ابتدائی اور غیر رسمی

بات چیت کریں ۔ اگر اس بات چیت کے ذریعے ہم کسی نتیجے پر پہنچیں تو مولانا مودودی صاحب سے بھی شرکت کی درخواست کریں گے ۔

بحالت موجودہ میرے نزدیک بھی یہ ایک مناسب تجویز تھی ۔ میرا خیال تھا کہ اگر جماعت اسلامی اتحاد کے معاملے میں واقعی مخلص ہے تو وہ ضرور ہمارے ساتھ شامل ہو جائے گی ۔ چنانچہ نواب زادہ صاحب سے ابتدائی مذاکرات کی تاریخ اور شرکائے مذاکرات کے بارے میں دریافت کیا ۔ نواب زادہ صاحب کا خیال تھا کہ فی الحال جمعیت علمائے پاکستان ، جمعیت اہل حدیث ، مرکزی جمعیت علمائے اسلام اور جمہوری پارٹی کے ارکان سے اس سلسلے میں تبادلہ خیال کیا جائے ۔ گفتگو کی تاریخ کے لیے انھوں نے کہا کہ میں ۱۴ ۔ جون کو کراچی جارہا ہوں ۔ اگر ۱۵، ۱۶ ۔ جون کا کوئی وقت اس کے لیے رکھ لیا جائے تو مناسب ہوگا ۔ چنانچہ گفتگو کے لیے ۱۶ ۔ جون مقرر ہو گئی ۔ میں نے نواب زادہ صاحب سے عرض کیا کہ جب تک ہم اتحاد کے امکانات کا پوری طرح جائزہ نہ لے لیں اور کسی نتیجے پر نہ پہنچ جائیں ۔ اس گفتگو کو پریس میں نہ دینا چاہیے

نواب زادہ صاحب کی رائے بھی یہی تھی ۔ لیکن اگلے روز یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ لاہور کے اخبارات میں یہ خبر نہایت نمایاں طور پر جلی سرخیوں کے ساتھ شائع ہوئی تھی ۔

پروگرام کے مطابق ۱۴ ۔ جون کو نواب زادہ نصر اللہ خان کراچی پہنچے ۔ ۱۵ ۔ جون کی صبح کو نواب زادہ صاحب اور جنرل سرفراز خان صاحب میری قیام گاہ پر تشریف لائے اور دریافت کیا کہ میں نے کن حضرات کو گفتگو کے لیے بلایا ہے ۔ میں نے انھیں بتایا کہ جمعیت علمائے پاکستان کی طرف سے مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا سید سعادت علی قادری اور جمعیت اہل حدیث کی طرف سے جناب فضل حق صاحب اور مولانا احسان الہیٰ ظہیر صاحب کو دعوت دی گئی ہے ۔ پی ڈی پی کی جانب سے آپ دونوں

حضرات موجود ہیں اور مرکزی جمعیت علما اسلام کی طرف سے میں اور مولانا صدیق احمد صاحب حصہ لیں گے۔ گفتگو کے لیے ایک ورکنگ پیپر جو میں نے تیار کیا تھا۔اس کی ایک کاپی نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب کی خدمت میں پیش کی جسے انھوں نے پسند بھی فرمایا۔

جیسا کہ پہلے طے ہو چکا تھا کہ اس مرحلے میں جماعت اسلامی کے کسی نمائندے کو نہیں بلایا جائے گا۔اس لیے نہ انھیں دعوت دی گئی تھی نہ اس ملاقات میں اس قسم کا کوئی تذکرہ نواب زادہ صاحب نے فرمایا۔

اگلے دن ۱۶۔جون نو بجے صبح نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب، جناب فضل حق صاحب اور مولانا احسان الہیٰ ظہیر صاحب مذاکرات کے لیے تشریف لائے تو نواب زادہ صاحب نے فرمایا کہ آج کل مولانا مودودی صاحب کراچی میں مقیم ہیں مناسب ہو گا کہ انھیں بھی ان مذاکرات میں شرکت کے لیے دعوت دے دی جائے۔جمعیت اہل حدیث کے نمائندوں نے بھی اس کی تائید کی۔شاید میرا خیال ہے کہ وہ پہلے ہی اس کے بارے میں مشورہ کر چکے تھے۔مجھے اس بات سے نہ پہلے اختلاف تھا نہ اس وقت مجھے کوئی اعتراض ہوا۔چنانچہ میں نے اسی وقت مولانا مودودی صاحب کو شرکت کا خط لکھا کہ وہ اس اجتماع میں شرکت فرمائیں۔خط کا متن یہ ہے:

محترم المقام مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

اسلام پسند جماعتوں کے متحدہ محاذ کے بارے میں اس سے قبل بھی میں نے آپ سے اپنی خواہش کا اظہار کیا ہے جس کے متعلق کوئی شافی جواب نہیں مل سکا تھا۔آج ہم چند اسلام پسند جماعتیں متحدہ محاذ کی ابتدائی تشکیل کے لیے جمع ہیں۔میری اور اجتماع کی خواہش ہے کہ ایک مرتبہ پھر ہم اپنی خواہش کا اظہار آپ سے کریں تاکہ آپ اس تشکیل میں شرکت فرمائیں۔

والسلام

احتشام الحق تھانوی

یہ خط میرے منجھلے صاحبزادے قاری اعتصام الحق اور محمد اقبال صاحب ایڈوکیٹ لے کر مولانا مودودی صاحب کی قیام گاہ پر گئے۔ سب سے پہلے مولانا مودودی صاحب کے جن معتقد صاحب نے سامنا ہوا اور انھیں معلوم ہوا کہ میرا خط ان کے ممدوح کے نام پہنچا ہے تو ارشاد ہوا کہ

"تھانوی نے خط بھیجا ہے خود یہاں آکر حاضری کیوں نہیں دی۔"

خود چودھری رحمت الٰہی صاحب کا رویہ بھی ان دونوں حضرات سے خلاف تہذیب اور انتہائی مغرورانہ تھا۔ جس کی ان سے توقع نہ تھی۔

یہ دونوں اس کے مستحق نہیں تھے کہ ان سے اس قسم کا رویہ اختیار کیا جاتا کہ وہ یہ احساس کرتے کہ ان کی تحقیر سے ان کے ممدوح کی تحقیر مقصود ہے۔ اس میں ان بیچاروں کی کوئی خطا نہ تھی نہ ان کی تحقیر سے کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا تھا۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے:

قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریے
اس کی خطا نہیں ہے، یہ میرا قصور ہے

یہ حضرات مولانا مودودی صاحب کا جواب لے کر آئے اور انھوں نے ہماری اس درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا تھا۔

اس تمام کارروائی کے انجام پانے میں ظہر کا وقت ہو گیا۔ لہذا کھانے اور نماز کے لیے سب منتشر ہو گئے۔ نماز کے بعد تمام حضرات جمع ہوئے مولانا مودودی صاحب نے چودھری رحمت الٰہی صاحب اور صابر حسین صاحب شرقی کو نمائندہ بنا کر بھیجا تھا۔

اس گفتگو کے لیے جو ورکنگ پیپر میں نے تیار کیا تھا نامناسب نہ ہو گا کہ اسے یہاں نقل کر دیا جائے۔ یہ ورکنگ پیپر "زندگی" میں بھی شائع ہو چکا ہے (۷)۔

اسلامی انتخابی محاذ کا خاکہ

پاکستان میں ہونے والا ۱۹۷۰ء کا الیکشن جو درحقیقت پارٹیوں اور جماعتوں کا الیکشن نہیں ہے بلکہ کفر و اسلام کے ایسے دو متضاد نظاموں کا اور حق و باطل کے ایسے متصادم نظریات کا الیکشن ہے جس پر پاکستان کی بقا اور عدم بقا کا انحصار ہے۔اس لیے الیکشن میں اسلام کی جنگ جیتنے کے لیے اسلام پسند جماعتوں کا انتخابی متحدہ محاذ لازمی و ضروری ہے۔

ا.... اس محاذ کا نام "اسلامی انتخابی محاذ" ہو گا۔

اس محاذ کی تشکیل ہر اس اسلام پسند جماعت کے دو دو نمائندوں پر مشتمل ہو گی جو اس محاذ کے بنیادی مقاصد سے اتفاق کرتے ہوئے اس میں شمولیت اختیار کرے۔

اسلامی انتخابی محاذ میں ہر وہ تنظیم شامل ہو سکتی ہے جو حسب ذیل بنیادی امور سے اتفاق کرے اور ان پر عمل کرنے کا حلف اٹھائے:

الف .... دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور زندگی کے ہر شعبہ کے لیے جامع ہے۔جس میں کسی ازم اور کسی نظام کی پیوند کاری ممکن نہیں۔

ب .... سوشل ازم، کیپٹل ازم، نیشنل ازم اسلام کے خلاف، کافرانہ نظام ہیں۔

ج .... دستور پاکستان کی بنیاد تمام مسلمہ اسلامی فرقوں کے متفقہ بائیس نکات پر مبنی ہو گی اور قرار داد مقاصد پوری اس دستور کا دیباچہ ہو گی۔

د.... قرآن وسنت کے خلاف قانون سازی کی روک تھام کرنے والی وہ دفعہ جس کی ضمانت صدر پاکستان کے دستوری خاکے میں دی گئی ہے۔اس کی صحیح افادیت کے لیے شریعت اسلامیہ کے ماہرین علما کا ایک ایسا بورڈ بنانا ضروری ہے جس میں مسلمہ اسلامی فرقوں کے نمائندے شامل ہوں اور اس کی سفارشات اسمبلی کے لیے واجب التسلیم ہوں۔

ھ.... الیکشن کے بعد بلاتاخیر شراب، عصمت فروشی، قمار اور عریانی کو خلاف قانون قرار دینا اور مؤثر انداز میں ان کے خلاف تحریک چلانا۔

و.... اسلام کے معاشی واقتصادی پروگرام پر بلاتاخیر عمل کرنا۔

ز.... زراعت، تجارت اور صنعت کے نظاموں میں فوری طور پر ایسی اصلاح کرنا جس سے کسان، مزدور اور عام غریب طبقے خوشحال اور مطمئن ہو جائیں۔

ح.... غیر مستطیع اور غریب طبقوں کے لیے فوری طور پر مفت طبی امداد اور مفت پرائمری تعلیم کا انتظام کرنا۔

ط.... سود وسٹہ کے استحصالی وارتکازی نظام کو امکانی عجلت کے ساتھ تبدیل کرنا اور نظام زکوۃ کو جاری کرنا۔

ی.... ایک آزاد اسلامی مملکت کے تقاضوں کے مطابق تعلیمی نظام میں ایسی مؤثر تبدیلی جو حکومت کے اثر ونفوذ سے بالکل آزاد وخود مختار نظام کی حیثیت رکھے اور تمام علوم وفنوں میں اسلام کے مزاج ومنشا کے مطابق قومی تعمیر میں اہم کردار ادا کرسکے جس میں خاص طور پر طلبہ کے لیے تمام مدارج میں

ارزاں تعلیم اور ہر قسم کی سہولت اور اساتذہ کے علمی وقار اور ان کی معاشی خوشحالی کی ضمانت موجود ہو۔

۲.... اس محاذ میں سوشل ازم، کیپٹل ازم، نیشنل ازم اور دوسرے لادینی نظاموں کا پرچار کرنے والی کوئی جماعت یا پیپلز پارٹی" عوامی لیگ" نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ اور نیشنل عوامی پارٹی ولی خان گروپ سے معاہدہ یا اشتراک عمل کرنے والی جماعتیں شامل نہیں ہو سکیں گی۔

۳.... اگر کسی شریک جماعت کے بارے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس کا تعلق کسی لادینی جماعت کے ساتھ ہے، تو اس کو محاذ سے الگ کر دیا جائے گا۔

۴.... محاذ میں شریک جماعتیں اپنا انفرادی وجود اور نظام باقی رکھیں گی۔ مگر الیکشن کے تمام امور کا انتظام و انصرام محاذ کے اختیار میں ہو گا۔ مثلاً مشترکہ جلسے کرنا، مشترکہ جلوس نکالنا، الیکشن کا ٹکٹ دینا، فنڈز فراہم کرنا، حزب اقتدار یا حزب اختلاف کی حیثیت اختیار کرنا۔

۵.... محاذ کا کوئی مستقل صدر اور ناظم نہ ہو گا۔ اجلاس کی صدارت حاضر ارکان میں سے کوئی ایک رکن کیا کرے گا۔

۶.... محاذ کے اراکین میں سے ایک رکن محاذ کا کنوینر ہو گا جو اجلاس وغیرہ سے متعلق تمام امور کا ذمہ دار ہو گا۔

۷.... محاذ کے اجلاس کا کورم شریک جماعتوں کے نمائندوں کی دو تہائی تعداد ہو گا۔

۸.... عام فیصلے حاضر نمائندوں کی کثرت رائے سے ہوں گے۔

۹.... محاذ کسی ایسے امیدوار کو ٹکٹ نہیں دے گا جو قادیانی یا لاہوری

احمدی ہو۔

۱۰۔۔۔ محاذ کسی ایسے امیدوار کو ٹکٹ نہیں دے گا جو کھلم کھلا شراب پیتا ہو یا ریس کھیلتا ہو یا علی الاعلان شعائر اسلام کا مذاق اڑاتا ہو یا کسی اخلاقی جرم میں سزا یافتہ ہو۔

۱۱۔۔۔ محاذ کسی ایسے امیدوار کو ٹکٹ نہیں دے گا جو ماضی میں اسلامی اقدار کی پامالی اور جمہوریت کی بربادی کے جرم میں بدنام ہو۔

۱۲۔۔۔ محاذ کسی ایسے امیدوار کو ٹکٹ نہیں دے گا جس نے ماضی میں ناجائز ذرائع سے دولت کا استحصال کیا ہو۔

۱۳۔۔۔ امیدواروں کو محاذ کا ٹکٹ دینے میں امیدوار کی سیاسی صلاحیتوں کے علاوہ دینداری کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جائے گا۔

۱۴۔۔۔ اسلامی انتخابی محاذ کے خاکے میں تبدیلی کے لیے شریک جماعتوں کے نمائندوں کی تین چوتھائی تعداد کا متفق ہونا ضروری ہو گا۔"

یہ اجلاس بنیادی امور پر تصفیے کے بعد ملتوی ہو گیا۔ آئندہ مذاکرات کے لیے لاہور میں ۲۴، ۲۵۔ جون کی تاریخیں مقرر ہوئی تھیں۔ لاہور میں اجلاس کے اہتمام کی ذمے داری نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب پر تھی۔

مذاکرات کے بارے میں مندرجہ ذیل پریس نوٹ شرکائے اجتماع کی منظوری سے اخبارات کو بھیجا گیا تھا:

"ملک کی اسلام پسند جماعتوں کے درمیان باہمی تعاون اور اتحاد کے سلسلے میں آج مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی کی قیام گاہ پر ایک اجتماع ہوا جس میں پاکستان جمہوری پارٹی کی طرف سے نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب اور جنرل سرفراز صاحب نے، مرکزی جمعیت اہل حدیث کی طرف سے مولانا احسان الٰہی ظہیر صاحب، میاں فضل حق صاحب ناظم مرکزی جمعیت اہل

حدیث اور شیخ محمد اشرف صاحب نے، جماعت اسلامی کی طرف سے چودھری رحمت الٰہی صاحب و صابر حسین شرقی صاحب نے اور مرکزی جمعیت علماے اسلام کی طرف سے قائد جمعیت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی اور مولانا صدیق احمد صاحب ناظم اعلیٰ مرکزی جمعیت علماے اسلام نے شرکت کی۔ ابتدائی اجلاس میں تعاون و اتحاد کے نکات پر خوشگوار ماحول میں گفتگو ہوئی۔ اجلاس ابھی جاری ہے۔"

لیکن جسارت نے صرف اس مشترکہ پریس نوٹ کی اشاعت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے خاص "باخبر ذرائع" کے حوالے سے یہ بھی لکھا تھا کہ:

"آج صبح نو بجے جو اجلاس بلایا گیا تھا اس میں جماعت اسلامی کو مدعو نہیں کیا گیا تھا" باخبر ذرائع" سے معلوم ہوا ہے کہ مرکزی جمعیت اہل حدیث اور پاکستان جمہوری پارٹی کے نمائندوں نے جماعت اسلامی کو بھی مدعو کرنے پر اصرار کیا جس پر ایک دعوت نامہ آج دوپہر امیر جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کو بھیجا گیا۔ امیر جماعت نے چودھری رحمت الٰہی اور جناب صابر حسین شرقی کو ان مذاکرات میں جماعت کی طرف سے نمائندگی کے لیے نامزد کیا۔ مذاکرات میں شرکت کے لیے جمعیت علماے پاکستان کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اور جمعیت کی جانب سے جناب مولانا سعادت علی قادری کی شرکت کی توقع تھی۔ لیکن وہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی سنی کانفرنس سے واپس نہ پہنچنے کی بنا پر اجلاس میں شریک نہ ہو سکے۔ البتہ لاہور کانفرنس میں وہ بھی شریک ہوں گے۔ کونسل لیگ کی جانب سے خواجہ خیر الدین اس اجلاس میں شرکت کرنے والے تھے لیکن ناگزیر وجوہات کی بنا پر انھیں راولپنڈی سے واپس ڈھاکہ جانا پڑا۔ اب وہ کل صبح کراچی پہنچیں گے۔"

اگرچہ اس میں میرا نام ظاہر نہیں کیا تھا کہ جماعت اسلامی کو نظرانداز میں نے کیا تھا۔ لیکن اس صورت میں کہ جمعیت علماے پاکستان اور کونسل مسلم لیگ کے نمائندے شریک نہیں ہوئے تھے۔ صرف تین جماعتوں کے نمائندے شریک تھے۔ ان

میں دو جماعتوں پی ڈی پی اور جمعیت اہل حدیث کے نمائندوں نے جماعت اسلامی کو مدعو کرنے کے لیے اصرار کیا تو وہ تیسری جماعت کا نمائندہ میں رہ جاتا ہوں جس نے جماعت اسلامی کو نظر انداز کیا تھا۔

میری اطلاع کے مطابق جسارت کو اس طرح سے رپورٹنگ کی ہدایت جناب ظفر احمد انصاری صاحب نے دی تھی:

پیتا بغیر اذن ، یہ کب تھی میری مجال !
در پردہ چشم یار کی شہہ پا کے پی گیا

اس سے ہم نے اندازہ لگایا کہ جماعت اسلامی اتحاد کی گفتگو میں مخلص نہیں ہے ۔اور وہ اگرچہ اتحاد کی گفتگو میں حصہ لینے سے انکار نہیں کرتی لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتی کہ یہ بات چیت کامیاب ہو اور اسلام پسند جماعتوں کا کوئی متحدہ محاذ بن سکے ۔ چنانچہ میں نے ایک بیان پریس کو دیا، جس میں کہا تھا:

" اسلام پسند جماعتوں کے اتحاد کے سلسلے میں ابتدائی گفتگو والے اجتماع کی طرف سے ایک مختصر سا پریس نوٹ اخبارات کو جاری کیا گیا تھا ۔ بعض اخبارات نے بالخصوص روزنامہ جسارت کراچی نے جو مزید رپورٹنگ کی ہے وہ مغالطہ آمیزی اور اتحاد میں رخنہ اندازی پر مبنی ہے ۔ جماعت اسلامی کو نظر انداز کرنے اور نواب زادہ نصر اللہ خان کے اصرار پر دعوت دینے کی کہانی اس لیے بے بنیاد ہے کہ لاہور میں نواب زادہ نصر اللہ خان اور علامہ احسان الہیٰ ظہیر صاحب نے مجھ سے زبانی کہا تھا کہ ہم جماعت اسلامی کے اتحاد سے مایوس ہو چکے ہیں ۔ اس لیے جماعت اسلامی کو شامل کیے بغیر اتحاد کی دعوت دی جائے ۔ لہذا جماعت کو نظر انداز کرنے اور نواب زادہ صاحب کے اصرار پر دعوت دینے کی کہانی فرضی اور جھوٹی ہے ۔

روزنامہ جسارت کی رپورٹنگ سے پیدا ہونے والی غلط فہمی کا ازالہ اگر نواب زادہ نصر اللہ خان کی طرف سے نہ کیا گیا تو آئندہ اتحاد کی گفتگو جاری

رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ نیز دسمبر تک الیکشن کے التوا سے متعلق جو بیان میرے نام سے چھپا ہے، وہ بھی شخصی بیان نہیں ہے، بلکہ پورے اجتماع کی قرارداد ہے۔"

یہ بیان ۱۹۔جون سنہ ۱۹۷۰ء کے اخبارات میں آیا تھا۔

جماعت اسلامی اور ظفر احمد انصاری صاحب کے اشارے پر جسارت نے ان مذاکرات کو جس طرح سبوتاژ کرنے کی کوشش کی وہ ظاہر ہے۔ لیکن نواب زادہ نصر اللہ خان نے اس صورت حال کو مزید بگڑنے سے بچا لیا۔ اور انھوں نے اپنے بیان کے ذریعے یہ بات پوری طرح واضح کر دی کہ جماعت اسلامی کو دعوت کسی نے کسی کے دباؤ اور اصرار سے مجبور ہو کر نہیں دی تھی بلکہ متفقہ طور پر دی گئی تھی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"درحقیقت جماعت اسلامی کو شمولیت کی دعوت مشترکہ فیصلے کے تحت دی گئی تھی اور کسی ایک یا دو جماعتوں کے اصرار پر ایسا نہیں ہوا۔"

اس کے بعد یہ مسئلہ ختم ہو جانا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ جسارت نے اپنی غلط رپورٹنگ کی تردید خود نواب زادہ نصر اللہ خان کا بیان شائع کر کے کر دی تھی۔ لیکن جماعت کے کارکنوں کے مراسلات و بیانات وغیرہ میں میرے خلاف کیچڑ اچھالی جاتی رہی اور سوال کیے جاتے رہے۔ "یوم شوکت اسلام" گزر چکا تھا لیکن مرکزی جمعیت علمائے اسلام اور میرے خلاف جماعت اسلامی کے "جسارت" اور "زندگی" کی تحریک اپنی پوری فتنہ سامانیوں اور شرانگیزیوں کے ساتھ جاری تھی۔

پہلے "جسارت" نے اپنی ۴، ۵ اور ۶۔جون کی اشاعتوں میں "یوم شوکت اسلام کے پس منظر میں چند شخصیتیں اور چند حقیقتیں" کے عنوان سے ایک شرانگیز مضمون چھاپا۔ اس کے بعد ۱۵۔جون کے "زندگی" میں اسی مضمون کو نقل کیا۔ پھر ۲۲۔جون کے پرچے میں "شوکت اسلام ...... یوم سے تحریک تک" کے عنوان سے ایک

مضمون شائع کیا۔ شرانگیزی کا سلسلہ اپنی تمام حشر سامانیوں اور پورے زور و شور کے ساتھ انتخابات تک جاری رہا۔ صرف "زندگی" کو اگر موضوع بنایا جائے تو شاید ہی اس کا کوئی شمارہ ایسا ہوگا جس میں میرے خلاف زہر نہ اگلا گیا ہو۔ ۱۵۔ جون کا زندگی کا شمارہ ایک نہایت شرانگیز مضمون کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ٹھیک اس وقت شائع ہوا۔ جب کہ ابھی کراچی میں اتحاد کے مذاکرات اخبارات کا موضوع بنے ہوئے تھے۔ یہ وہی مضمون تھا جو جسارت کی ۴، ۵، ۶۔ جون کی اشاعتوں میں الطاف حسن قریشی صاحب نے لکھا تھا۔ اب اسے زندگی میں نقل کیا گیا تھا اور جس موقعے پر نقل کیا گیا تھا اس نے ان کی دیانت اور اتحاد کے بارے میں ان کے اخلاص کا فیصلہ کر دیا تھا۔

مرکزی جمعیت علمائے اسلام کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے مولانا صدیق احمد صاحب کا یہ ناگزیر فرض تھا کہ وہ حقیقت کے بارے میں پیدا کی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ انھوں نے ایک بیان اخبارات کو دیا جس میں "زندگی" کے مضمون کا جواب دیا گیا تھا۔

مولانا صدیق احمد صاحب کے بیان کا مکمل متن یہ ہے:

> "مغربی پاکستان کے ایک ہفت روزہ اخبار "زندگی" کی ۱۵۔ جون کی اشاعت میں صورت حال کے کالم میں "یوم شوکت اسلام" کے سلسلے میں اس کے ایڈیٹر مسٹر الطاف حسن قریشی کے قلم سے حالات و شخصیات پر جو تبصرہ اور تجزیہ شائع ہوا ہے وہ غلط بیانیوں اور اتہام تراشیوں کا شاہکار ہے جس میں دوسرے زعما کے ساتھ مرکزی جمعیت علمائے اسلام کے قائد حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی پر بھی غلط اور جھوٹے الزامات لگائے گئے ہیں اور عوام میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ مولانا تھانوی نے محض شخصی وقار اور سیاسی جوڑ توڑ کی وجہ سے شوکت اسلام میں شرکت سے انکار کر دیا اور خود مولانا کی اپنی جماعت نے مولانا سے باغی ہو کر شوکت اسلام کے پروگراموں میں شرکت کی۔

مرکزی جمعیت کے ایک ذمہ دار رکن کی حیثیت سے مجھ پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ میں عام مسلمانوں کے سامنے حقیقت حال کھول کر رکھ دوں اور در پردہ تمام اسلامی جماعتوں کو اس عظیم الشان مظاہرہ سے علاحدہ رکھنے کی جو کوششیں مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کی طرف سے مسلسل ایک ماہ تک ہوتی رہیں۔ ان سے پردہ اٹھا کر سیاسی چال بازی کو قوم کے سامنے واشگاف کر کے پیش کر دوں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے لتنے اہم اعلان اور اس کے پروگرام کے لیے کسی دوسری اسلامی جماعت کو اعتماد میں لینے کی قطعاً ضرورت نہیں سمجھی بلکہ دوسری جماعتوں کے سربراہ اور سرگرم کارکن اس سلسلے میں جب بھی ان سے ملے انھوں نے بڑی بے نیازی اور عدم توجہی کا مظاہرہ کیا بلکہ بعض ذمہ دار حضرات کے سامنے صاف صاف جواب دے دیا کہ مجھ کو جو کچھ اعلان کرنا تھا، میں اعلان کر چکا ہوں جس کو میرا ساتھ دینا ہو ساتھ دے، جس کو نہیں دینا ہے نہ دے۔

دوسری اسلامی جماعتوں کے نمائندے آخر وقت تک اس کوشش میں لگے رہے کہ یہ مظاہرہ پوری قوم کے اتحاد و اتفاق کے ساتھ کیا جائے۔ مگر مولانا مودودی اور ان کی جماعت انڈین کانگریس کی مسلم ماس کنٹیکٹ کی تحریک کی طرح براہ راست عوام کو اہمیت دینے پر اصرار کرتے رہے اور دوسری جماعتوں کے اشتراک و تعاون کو کسی قیمت پر بھی گوارا نہیں کیا۔

الطاف حسن صاحب خود بھی اس کا اقرار کرتے ہیں کہ اچھا طریقہ کار یہی ہو سکتا تھا کہ تمام اسلامی قوتیں جمع ہو کر ایک لائحہ عمل تیار کرتیں۔" مگر اس اقرار کے باوجود جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے کردار و عمل کو جائز قرار دینے کے لیے تاویلات پیش کرتے ہیں۔ اس کو ناقابل عمل بتلاتے ہیں اور اس کی دشواریاں گنواتے ہیں۔ یہ تاویلات اتنی رکیک ہیں کہ ایک معمولی پڑھا لکھا انسان بھی ان کے تار و پود بکھیر سکتا ہے"۔

** قریشی صاحب پہلی دشواری یہ بتلاتے ہیں کہ اس کی دعوت کون دے

اور تین افراد کا تعین کرنے کے بعد تان یہاں آکر ٹوٹتی ہے کہ صرف مولانا مودودی صاحب ہی ایک ایسی شخصیت ہیں جو دعوت دے سکتے ہیں اور شوریٰ میں وقت ضائع کرنے کے بجائے انھوں نے براہ راست دعوت دے دی۔

اس میں انتہائی غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب جو ڈھاکہ، چاٹگام اور جدہ تک کے سفر کی طاقت رکھتے ہیں، قریشی صاحب کے نزدیک وہ ایسے صاحب فراش ہیں کہ قوم کے زعما کو دعوت نامہ بھی جاری نہیں کر سکتے اور مولانا تھانوی کی شخصیت پر رکیک حملے کرکے یہ تاثر دیا گیا ہے وہ اندرون خانہ سیاسی جوڑ توڑ میں مصروف تھے، ان کو اس کام کی فرصت ہی نہیں تھی۔ حالانکہ پورا ملک جانتا ہے کہ حضرت مولانا تھانوی نے ایک سال کے اندر اندر مشرقی اور مغربی پاکستان کے گوشے گوشے میں جاکر کمیونزم اور سوشلزم کے خلاف وہ کام کیا ہے جو مودودی صاحب اور ان کی جماعت تیس سال میں نہ کر سکی تھی۔

چلیے فرض کر لیجیے فقط مودودی صاحب ہی ایک ایسی شخصیت تھے کہ وہ دعوت دے سکتے تھے تو کیا ٹیلیفون، تار اور لاسلکی کے اس زمانے میں ایک مہینے کے اندر اندر مولانا مودودی صاحب دوسرے زعما سے مشورہ نہیں کر سکتے تھے۔ آج دو گھنٹوں میں مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان آجا سکتے ہیں اور فون پر رابطہ قائم کرکے چند منٹوں میں فیصلے اور مشورے ہو سکتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے اپنی افتاد طبع کے مطابق دوسروں سے مشورہ کرنے کی اسلامی اہمیت کو آج تک سمجھا ہی نہیں ہے۔

** قریشی صاحب کا یہ کہنا کہ اجتماعی فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا تھا اور اگر مشورے کے لیے جمع کیا جاتا تو اسلامی قوتیں آپس ہی میں دست وگریبان ہو جاتیں، یہ عذر گناہ بدتر از گناہ کے مصداق ہے، بلکہ پوری قوم پر بداعتمادی کا اظہار ہے۔ حالانکہ سنہ ۱۹۵۱ء میں مختلف مکاتب فکر کے علما نے اسلامی نظام کے بنیادی ۲۲ نکات پیش کرکے اپنے اتحاد واتفاق اور اجتماعیت کا لوہا پورے عالم اسلام میں منوا لیا تھا۔ اب یہی ۱۱۳ مختلف مکاتب فکر کے علما کا سوشلزم

کے خلاف فتویٰ راستہ دکھانے کے لیے کافی تھا کہ قوم کے زعما اور علما ہر وقت ضرورت پر مجتمع ہو کر فیصلے کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

** قریشی صاحب نے مندرجہ ذیل غلط بیانیاں کی ہیں اور ان سے غلط نتائج اخذ کیے ہیں؛

(۱) "۱۶ و ۱۷۔ مئی کو ڈھاکہ میں کونسل مسلم لیگ کا جلسہ تھا۔ اس اجتماع کے موقع پر مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی بھی ڈھاکہ میں فروکش تھے"۔

قریشی صاحب کا یہ بیان صریح جھوٹ اور اشد شدید بہتان ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۱۶ و ۱۷۔ کو دونوں دن مولانا تھانوی لاہور میں موجود تھے۔ ۱۶۔ کو موچی دروازے کے باہر اور ۱۷۔ کو انار کلی میں مولانا کے بیانات (خطابات) ہوئے۔ مرکزی جمعیت کے شوریٰ کے اجلاس کی صدارت فرمائی۔ جس کی گواہی خود مولانا مودودی صاحب اور چودھری رحمت الٰہی بھی دے سکتے ہیں۔

(۲) "مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی کو جمعیت علمائے اسلام میں کوئی کلیدی حیثیت حاصل نہیں ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا مرکزی جمعیت کی سرپرست کمیٹی کے رکن ہیں اور مجلس شوریٰ نے انھیں اپنا قائد منتخب کر کے دوسری جماعتوں سے اشتراک و تعاون کے کلی اختیارات ان کے سپرد کر رکھے ہیں۔ ہمارے یہاں قائد ایک مستقل عہدہ ہے۔ جس کو رہنمائی کے کلی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ دستور میں بھی یہ دفعہ داخل ہے۔

(۳) "۱۷ و ۱۸۔ تاریخ سے ذرا پہلے لاہور میں جمعیت علمائے اسلام کا اہم جلسہ ہوا"۔ غلط بیانی یہ ہے کہ ذرا پہلے کا لفظ بدل کر پہلی غلط بیانی پر پردہ ڈالا گیا ہے حالانکہ یہ اہم اجلاس شوریٰ کا اجلاس تھا اور ۱۷۔ تاریخ کو جامعہ اشرفیہ لاہور میں ہوا تھا۔

(۴) "نئی مجلس شوریٰ میں سے ان افراد کو خارج کر دیا گیا جو مولانا احتشام الحق کے دولتانہ کے ساتھ سیاسی معاہدے کی راہ میں حائل ہو سکتے تھے۔"

یہ الزام قطعاً بے بنیاد ہے۔ کسی ایک فرد کو بھی خارج نہیں کیا گیا۔ جمعیت کا ریکارڈ اس کا زندہ ثبوت ہے۔

طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ایک طرف تو کہا جاتا ہے کہ مولانا کو کلیدی حیثیت حاصل نہیں ہے اور دوسری طرف یہ کہا جارہا ہے کہ مولانا صاحب جس کو چاہیں خارج کر دیں، جس کو چاہیں داخل کر لیں۔

(۵) "انھوں نے جسٹس لاری سے انتخابات کے سلسلے میں انفرادی معاہدہ کر رکھا تھا"

ہذا بہتان عظیم۔ حضرت مولانا اس وقت کسی بھی حلقے سے کھڑے ہونے کو تیار نہیں ہیں۔ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے اکثر حلقوں کے ذمے دار مولانا پر زور دے دے کر تھک گئے مگر مولانا کا اصرار ہے کہ میں باہر رہ کر قوم کی زیادہ خدمت کر سکتا ہوں۔ ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ حضرت مولانا اگر اچھرہ لاہور سے بھی کھڑا ہونا قبول فرمائیں تو لاہور والے اپنے لیے اس کو سعادت تصور کریں گے۔ اور مشرقی پاکستان کے جس حلقے سے بھی مولانا پسند کریں، ہم دیدہ و دل فرش راہ کر دیں گے۔

(۶) "جمعیت علمائے اسلام مولانا تھانوی سے باغی ہو گئی ہے"۔

یہ الزام انتہائی اور اتنا ہی غلط ہے جتنا کہ کوئی شخص یہ کہے کہ قریشی صاحب اسلام سے مرتد ہو گئے۔ (معاذ اللہ)

خدا کے فضل و کرم سے، ہماری جمعیت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

ہم اپنے قائد کے ساتھ ہیں۔ ہمارے ساتھیوں میں سے جن حضرات نے یوم شوکت اسلام میں محض اس غلط فہمی کی وجہ سے ساتھ دیا کہ مرکز سے ان کو کوئی سرکلر یا ہدایت نامہ جاری نہیں ہوا تھا وہ بھی آج قریشی صاحب اور نعیم صدیقی صاحب جیسے مودودی صاحب کے حواریوں کی غلط بیانیوں اور اتہام تراشیوں سے یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ یہ حضرات تعاون و اشتراک کے مستحق نہیں تھے۔"

یہ بیان ۱۸۔جون کو کراچی کے تمام اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔اس کا تعلق کراچی میں ہونے والے مذاکرات سے قطعاً نہیں تھا۔مرکزی جمعیت علمائے اسلام

پچھلے اختلافات کو ہرگز اچھالنا نہیں چاہتی تھی اور مولانا صدیق احمد صاحب نے نمائندہ جسارت کو جمعیت کا یہ موقف واضح الفاظ میں بتا دیا تھا۔ جسارت نے لکھا:

" مولانا صدیق احمد صاحب نے ہمارے نمائندے کو بتایا کہ اتحاد کی یہ کوشش انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوگی۔ انھوں نے کہا کہ اس صورت میں مجیب الرحمان اور بھاشانی صاحب ہرگز اکثریت حاصل نہ کر سکیں گے۔ اس کے برعکس اسلام پسند جماعتوں کو زبردست کامیابی ہوگی۔

انھوں نے کہا کہ اتحاد کی ان کوششوں کے لیے ضروری ہے کہ یوم شوکت اسلام کے سلسلے میں جو کچھ بھی اختلافات پیدا ہوئے تھے اب ہم انھیں بالکل بھول جائیں۔

مجھے بھی اس سلسلے میں کچھ شکایات ہیں لیکن اتحاد اس سے زیادہ اہم ہے۔"

اس موقعے پر کہ میں اسلام پسند عناصر میں اتحاد کے لیے کوشش کر رہا تھا۔ روزنامہ جسارت اور ہفت روزہ زندگی نے میرے متعلق ظفر احمد انصاری صاحب کے اشارے میں انتہائی غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ چنانچہ میں نے بھی ایک بیان دینا ضروری خیال کیا۔ میں نے اپنے بیان میں کہا تھا:

" اسلام پسند جماعتوں کے درمیان اتحاد کے لیے چار جماعتوں کی ابتدائی گفتگو کے بارے میں کراچی کے روزنامہ "جسارت" نے غلط رپورٹنگ سے عام مسلمانوں میں یہ افتراق انگیز تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ مرکزی جمعیت علمائے اسلام اور اس کے قائد سرے سے اتحاد ہی نہیں چاہتے، یا سازش کے ذریعے اس اتحاد میں جماعت اسلامی کو نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں۔ الحمد للہ نواب زادہ نصر اللہ خان کے بروقت وضاحتی بیان نے اخبار کی اس غلط رپورٹنگ کی قلعی کھول دی اور اب پھر مذاکرات کے لیے روشن امکانات پیدا ہو چلے ہیں۔ لیکن اس قسم کی غلط فہمیاں پھیلانے والے شرپسند اخبارات کی کوششوں سے مسلمانوں کو باخبر کرنے کے لیے میں اپنا موقف واضح کر دینا چاہتا

ہوں تاکہ آئندہ ایسی سازشوں کی روک تھام ہو سکے ۔

مذہبی اور سیاسی تمام اسلام پسند جماعتیں اس پر گواہ ہیں کہ تقریباً چھ ماہ سے میری تمام تر کوشش یہی رہی ہے کہ یہ سب جماعتیں متحد ہو جائیں کیونکہ اتحاد کے بغیر پاکستان اور اسلام پسند جماعتوں کا انجام موت کی آخری ہچکی کے مترادف ہوگا اور مجھے خوشی ہے کہ عام مسلمانوں میں بھی لیڈروں سے زیادہ یہ احساس پایا جاتا ہے ۔ مگر حیرت بالائے حیرت اس امر پر ہے کہ بعض وہ نئے اخبارات جو اسلام کے درد مند مسلمانوں کی بڑی بڑی رقموں سے صرف اسلام کے نام پر وجود میں آئے ہیں وہ علاحدگی پسند اور سوشلسٹوں سے صرف نظر کرکے اسلام پسند جماعتوں کے درمیان خلیج پیدا کرنے ، رہنماؤں پر رکیک حملے کرنے اور باہم لڑانے میں پیش پیش ہیں ۔ کیا دین دار مسلمانوں کی رقم کا یہی وہ مصرف ہے جس پر اللہ کی خوشنودی اور اسلام کی برتری قائم ہونے کی امید قائم کی جائے ۔ روزنامہ جسارت کراچی اور ہفت روزہ " زندگی " لاہور نے میری متعدد وضاحتوں کے باوجود میرے بارے میں یہ گھناؤنا تاثر دینے کی بھی کوشش کی ہے کہ میری ایک سال کی جدوجہد کا مقصد صرف کراچی کی دو سیٹیں ہیں ۔ جن کے بارے میں مسٹر لاری سے یا کونسل مسلم لیگ سے اندرون خانہ معاہدہ ہو چکا ہے ۔ جو سراسر جھوٹ اور بہتان ہے ۔

سنہ ۱۹۵۴ء میں جب کہ مشرقی پاکستان میں مسلمانوں کے انتشار کی وجہ سے ہندوؤں کے غلبے کا اندیشہ تھا میں نے سردار عبدالرب نشتر مرحوم ، مولانا اکرم خان مرحوم اور مسٹر نور الامین کے ساتھ کسی جماعت کی رکنیت کے بغیر مشرقی پاکستان کا دورہ کیا اور مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر تقریریں کیں ۔ مگر اس وقت بھی اس قسم کا گھٹیا الزام مجھ پر کسی نے نہیں لگایا ، جو آج اسلام کی ترجمانی کا دعویٰ کرنے والے جریدوں نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مجھ پر لگایا ہے ۔ علاحدگی پسند رجحان اور سوشل ازم کے فتنوں کے مقابلے کے لیے میں نے اپنے بزرگوں کے حکم سے مشرقی و مغربی پاکستان کے دور دراز علاقوں کے دورے کیے اور ایک مسلمان اور تحریک پاکستان کے ایک ادنیٰ سپاہی کی

حیثیت میں اسلام اور پاکستان کے لیے در در پھرنا اپنا فرض سمجھا۔ اللہ کی نصرت اور مدد اور مخلص احباب کی اعانت سے میں نے اپنا تبلیغی فریضہ ادا کر دیا، نظریاتی اور استدلالی جنگ ہم نے فتح کر لی ہے۔ دوسرا مرحلہ انتخابی جنگ کا ہے جو اتحاد کے بغیر جیتی نہیں جا سکتی۔

میں نے بار بار اعلان کیا ہے اور آج بھی واشگاف الفاظ میں پھر اعلان کرتا ہوں کہ مجھے ذاتی طور پر میونسپلٹی اور کارپوریشن کے انتخاب سے لے کر ملک کے بڑے سے بڑے انتخاب تک سے وسہ سے کے درجے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ اتحاد کے مذاکرات میں اگر میں نے یہ محسوس کیا کہ میری ذات اتحاد میں رکاوٹ ہے تو میں اتحاد کی خاطر جماعتی سیاسیات سے بھی کنارہ کش ہو جاؤں گا۔ اس نازک مرحلے میں ملت کا بھی فرض ہے کہ وہ افتراق انگیز اور شرپسند اخبارات کے پروپیگنڈے سے متاثر نہ ہوں اور اسلام کے نام پر مفاد حاصل کرنے والوں کی چالوں سے ہوشیار رہیں۔"

میرا یہ بیان ۲۲۔ جون کے اخبارات میں شائع ہوا تھا۔ مولانا صدیق احمد صاحب نے اور میں نے جو کچھ اس موقع پر کہا تھا، وہ صرف جمعیت کی صفائی میں تھا یا میرے بارے میں جسارت اور زندگی کی غلط بیانیوں کے جواب میں تھا۔ نہ اس میں جماعت اسلامی کے بارے میں کوئی اتہام تراشی کی گئی تھی اور نہ آئندہ اتحاد کے مذاکرات میں حصہ لینے یا نہ لینے کا اس سے کوئی تعلق تھا۔ اس کے برخلاف جماعت اسلامی کی عین خواہش یہ تھی کہ ان دونوں مسئلوں کو الجھا دیا جائے۔ چنانچہ چودھری رحمت الٰہی صاحب کا جو بیان اس کے جواب میں آیا اور ۲۹۔ جون کے اخبارات میں شائع ہوا وہ اس بات کا ثبوت ہے اور پھر مشرقی پاکستان کے امیر جماعت اسلامی کا بیان جو ۲۰۔ جون کو جسارت میں شائع ہوا ہے۔ اس سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ جماعت اسلامی مولانا صدیق احمد صاحب کے بیان کو بنیاد بنا کر اتحاد کے مذاکرات سے الگ ہو جانا چاہتی ہے۔ چنانچہ ان دونوں بیانوں میں یہ دھمکی موجود ہے۔

میری بصیرت جو کچھ دیکھ رہی تھی اور میرے ذہن میں جو خطرات تھے۔ اس کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہ تھا کہ چند جماعتوں میں اتحاد ہو، جو خطرات در پیش تھے ان کے مقابلے کے لیے میرے نزدیک یہ بھی ضروری تھا کہ مسلم لیگ کے مختلف گروپوں میں بھی اتحاد ہو۔ چنانچہ میری کوششیں ایک طرف تو مسلم لیگ کے تینوں دھڑوں کو ایک کرنے کے لیے جاری تھیں، دوسری طرف تمام اسلام پسند جماعتوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا اور ان کا متحدہ محاذ بنانا میری زندگی کا مشن بن گیا تھا اور میں اس کے لیے بہت بے چین تھا۔ لیکن افسوس کہ جماعت اسلامی کے اخبارات نے میری کوششوں کو سراہنے اور اتحاد میں کامیابی کی راہ پیدا کرنے میں سعی و تعاون کے بجائے اس میں برابر روڑے اٹکائے۔ الیکشن کے میدان میں اسلام پسند جماعتوں سے اتحاد کے لیے میری کوششوں کو گٹھ جوڑ، مفاد پرستی، سازش وغیرہ کا عنوان دیا اور اس کے خلاف تواتر و تسلسل کے ساتھ پروپیگنڈہ جاری رکھا۔

جمعیت علمائے پاکستان کے رہنماؤں نے جماعت اسلامی کے جارحانہ رویے کو دیکھ کر انتخابات میں مستقل حیثیت سے حصہ لینے کا اعلان بھی کر دیا۔ اس طرح جماعت اسلامی کے لیے ایک اور مسئلہ اور ایک نیا دردِ سر پیدا ہو گیا۔ جس طرح ہر مکتب فکر کے علما سے نمٹنا جماعت اسلامی کے لیے سخت تھا اسی طرح جمعیت علمائے پاکستان سے بھی مقابلہ کرنا آسان نہیں تھا۔ جماعت اسلامی عوام میں علما کے بے پناہ اثرات اور عوام کے ذہنوں پر ان کی سخت گرفت سے خوف زدہ تھی۔ اس لیے جماعت اسلامی نے اپنی تمام قوتوں اپنی تمام صلاحیتوں کو اپنی جماعت اور اس کے اکابر و اصاغر کے اثرات کو، اپنے سارے پریس کو جمعیت علمائے اسلام اور جمعیت علمائے پاکستان کے خلاف آرا کر دیا اور اس طرح دوسری جماعتوں سے اتحاد کی سبیل نکالنے کے بجائے جماعت اسلامی نے اس ضرورت کو نظر انداز کر کے مزید انتشار و افتراق کا دروازہ کھول دیا۔

ابھی تک اتحاد کی تمام تر کوششوں کا میدان مغربی پاکستان تھا۔ لیکن مغربی پاکستان میں جماعت اسلامی کے رویے اور اس کے اخبارات ورسائل نے جو مایوس کن حالات پیدا کر دیے تھے۔ ان سے مجھے بڑی تشویش تھی۔ چنانچہ میں نے یہ سوچا کہ اگر یہاں متحدہ محاذ کی کوئی سبیل نہیں نکلتی ہے تو کیوں نہ مشرقی پاکستان میں کوشش کی جائے ممکن ہے وہاں چند ایسے مخلص افراد مل جائیں جو جماعتی مصالح ومفاد کے مقابلے میں ملک وملت اور اسلام کے وسیع وعظیم تر مفاد کو مقدم سمجھیں۔

چنانچہ میں نے اس سلسلے میں نورالامین صاحب سے چند ملاقاتیں کیں اور انھیں اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو دعوت دیں اور اگر متحدہ انتخابی بورڈ نہیں بنتا ہے تو کم از کم سیٹوں پر ایسی مفاہمت ہو جائے کہ اسلام پسند ووٹ آپس میں تقسیم نہ ہوں۔

میں نے نورالامین صاحب کو کراچی اور لاہور میں اتحاد کے سلسلے میں مذاکرات کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ اس موقع پر جماعت اسلامی کا رویہ بھی زیر بحث آیا۔ جماعت اسلامی کے رہنماؤں کی طرف سے جس کردار کا مظاہرہ کیا گیا تھا اور جس طرح اتحاد کے مذاکرات کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی گئی تھی ان کے بارے میں بھی بات چیت ہوئی۔

میں نے ان کے سامنے "جسارت" اور "زندگی" کے پرچے رکھے تاکہ وہ اندازہ کر سکیں کہ مختلف جماعتوں اور رہنماؤں کے بارے میں جماعت اسلامی کے خیالات کیا ہیں اور اس پس منظر میں اتحاد کی آئندہ توقعات کے بارے میں بھی گفتگو ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ ہم دونوں کے خیالات میں بڑی ہم آہنگی ہے اور انھیں اس بات کا اندازہ ہے کہ بعض اخبارات کے ایک خاص طرز عمل کا اتحاد کی کوششوں پر کیا اثر پڑا ہے اور آئندہ کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اس کے باوجود کہ جماعت اسلامی کے ایک رہنما نے یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ جسارت اور زندگی جماعت کے اخبارات نہیں ہیں۔

ہمارا خیال تھا کہ جسارت اور زندگی جماعت اسلامی کی ملکیت نہیں ہیں ، پھر بھی چونکہ انھیں جماعت کی پالیسی سے اتفاق ہے۔ اس کے طریقہ کار کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اس کے افکار کی ترجمانی کرتے ہیں اور دوسری اسلام پسند جماعتوں کے مقابلے میں جماعت اسلامی ہی کو اسلامی نقطہ نظر کی ترجمانی کا اہل سمجھتے ہیں اور ان دونوں اخباروں کی تمام تر وفاداریاں جماعت اسلامی کے ساتھ ہیں۔ اب اگر جماعت اسلامی سمجھتی ہے کہ ان دونوں اخباروں کے رویے کا اثر اتحاد کے مذاکرات پر ناگوار پڑ رہا ہے تو جماعت اسلامی کو ان سے اپنا انداز اور رویہ بدلنے کو کہنا چاہیے تھا اور اگر جماعت اسلامی کے رہنما اس انداز سے یہ بات کہتے تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ یہ اخبارات اسے نظر انداز کر دیتے لیکن جماعت اسلامی اپنی صفائی تو پیش کرتی ہے کہ ہمارا ان اخبارات سے کوئی تعلق نہیں ، لیکن اپنے ان نیاز مندوں کو ان کی حرکات سے منع نہیں کرتی۔ یہ بات عام طور پر محسوس کی جارہی تھی۔ جناب نورالامین صاحب سے بھی اس مسئلے پر بات چیت ہوئی ان کے خیالات بھی اسی قسم کے تھے۔

جناب نورالامین صاحب کا خیال بھی یہی تھا کہ جسارت اور زندگی کا رویہ غیر ذمہ دارانہ تھا اور جماعت اسلامی کے رہنماؤں نے فرض ناشناسی کا ثبوت دیا۔ اس تمام گفتگو اور تبادلہ خیالات کا مقصد یہ تھا کہ اب جب کہ اتحاد کی کوشش کی جارہی ہے تو راہ کی تمام رکاوٹیں علم میں ہوں اور نشیب و فراز پر نظر ہو۔

جولائی کی آخری تاریخوں میں نورالامین صاحب نے پی ڈی پی ، کونسل مسلم لیگ ، جماعت اسلامی ، مرکزی جمعیت علمائے اسلام و نظام اسلام پارٹی (۸) کو دعوت دی اور اس طرح ان جماعتوں کے مابین مذاکرات شروع ہو گئے۔ میں مغربی پاکستان لوٹ آیا تھا۔ یہ مذاکرات بھی کامیاب نہیں ہو سکے۔ تمام باتوں پر سب جماعتوں کا اتفاق نہیں ہو سکتا تھا لیکن انتہائی افسوسناک بات یہ پیش آئی کہ جماعت اسلامی نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے پریس میں مختلف فیہ امور کو متفق علیہ اور تصفیہ شدہ

امور کی حیثیت سے دے دیا۔ حالانکہ ان پر تمام جماعتوں کا اتفاق نہیں تھا اور دستخط کرنے والوں نے ان دفعات کو کاٹ کر دستخط کیے تھے۔ مشرقی پاکستان کی جماعت اسلامی نے مرکزی دفتر اور اپنی شاخوں اور پی ڈی پی کو قرار داد کی جو کاپیاں بھیجیں ان میں مختلف فیہ دفعات کاٹی نہیں گئی تھیں۔ اس سے مرکزی جمعیت علماے اسلام کے بارے میں لوگوں میں شکوک و شبہات پیدا ہونے لازمی تھے۔

مغربی پاکستان میں نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب نے ایک بیان کے ذریعے اس امر کا اظہار کیا کہ جن بنیادوں پر مشرقی پاکستان کی جماعتوں میں اتحاد ہوا ہے۔ انھیں بنیادوں پر مغربی پاکستان میں بھی ہم متحدہ محاذ بنالیں۔ لیکن یہاں وہ کسی وجہ سے اس پر تیار نہیں تھے کہ کونسل مسلم لیگ کو متحدہ محاذ میں شامل کیا جائے۔ حالانکہ نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب جماعت اسلامی کے جس سرکلر کی بنیاد پر یہاں دعوت اتحاد دے رہے تھے

اولاً؛ تو وہ بنیاد ہی غلط تھی۔

ثانیاً؛ اگر اسے صحیح بھی تسلیم کر لیا جائے تو مشرقی پاکستان کی طرح مغربی پاکستان کی کونسل مسلم لیگ کو بھی اتحاد میں شامل نہ کرنے کی کوئی معقول وجہ نہ تھی۔ اس لیے کہ کونسل مسلم لیگ مشرقی پاکستان کے مقابلے میں مغربی پاکستان میں زیادہ فعال، منظم اور اپنی ایک مؤثر حیثیت رکھتی تھی۔

چنانچہ میں نے نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب سے عرض کیا کہ یہاں کے متحدہ محاذ میں کونسل مسلم لیگ اور قیوم لیگ اور جمعیت علماے پاکستان کو شامل کرنا ضروری ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے کہ آپ باقی دوسری جماعتوں اور تنظیموں کو بھی اس میں شامل کریں، لیکن الیکشن کا میدان جیتنے میں اصل مسئلہ اسلام پسند ووٹوں کی یک جائی اور انتشار پر موقوف ہے۔ اس لیے کسی ایسی اسلام پسند جماعت کو نظر انداز کرنا صحیح نہیں ہو گا جو الیکشن میں حصہ لے رہی ہو، جس کے علاحدہ رہنے سے

اسلام پسند ووٹ بٹ کر ضائع ہو جائیں۔

اس موضوع پر نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب اور مولانا مودودی صاحب سے میری کئی بار طویل گفتگو ہوئی۔ نواب زادہ صاحب کا کوئی موقف نہیں تھا، وہ مولانا مودودی صاحب کے اس موقف کی حمایت کرتے رہے کہ مسلم لیگ کے افراد ماضی کے بدنام سیاست دان ہیں، جن کی سیاسی اور اسلامی وفاداری پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا لہٰذا متحدہ محاذ میں ایسے عناصر کو شامل کرنا متحدہ محاذ کو لوگوں کی نظروں میں غیر وقیع اور غیر موثر بنانا ہے۔ اس سلسلے میں میرا موقف شروع سے یہ رہا کہ اس وقت ملک میں اصل مقابلہ اسلام و سوشل ازم اور علاقائی نیشنل ازم کے مابین ہے۔ اس لیے جو جماعتیں بھی سوشل ازم اور علاحدگی کے خلاف ہیں ان سب کا ایک محاذ ہونا چاہیے۔ اس وقت بدنام اور نیک نام، صالح اور غیر صالح کی بحث چھیڑنا غلط اور اصل مقصد سے گریز کرنا ہے۔

مجھے اس سے اختلاف نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے کہ کونسل مسلم لیگ اور قیوم لیگ دونوں میں ایسے افراد بھی ہیں، جو سیاسی اور اسلامی اعتبار سے معیاری نہیں ہیں۔ بلاشبہ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی اسلامی فکر پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی سیاسی سیرت کے بعض پہلو بھی پسندیدہ نہیں کہے جاسکتے۔ لیکن اس وقت یہ مسئلہ نہیں تھا کہ کون صالح ہے اور کون غیر صالح اور عقائد و اصول کے معیار پر کس کے خیالات اور اعمال پورے اترتے ہیں۔ اس وقت مقابلہ سوشل ازم کی داعی جماعتوں اور علاحدگی پسند قوتوں سے تھا۔ اس لیے ان کے مقابلے میں اسلام کا ادعا اور نظریہ پاکستان کے تحفظ اور اسلامی آئین کی ترتیب اور پاس کرانے کے وعدے بھی قابل قبول اور گوارا ہیں۔

اور غالباً اسی نقطہ نظر سے جماعت اسلامی نے مشرقی پاکستان کی کونسل مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد منظور کیا اور مغربی پاکستان میں کونسل مسلم لیگ کے محمد ایوب

کھوڑو کے ساتھ معاہدہ کیا۔ حیدر آباد میں جناب پیر پگاڑو کے ساتھ اتحاد کیا، جو ایوب خان کے زمانے میں کنونشن مسلم لیگ میں تھے پھر عوامی لیگ میں چلے گئے اور اب قیوم لیگ میں ہیں اور لاہور میں کونسل مسلم لیگ کے امیدوار ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ مجموعی طور پر جماعت اسلامی کی یہ بات پروپیگنڈے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کہ کونسل مسلم لیگ اور قیوم گروپ کے لوگ اسلام کے خلاف ہیں۔

میں نے نواب زادہ نصراللہ خان صاحب سے عرض کیا کہ خود پاکستان جمہوری پارٹی میں ایک تعداد ایسی ہے جو کنونشن یا کونسل مسلم لیگ سے اس پارٹی میں آکر شامل ہوئے ہیں اور آج اسلام کا نام بھی لینے سے گریز کرتے ہیں۔ کونسل لیگ اور قیوم لیگ ان کی جماعت سے زیادہ اسلام سے بے زاری کا اظہار کرنے والے افراد نہیں ہیں۔

پھر اس قسم کا پروپیگنڈہ کرتے وقت یہ حقیقت بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے تھی کہ مرکزی اسمبلی کا موجودہ الیکشن، تشکیل حکومت یا حصول اقتدار کا الیکشن نہیں ہے بلکہ اولین مسئلہ دستور سازی کا درپیش ہے۔ اگر سوشلسٹ اور علاحدگی پسند عناصر کو نظر انداز کر کے اسلامی دستور بنایا جاسکتا ہے تو اس کی صرف ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ قومی اسمبلی کی ۳۱۳ نشستوں کی غالب اکثریت یا کم از کم ایک سو ساٹھ سیٹیں حاصل کرنی چاہییں۔ اگر جماعت اسلامی یا پی ڈی پی یا کوئی اور جماعت الگ الگ یا یہ سب مل کر قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کر لیتی ہیں تو نہ کونسل مسلم لیگ کو ساتھ ملانے کی ضرورت ہے، نہ قیوم لیگ سے اشتراک واتحاد کی ضرورت ہے، لیکن اگر یہ دو تین جماعتیں مل کر بھی قومی اسمبلی میں اکثریت نہیں لاسکتیں تو ان لیگوں کو نظر انداز کرنے میں کوئی معقولیت نہیں اور انھیں ملائے بغیر چارہ نہیں۔

لیکن جماعت اسلامی کے رہنماؤں کا خیال دوسرا تھا۔ انھیں یقین تھا کہ ناکامی

سوشلسٹوں اور علاحدگی پسندوں کا مقدر بن چکی ہے۔ اسلام کے حق میں عوام نے اپنا فیصلہ دے دیا ہے۔ اسلام کی واحد ترجمان اور حصار جماعت اسلامی ہے۔ اس لیے جماعت اسلامی تنہا قومی اسمبلی میں اکثریت حاصل کر لے گی یا کم از کم وہ اس پوزیشن میں ہوگی کہ کوئی جماعت اور گروپ بھی اس کی حثییت اور قوت کو نظر انداز نہیں کرسکے گا اور اس کی منظوری کے بغیر قومی اسمبلی میں کوئی دستور پاس نہیں کیا جاسکے گا۔ قوتِ فیصلہ کا توازن اس کے ہاتھ میں ہوگا۔

ان کے اس خیال کو جماعت اسلامی کے صحافیوں کے تجزیات و مشاہدات نے اور بھی تقویت دی تھی۔ جماعت اسلامی کے رہنما اپنے اس زعم میں اس حد تک آگے بڑھ چکے تھے کہ رائے پر اعتماد کی بجائے ان میں غرور پیدا ہو گیا تھا کہ اس جماعت اسلامی ہی کے بعض افراد نے محسوس کیا کہ اور زندگی نے اس پر ایک اداریہ لکھا اور انھیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے رویے کو تبدیل کریں۔ لیکن مشورہ اور نصیحت جذبات کے ہر عالم میں مؤثر نہیں ہوتی۔ جماعت اسلامی کے رہنماؤں کی بصیرت جو کچھ دیکھ رہی تھی، وہ کچھ اور تھا اور انھیں اس بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ مرکز اور صوبائی دونوں اسمبلیوں کے انتخابات میں سوشلسٹوں، علاحدگی پسندوں اور لادینی عناصر کو شکست فاش دیں گے۔ اس لیے ان کی پوری توجہ اسلام پسندوں میں اتحاد کے بجائے اپنے مخالف امیدواروں کی مخالفت اور اس پر کیچڑ اچھالنے میں صرف ہو رہی تھی۔ اس لیے جماعت اسلامی کے رہنماؤں نے اور ان کے زیر اثر جناب نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب نے میری ان گذارشات کو در خور اعتنا نہیں سمجھا۔

جماعت اسلامی کے رہنماؤں کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی گئی تھی کہ پاکستان کی کوئی جماعت بھی اپنے نظم وضبط اور عوام میں اثر ورسوخ کے لحاظ سے کوئی مقام نہیں رکھتی اور جو لوگ اتحاد کی باتیں کرتے ہیں وہ حقیقتاً اپنی جماعتوں کے لیے بے ساکھیاں تلاش کرتے ہیں۔ وہ جماعت اسلامی کی تنظیم اور مقبولیت سے فائدہ اٹھا کر

اور اتحاد کر کے اپنے بھی کچھ نمائندوں کو کامیاب بنوا لینا چاہتے ہیں ۔ اس صورت میں اور اس ذہن وفکر کے ساتھ اور اس تجزیے اور اس اندازے کے بعد اگر جماعت اسلامی اتحاد سے گریزاں تھی تو کوئی تعجب کی بات نہ تھی لیکن میری بصیرت مجھے کسی اور ہی عالم کا نقشہ دکھا رہی تھی اس لیے میں نے آخر وقت تک اتحاد کے لیے اپنی کوششوں کو جاری رکھا۔

حواشی:

(۱) اداریہ بہ عنوان "مارفیا کے انجکشن" از ایڈیٹر (مجیب الرحمن شامی) ہفت روزہ "زندگی" لاہور،

۲۶۔ جنوری سنہ ۱۹۷۰ء

(۲، ۳، ۴) ایضاً ہفت روزہ "زندگی" لاہور، اشاعت: ۲۶۔ جنوری سنہ ۱۹۷۰ء

(۵) اس جلسے کی ناکامی کی روداد کے لیے دیکھیے: پلٹن میدان کے المیے کا آنکھوں دیکھا حال ۔ ۔ ۔ ۔ میں کیسے بھول جاؤں؟ از مجیب الرحمن شامی، زندگی، لاہور، ۲۔ فروری ۱۹۷۰ء، ص ۱۱ ۔ ۱۵

(۶) اس جلسے کی عظیم الشان کامیابی کی روداد کے لیے دیکھیے: "ڈھاکے میں اسلامی انقلاب" از نمائندہ خصوصی، زندگی، لاہور، ۲۔ مارچ ۱۹۷۰ء، ص ۲۰ ۔ ۲۲

(۷) اس کی اصل سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے پاس اور بعینہٖ نقل میرے پاس محفوظ ہے۔

(۸) یہ مضمون الطاف حسن قریشی کے قلم سے بہ عنوان "معاہدوں اور خوابوں کے بادشاہ .... جناب دولتانہ" ہفت روزہ زندگی، لاہور کے شمارے مورخہ ۲۶۔ جنوری ۱۹۷۰ء میں شائع ہوا تھا

(۹) دیکھیے ہفت روزہ زندگی، لاہور، ۶۔ جولائی ۱۹۷۰ء، ص ۱۰

(۱۰) مشرقی پاکستان میں مرکزی جمعیت علمائے اسلام اور نظام اسلام پارٹی پر مشتمل ایک ہی تنظیم ہے۔

باب سوم:

مذاکرات اتحاد کا دوسرا دور

اور جماعت اسلامی کی مزید افتراق انگیزیاں

۲۴۔ جون کو لاہور میں اتحاد کے مذاکرات کا دوسرا دور چلا یہ مذاکرات نواب زادہ نصراللہ خان صاحب کی قیام گاہ پر ہو رہے تھے۔ اس نشست میں جمعیت علمائے پاکستان کے وہ نمائندے بھی شریک تھے، جو کراچی کی گفتگو میں شریک نہیں ہو سکے تھے۔ کونسل مسلم لیگ کے خواجہ خیرالدین صاحب بھی ایک مبصر کی حیثیت سے شریک تھے۔

جماعت اسلامی کی نمائندگی چودھری رحمت الٰہی صاحب اور میاں طفیل محمد صاحب کر رہے تھے۔ چودھری صاحب نے اس موقع پر بلند اخلاق کا ثبوت نہیں دیا۔ ان کا رویہ جمعیت علمائے پاکستان کے نمائندوں کے ساتھ ناپسندیدہ تھا۔ سب سے پہلے چودھری صاحب نے مولانا سید سعادت علی صاحب قادری اور مولانا شاہ احمد نورانی صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کے بارے میں دریافت کیا:

"یہ لوگ اس اجتماع میں کس جماعت کی نمائندگی کر رہے ہیں؟"

میں نے کہا:

"جمعیت علمائے پاکستان کی!"

چودھری صاحب نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے فرمایا:

"اس کے باوجود کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کی سنی کانفرنس میں ان لوگوں نے جماعت اسلامی کے خلاف زہر اگلا ہے۔"

اس پر مولانا سعادت علی قادری اور مولانا شاہ احمد نورانی نے صفائی پیش کرتے ہوئے کہا:

"بعض مقررین نے اپنی انفرادی حیثیت سے اپنی تقریروں میں جماعت اسلامی کی مخالفت ضرور کی، لیکن کانفرنس میں جماعت اسلامی کے خلاف نہ کوئی ریزولیوشن پاس ہوا ہے، نہ کانفرنس کا مقصد جماعت اسلامی کی مخالفت تھا۔"

چودھری صاحب نے جواب طلب کیا:

اب آئندہ جمعیت علمائے پاکستان کی روش کیا ہوگی؟

ان دونوں حضرات نے فرمایا:

"جو کچھ یہاں طے ہوگا اس کی پابندی، جماعت اسلامی اور دوسری جماعتوں کی طرح ہم بھی کریں گے۔"

آخر اس کی کیا ضمانت ہوگی؟

چودھری صاحب نے ثبوت مانگا۔ قادری صاحب اور نورانی میاں نے کہا، اس کی جو ضمانت آپ کی طرف سے ہوگی، وہی ہماری طرف سے۔ اس پر میں نے مداخلت کرتے ہوئے کہا:

"مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا سعادت علی قادری وہی تو ہیں جنھوں نے بحالی جمہوریت کی تحریک میں جماعت اسلامی کا غیر مشروط ساتھ دیا تھا۔ جمعیت طلبہ کے جلسوں میں تقریریں کی تھیں۔ پی آئی اے کی اسلام پسند یونین "پیاسی" کے جلسوں میں، ہمارے ساتھ شریک ہوتے رہے ہیں۔"

مجھے حیرت تھی کہ چودھری رحمت الہیٰ صاحب یہ کیا کہہ رہے ہیں ۔ جمعیت علمائے پاکستان کے یہی رہنما، سوشل الزم اور اسلامی سوشل ازم کے خلاف محاذ پر ہمارے دست وبازو تھے اور اگر سنی کانفرنس میں جماعت اسلامی کے خلاف بعض مقرروں کی تقریروں سے صرف نظر کر لیا جائے، تو انھوں نے ایوب خان کے دور آمریت کے زمانے میں تحریک جمہوریت سے لے کر لادینی فتنوں کے خلاف اور سوشلزم کے خلاف جہاد میں جماعت اسلامی سے کم خدمات انجام نہیں دی تھیں ۔ اب بھی میرا یہی خیال ہے ۔

لیکن چودھری صاحب نے اس پر فرمایا کہ:

کیا اب یہ لوگ ان خدمات وتعاون کا بدلہ چاہتے ہیں ؟

چودھری صاحب کے اس رویے کو شریفانہ نہیں کہا جاسکتا تھا ۔ ان کے اس تحقیر آمیز انداز گفتگو کو تمام حضرات نے محسوس کیا ۔

ویسے تو چودھری رحمت الہیٰ صاحب کے بارے میں ان کی سخت کلامی کی عادت کی شکایت عام ہے:

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

لیکن یہ بات بھی کہی گئی ہے کہ چودھری صاحب کا یہ رویہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت تھا ۔ وہ مذاکرات میں تعطل پیدا کرنا اور انھیں ناکام بنانا چاہتے تھے اور وہ اپنی اسکیم میں اس حد تک کامیاب بھی رہے کہ کم از کم جمعیت علمائے پاکستان کے نمائندوں نے اس گفتگو میں حصہ لینے سے انکار کر دیا ۔

بہر حال ۲۴ ۔ جون کے ان مذاکرات میں سب سے پہلے جماعتوں کے مابین اس تلخی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی، جو جسارت اور زندگی کی غلط بیانیوں اور فتنہ انگیزیوں سے جماعت اسلامی اور نوابزادہ نصر اللہ خان صاحب کے رویے سے مایوسی کے بعد میں نے مسلم لیگ کے مختلف دھڑوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کی

کوششوں کو اور تیز کر دیا اور ساتھ ہی جمعیت علماے پاکستان کے مولانا شاہ احمد نورانی، سید سعادت علی قادری اور مولانا جمیل احمد نعیمی کے ساتھ اتحاد کی داغ بیل ڈالی۔

اس سلسلے کی ایک نشست مولانا شاہ احمد نورانی کے مکان پر ہوئی۔ اس بات پر دونوں جمعیتوں کے رہنما متفق تھے کہ جماعت اسلامی اتحاد کے معاملے میں سنجیدہ نہیں ہے۔ نیز یہ کہ اسلام پسند سیاسی جماعتوں کے ساتھ اتحاد سے پہلے ہم دینی اور مذہبی جماعتیں متحد ہو جائیں۔ مذاکرات کی دوسری نشست کے لیے ١٥۔ دن کا وقفہ مقرر کیا گیا۔ اسی اثنا میں لاہور سے میرے دو محترم دوست مولانا محمد ذکی، مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے اور مولانا مصطفیٰ صادق صاحب روزنامہ وفاق لاہور کے ایڈیٹر تشریف لائے۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا مودودی صاحب اب پوری سنجیدگی کے ساتھ اتحاد کے لیے تیار ہیں اور ہم آپ کو لینے کے لیے آئے ہیں کہ مودودی صاحب سے الگ تنہائی میں اس موضوع پر گفتگو کرا دی جائے۔ انھوں نے بتایا کہ مولانا مودودی صاحب دوسری اسلام پسند جماعتوں کے ساتھ اتحاد پر آمادہ ہیں۔ میرے اطمینان کے لیے انھوں نے فرمایا کہ ہم ٹیلیفون پر مولانا مودودی صاحب سے آپ کی بات بھی کرا دیں۔

میں نے عرض کیا کہ

> "مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی سے مایوسی کے بعد میں نے جمعیت علماے پاکستان کے نمائندوں کے ساتھ اتحاد کی بات چیت شروع کی ہے۔ مودودی صاحب کی ملاقات سے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔
>
> دوسری بات یہ کہ اب مسلم لیگ والوں کے بارے میں بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے خلاف جسارت اور زندگی کی زبردست مہم کے بعد وہ جماعت اسلامی کے خلوص پر اور مولانا مودودی صاحب کی یقین دہانی پر اعتماد کریں گے اور اس بات چیت میں حصہ لینے پر بھی تیار ہوں گے"۔

لیکن ان کے اصرار پر میں نے ان دو شرطوں کے ساتھ مولانا مودودی صاحب

سے ملنے پر آمادگی ظاہر کی۔

"۱.... اس ملاقات کا اخبار میں ذکر نہ آئے۔

۲.... ملاقات میرے عزیز گوہر درانی صاحب کے مکان واقع گلبرگ میں میری قیام گاہ پر ہوگی۔"

ان دونوں باتوں کو تسلیم کر لیا گیا۔ ان دونوں شرطوں کے مان لیے جانے کا مجھے یقین دلایا گیا۔ مجھے اس تصور سے بے حد خوشی ہوئی کہ شاید اب جماعت اسلامی خلوص کے ساتھ اتحاد پر آمادہ ہے، لیکن اس اتحاد کو موثر اور مفید بنانے کے لیے کونسل مسلم لیگ کی شمولیت اس میں ضروری تھی اور میرا خیال تھا کہ شاید دولتانہ صاحب اب اس پر آمادہ نہ ہوں۔ چنانچہ مولانا مودودی صاحب سے ملاقات سے قبل ایک فلائٹ سے لاہور جا کر گوہر درانی صاحب کے مکان پر دولتانہ صاحب کو بلا کر ان سے دریافت کیا کہ:

"اگر اب اتحاد کی کوئی تحریک کی جائے تو آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

دولتانہ صاحب، جماعت اسلامی اور اس کے اخبارات کے گھناؤنے پروپیگنڈے سے سخت کبیدہ خاطر تھے لیکن ان کا رجحان یہی تھا کہ!

اگر جماعت اسلامی اتحاد کے معاملے میں مخلص ہے تو ہمیں اس معاملے میں پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے، بلکہ مخلصانہ طور پر اتحاد کی کوشش میں حصہ لینا چاہیے۔ ان کے نزدیک انتشار وافتراق سے اتحاد بہر صورت بہتر تھا۔ وہ جب بھی ہو اور جس درجے میں بھی ہو۔ دولتانہ صاحب سے گفتگو اور انھیں آمادہ کر کے چند گھنٹوں کے بعد میں کراچی واپس آگیا۔

کراچی سے ہم ۴۔ اگست کو سکھر کے لیے روانہ ہوئے۔ سکھر میں مرکزی جمعیت علماے اسلام کی ایک کانفرنس تھی۔ سکھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ جماعت اسلامی نے پورے سکھر میں یہ پروپیگنڈہ کیا ہے کہ جلسے میں کوئی شامل نہ ہو۔ جماعت اسلامی کی

ان مذموم کوششوں کے باوجود بحمد اللہ جلسہ بہت کامیاب رہا۔

سکھر سے ۵۔اگست کی شب میں کوئٹہ میل سے روانہ ہو کر ۵ بجے شام کو مولانا محمد ذکی اور مصطفیٰ صادق صاحب کے ہمراہ لاہور پہنچا، میں درانی صاحب کے مکان پر پہنچا اور مغرب کی نماز کے فوراً بعد درانی صاحب جاکر مولانا مودودی صاحب کو لے آئے۔ کھانے کے وقفے کو چھوڑ کر رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تک ہماری گفتگو ہوتی رہی۔ گفتگو میں مصطفیٰ صادق صاحب بھی شامل تھے میں نے ان تمام تلخیوں کا ذکر کیا جو ان کی جماعت کی طرف سے اور جسارت اور زندگی کے ذریعے پیدا کی جاتی رہی تھیں۔

آخر میں میں نے مولانا مودودی صاحب سے کہا:

"اس کے باوجود اتحاد کی اہمیت اور ضرورت اپنی جگہ پر ہے اور اگر آپ اب اس پر آمادہ ہیں تو میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں۔"

مولانا مودودی صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا کہ

"جماعت اسلامی اور دیگر مذہبی تنظیموں کے مابین اتحاد ہو جائے، جس میں دیوبندی اور بریلوی مکتبہ فکر کی تنظیمیں اور اہل حدیث تنظیمیں شامل ہوں اور مذہب کی بنیاد پر ایک باوقار متحدہ محاذ بن جائے۔ اس کے لیے آپ میری مدد کریں کہ ان لوگوں کو میرے پاس اتحاد کے لیے لائیں۔"

میں نے عرض کیا:

"اول تو مذہبی جماعتوں اور علما کے خلاف جماعت اسلامی کی جو روش رہی اور اس کے اخبارات و رسائل نے ان کے خلاف جو کچھ لکھا ہے، اس کی بنا پر اس بات کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے کہ ہر مکتبہ فکر کے علما آپ کے پیچھے پیچھے چلیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تنہا مذہبی جماعتوں کا محاذ تبلیغی کاموں کے لیے مفید ہو سکتا ہے، لیکن اس وقت سب سے اہم مسئلہ علاحدگی پسند اور سوشلسٹوں کے مقابلے میں انتخابی مہم کو جیتنے کا ہے اور وہ اس کے بغیر ممکن

نہیں کہ الیکشن کے میدان میں اترنے والی تمام اسلام پسند جماعتوں کو شامل کیا جائے۔"

آخر میں میں نے جسارت اور زندگی کے اس غلیظ پروپیگنڈے کی طرف متوجہ کیا، جو میرے اور دوسری اسلام پسند جماعتوں اور ان کے رہنماؤں کے خلاف مسلسل کیا جاتا رہا تھا۔

اس کے جواب میں مولانا مودودی صاحب نے فرمایا کہ

"زندگی اور جسارت ہمارے اخبار نہیں ہیں اور ہمارا ان پر کوئی اختیار نہیں ہے۔"

میں نے عرض کیا:

"تو پھر آپ صرف یہ اعلان کر دیں کہ جسارت اور زندگی ہمارے اخبار نہیں ہیں اور ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔"

اس پر مولانا مسکرائے اور فرمایا:

"بھائی! پھر وہ ہمارے خلاف لکھنا شروع کر دیں گے۔"

۴-۵ گھنٹے کی یہ گفتگو جس کی خاطر مجھے کراچی سے بلایا گیا تھا کچھ زیادہ نتیجہ خیز اور بارآور ثابت نہیں ہوئی۔ میں ملاقات کے ختم ہونے کے بعد نائٹ کوچ سے کراچی واپس آگیا اور صبح کے اخبارات میں یہ خبر دیکھ کر سخت صدمہ ہوا۔

"مولانا احتشام الحق تھانوی نے اچھرہ میں مولانا مودودی صاحب سے ملاقات کی۔"

اگر مولانا مودودی صاحب کے در دولت پر جا کر ملنے سے ملک وملت کا کوئی فائدہ ہوتا تو میرے لیے یہ بات ہرگز کسر شان کی نہیں تھی۔ میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل جانے کو تیار تھا۔ لیکن یہ بات جماعت اسلامی کے اخلاص و دیانت کا فیصلہ ضرور کر دیتی ہے اور یہ ایک شرمناک بات ہے۔

جماعت اسلامی والے یہ کبھی نہیں سوچتے کہ اس جھوٹی صحافت سے ان کے

نصب العین "اقامت دین" کی تحریک کو کیا فائدہ پہنچے گا؟

اس عہد شکنی اور کذب وافترا کا ایک فوری اور واضح نتیجہ یہ نکلا کہ جمعیت علمائے پاکستان کے ساتھ اتحاد کے جو مذاکرات شروع ہو چکے تھے وہ اخبار کی اس جھوٹی خبر سے ختم ہو گئے اور اس طرح جماعت اسلامی نے اپنے منصوبے کے تحت اتحاد پر ایک ضرب اور لگائی۔

اس موقعے پر اس شبھے کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے کہ جماعت اسلامی نے جمعیت علمائے پاکستان سے اتحاد کی کوششوں کو ناکام بنانے ہی کے لیے یہ ڈراما کھیلا ہو۔

ایک طرف تو یہ تھا۔ دوسری طرف نواب زادہ شیر علی سے اور انٹیلی جنس بیورو کے ایک اعلیٰ افسر سے بھی ملاقاتوں اور مشوروں کا سلسلہ قائم تھا اور اخبارات کو اس کی ہوا تک نہ لگنے دی جاتی تھی۔

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا!

باب چہارم:

مودودی نصر اللہ خان گٹھ جوڑ

ایک نیا متحدہ محاذ

اتحاد کی کوششوں پر جماعت اسلامی کی آخری ضرب

اگست کے تیسرے ہفتے میں اچانک پی ڈی پی کے دفتر سے متحدہ محاذ کا دعوت نامہ موصول ہوا، جس میں ایجنڈے کے ساتھ ایک نئے ورکنگ پیپر کی ایک کاپی بھی بھیجی گئی تھی۔ یہ ورکنگ پیپر میرے ورکنگ پیپر سے بالکل مختلف تھا، جو کراچی کے مذاکرات میں زیر عمل رہا تھا اور جس کا متن زندگی میں چھپ چکا تھا۔ دوسری عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ اتحاد العلماء جو جماعت اسلامی کی ایک ذیلی جماعت تھی، اس کی اپنی الگ کوئی حیثیت اور پالیسی نہیں تھی، اس کو بھی متحدہ محاذ میں ایک مستقل جماعت کی حیثیت سے شامل کیا گیا تھا۔ جس کا مقصد تو شاید متحدہ محاذ میں غالب اکثریت پیدا کرنا تھا، لیکن کونسل مسلم لیگ یا اس کے قیوم گروپ کو دعوت نہیں دی گئی تھی۔

یہ میٹنگ ۱۶۔ ستمبر کو ہونے والی تھی لیکن بعض مجبوریوں کی وجہ سے میرے لیے اس میں شرکت ممکن نہ تھی اور میں نے اپنے عذرات سے تار کے ذریعے مطلع کر دیا تھا۔ اس عدم شرکت کا تعلق مسلم لیگوں کو مدعو کرنے یا نہ کرنے سے ہرگز نہ تھا۔

لیکن ۱۹۔ ستمبر کو اخبارات میں مذاکرات کی جو روداد شائع ہوئی، اس میں میری عدم شرکت کی وجہ مسلم لیگ کو نظر انداز کرنا بتائی گئی تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ آٹھ جماعتوں نے ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا ہے۔ جس میں مولانا احتشام الحق تھانوی نے اس لیے شرکت نہیں کی کہ کونسل مسلم لیگ کو شمولیت کی دعوت نہیں دی گئی۔ اس متحدہ محاذ کے عناصر اخباری اطلاع کے مطابق یہ تھے۔

۱۔ جماعت اسلامی،

۲۔ پاکستان جمہوری پارٹی،

۳۔ اتحاد العلماء،

۴۔ سنی تنظیم (مفتی نعیم گروپ)،

۵۔ جمعیت اہل حدیث،

۶۔ جماعت اہل حدیث،

۷۔ غربا اہل حدیث اور

۸۔ احیائے ملت

متحدہ محاذ بنانے والوں کے اخلاص نیت کا اندازہ تو اسی سے ہو جاتا ہے کہ ان جماعتوں میں سے دو کو چھوڑ کر کوئی جماعت بھی ایسی تھی ہی نہیں جس کی شمولیت سے انتخابی مہم کا انتشار ختم ہو سکتا اور الیکشن میں اسلام پسند جماعتوں کے امیدواروں کے مقابلے میں تصادم کا خطرہ باقی نہ رہتا۔

میرے خیال میں اس اتحاد کا مقصد ہی یہ نہیں تھا کہ واقعی اتحاد مقصود و مطلوب ہے۔ جماعت اسلامی کو صرف قوم پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہم نے متحدہ محاذ بنا لیا حالانکہ جیسا کہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اتحاد ان جماعتوں میں ہونا چاہیے تھا، جو انتخابات میں حصہ لے رہی تھیں اور جن کے امیدواروں کے میدان میں آجانے سے اسلام پسند ووٹوں کے تقسیم ہو جانے کا خطرہ تھا۔ جو جماعتیں انتخابات میں حصہ ہی

نہیں لے رہی تھیں، ان سے انتخابی اتحاد یا کسی معاہدے کے کوئی معنی ہی نہ تھے۔ ان میں سے بعض جماعتیں مثلاً اتحاد العلما، جماعت اسلامی ہی کی ذیلی جماعت یا شاخ تھی اور ان پر خود جماعت اسلامی کے فلسفہ اجتماع کے مطابق "جماعت" کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ جماعت اسلامی اس زعم میں مبتلا تھی کہ اس نے میدان جیت لیا ہے اور اسے کسی جماعت سے تعاون اور اتحاد کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لیے اس نے ان جماعتوں سے اتحاد کا ڈھونگ رچایا، جو پہلے ہی اس کی موید و معاون تھیں۔ پھر ان جماعتوں میں سے جو میدان میں اتریں ان سے بھی لڑائی مول لے لی گئی اور جماعت اسلامی نے شریک پیمان جماعت کے امیدوار کو چھوڑ کر ایک ایسی جماعت کے امیدوار کی تائید کی جو معاہدہ میں شامل ہی نہیں تھی۔ میرا اشارہ جنرل سرفراز خان، پاکستان جمہوری پارٹی (شریک اتحاد جماعت) کے نمائندے کو نظر انداز کر کے کونسل مسلم لیگ (جو شریک پیمان نہیں تھی) کے امیدوار ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی حمایت کرنے کی طرف ہے۔ اس طرح ان آٹھ جماعتوں کے متحدہ محاذ کی ہانڈی بھی انتخاب سے پہلے ہی بیچ چوراہے پر پھوٹ گئی۔

مجھے یہ بھی گوارا تھا کہ کسی میں اور کسی درجے میں اتحاد ہو۔ لیکن افسوس ناک بات یہ تھی کہ اس میں میرے متعلق غلط بیانی سے کام لیا گیا تھا اور اس سے مرکزی جمعیت علمائے اسلام کی اتحاد کے بارے میں پالیسی کے متعلق غلط فہمی پیدا ہو رہی تھی۔ اس لیے میں نے اس کے جواب میں پی ڈی پی کے سیکریٹری جناب صابر جعفری صاحب کو ایک مستقل خط لکھا اور معاملے کے تمام پہلوؤں کو ان پر واضح کر دیا اس خط کا مکمل متن یہ ہے:

محترمی جعفری صاحب! وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ

نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب کے تار کا جواب میں نے تار سے

دے دیا تھا اور مزید وضاحت کے لیے مصطفیٰ صادق صاحب مدیر وفاق کی طرف رجوع کرنے کے لیے تار ہی میں عرض کر دیا تھا۔ یقین تھا کہ ان سے میری معذوری کی تفصیلات معلوم ہو گئی ہوں گی، مگر ۱۹۔ ستمبر کے اخبارات میں آپ کا جو پریس ریلیز شائع ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے تفصیلات کے لیے یا تو رجوع ہی نہیں کیا اور یا اتحاد کے نام پر تخریب کی پرانی روایات کو دہرانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ کے پریس ریلیز کا اخباری تراشہ ملاحظہ کے لیے ہمرشتہ ہے۔ اس اعلامیہ کے ایک حصہ میں آپ نے قوم کو یہ خوش خبری دی ہے کہ اسلام پسند جماعتوں میں اتحاد ہو گیا۔ اعلامیے کے دوسرے جزو میں مرکزی جمعیت علماے اسلام و نظام اسلام پارٹی کے نمائندوں کے شریک نہ ہونے پر یہ تاثر دیا گیا ہے کہ مرکزی جمعیت کو طے کردہ امور سے تو اتفاق ہے مگر وہ کونسل مسلم لیگ کے بغیر اتحادی مذاکرات میں شریک نہ ہو سکے گی۔

جہاں تک اسلام پسند جماعتوں میں اتحاد ہو جانے کے اعلان کا تعلق ہے، مجھے نہیں معلوم وہ کس حد تک صداقت اور واقعیت پر مبنی ہے۔ مغربی پاکستان میں ماہ جون کے اتحادی مذاکرات کے بارے میں اخبارات کے ذریعے جس قدر بے سروپا خبریں شائع ہوتی رہیں اور جس طرح پاکستان اور اسلام کے وسیع تر مفاد کو خاک میں ملا کر شخصی و جماعتی مفاد کی خاطر جھوٹے پروپیگنڈے کیے جاتے رہے ہیں ان کے پیش نظر اتحاد کا یہ اعلان بھی مسلم قوم کے مضطرب دلوں کو جھوٹی تسلی دینے اور عوام کے جذبات سے کھیلنے کے لیے من گھڑت خبر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ پھر اعلامیے کا دوسرا حصہ، جس میں تفصیلات سے اتفاق کرنے اور کونسل مسلم لیگ کے بغیر شریک نہ ہونے کا الزام لگایا گیا ہے، صالحیت کے دعوے داروں کے جھوٹ کا سب سے بڑا شاہکار ہے۔

مذاکرات کی پہلی نشست میں دفعات اور امور بحث کا جو خاکہ میں نے مرتب کر کے بحث کے لیے پیش کیا تھا اور نواب زادہ صاحب نے جس کی تعریف بھی فرمائی تھی اور جو ہفت روزہ زندگی لاہور میں شائع بھی کر دیا گیا تھا،

معلوم نہیں کیوں وہ بڑے ڈرامائی طریقے پر نظرانداز کردیا گیا اور اس کی جگہ مخصوص فکر و ذہنیت کا حامل ایک خاکہ بحث کے لیے پیش کیا گیا۔ جس کی نقل مجھے ڈاک سے موصول ہوئی۔ اس سے پہلے نہ مجھے خاکے کی تبدیلی کا علم تھا اور نہ دوسرے خاکے کی تفصیلی دفعات میرے علم میں تھیں۔ اس صورت میں دفعات سے میرے اتفاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پہلے خاکے میں ترمیم و تنسیخ کے بجائے مکمل طور پر ڈرامائی تبدیلی کے اسباب پر میں نے بہت غور کیا اس کے سوا کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ تمام مکاتب فکر کے علما کے مرتب کردہ ۲۲ نکات کے مطابق دستور سازی کی دفعہ سے گریز کرنا مقصود تھا۔ کیونکہ میرے خاکے میں وہ دفعہ موجود تھی، تبدیل شدہ خاکے میں وہ دفعہ موجود نہیں ہے۔ یہ ہے اسلام پسند جماعتوں کی اسلام پسندی کا ثبوت۔

رہی یہ بات کہ "کونسل مسلم لیگ کے بغیر اتحادی مذاکرات میں جمعیت شریک نہ ہوسکے گی" یہ صرف بے اصل اور بے بنیاد ہی نہیں ہے بلکہ اس الزام کو نہایت مبتذل اور ناپاک مقاصد کے لیے قصداً تراشا گیا ہے۔ ایک طرف جمعیت پر لگائے ہوئے قدیم الزام کی تجدید سے جمعیت کو بدنام کرنا مقصود ہے، دوسری طرف کونسل مسلم لیگ کو اچھوت ظاہر کرنا ہے (اور یہ ثابت کرنا کہ) اس کے قریب سے گزرنا بھی کفر ہے۔ حالانکہ مشرقی پاکستان کے اتحادی مذاکرات میں کونسل مسلم لیگ کو شامل کرکے اس کفر کا ارتکاب کیا جاچکا ہے۔ سندھ میں پیر پگاڑا صاحب و قیوم خان صاحب والی مسلم لیگ سے بھی اتحاد میں شریک ... ن جماعتیں انتخابی اتحاد کرچکی ہیں۔ ہم نے ابھی تک نہ کسی مسلم لیگ سے اتحاد کیا ہے اور نہ ایسی کوئی شرط ہماری طرف سے پیش کی گئی ہے۔

دراصل اتحادی مذاکرات میں شریک نہ ہونے کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے کہ مذاکرات میں جن افراد کی شرکت کی نمائش کی جارہی ہے ان کے اتحاد سے پورے ملک کے مسائل حل نہیں ہوسکتے۔ جب تک ملک کی دوسری اسلام

پسند جماعتوں کے ساتھ بھی انتخابی اتحاد نہ کیا جائے، اس کے علاوہ جس اتحادی مذاکرے کی پوری کارروائی بعض جماعتوں کے حامی اخبارات ورسائل میں تفصیل کے ساتھ بلکہ مخصوص نقطہ نظر سے شائع ہوتی رہی ہے۔ اس میں کسی کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ ۱۶۔ جون پھر ۲۴ و ۲۵۔ جون کی جملہ کارروائی جو ہفت روزہ زندگی میں حرف بحرف چھپی ہے۔ اس کی ذمے داری کس پر ہے؟ یہ وہ مواقع ہیں جن کے ہوتے ہوئے اتحادی مذاکرے میں شرکت سے نہ ملک کا فائدہ ہے نہ اسلام کا۔ ان تمام باتوں کے علاوہ اتحاد کی یہ منطق کسی شخص کی سمجھ میں آنے والی نہیں ہے کہ امیدواروں پر سمجھوتے کے لیے مذاکرات ہو رہے ہوں اور آزاد امیدواروں کی حمایت کا اعلان وہ جماعتیں کر رہی ہیں جو سمجھوتے میں شریک ہیں۔ یہ اتحاد اور سمجھوتا نہیں ہے بلکہ دوسروں کو بے وقوف بنانا ہے۔

والسلام

احتشام الحق تھانوی

جعفری صاحب یا نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب کی طرف سے اس خط کا تو کوئی جواب نہیں آیا لیکن ۲۲۔ ستمبر کی میٹنگ کی اطلاع اور دعوت جس خط کے ذریعے سے دی تھی، اس سے غلط فہمی کی تلافی ضرور ہو جاتی ہے۔ جعفری صاحب کے خط کا مکمل متن یہ ہے:

۲۲۔ سی ۳، گلبرگ، لاہور

۱۹۔ ستمبر ۱۹۷۰ء

قبلہ محترمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا تار مل گیا تھا، آپ کی مصروفیت کی وجہ سے عدم شرکت کا ہم سب دوستوں کو بہت افسوس ہے۔ ۱۶۔ ستمبر کو میٹنگ ہو گئی تھی جمعیت علمائے پاکستان کے نمائندے مبصر کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔ اب ۲۳

ستمبر آئندہ، دن کے گیارہ بجے پی ڈی پی کے مرکزی دفتر میں میٹنگ کا وقت مقرر ہوا ہے، میں بے حد شکر گذار ہوں گا اگر آپ وقت نکال کر اسلام پسند جماعتوں کے ساتھ شرکت فرمادیں۔ یہ اتفاق ہے کہ جنرل افتخار صاحب کراچی آرہے ہیں اور مجھے موقع مل گیا کہ ان کی معرفت وہ کاغذات جس میں مقاصد اور کچھ اصول،ہم سب نے مل کر وضع کیے ہیں، بھجوا رہا ہوں۔

خیر اندیش

محمد صابر جعفری

جنرل سیکریٹری جمہوری پارٹی

کراچی میں مذاکرات کے لیے جو ورکنگ پیپر میں نے مرتب کیا تھا اور نواب زادہ نصر اللہ خان نے اسے پسند بھی فرمایا تھا اور کراچی کے مذاکرات میں وہ زیر عمل بھی رہا تھا۔لاہور کے مذاکرات میں اسے تبدیل کر دیا گیا۔اس کی تبدیلی اور اس کی وجہ کی طرف میں نے اشارہ کر دیا ہے۔مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبدیل شدہ ورکنگ پیپر یہاں نقل کر دیا جائے تاکہ میرے مرتبہ ورکنگ پیپر اور اس کا تقابلی مطالعہ کرکے قارئین خود رائے قائم کر سکیں کہ میرے ورکنگ پیپر کی تبدیلی کا پس منظر کیا ہو سکتا ہے۔اس کے پس منظر اور اسباب پر میں بحث کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔اس کی دفعات کی تبدیلی کی وجہ کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔اگر قارئین ذرا بھی غور و فکر سے کام لیں گے تو اس کے اصل پس منظر اور تبدیلی کے اسباب کو ضرور سمجھ جائیں گے۔ تبدیل شدہ ورکنگ پیپر کا مکمل متن یہ ہے:

"پاکستان آج اپنی تاریخ کے ایک انتہائی نازک دور سے گزر رہا ہے۔ یہ ملک برصغیر ہند کے مسلمانوں نے اپنی متحدہ جدو جہد سے لاکھوں جانوں اور ہزاروں عزتوں کی قربانی دے کر اور لاکھوں گھر بار لٹا کر خالص اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے آج تک یہاں اسلام کو عملاً نافذ نہیں ہونے دیا گیا۔اور گزشتہ دس سالہ دور آمریت میں یہاں طرح طرح کے ایسے فتنوں

کو ابھرنے اور پروان چڑھنے کا موقع ملا جو پاکستان اور اسلام دونوں کے دشمن ہیں ۔ ایک طرف ملک کے مختلف حصوں میں علاقائی اور لسانی قومیتوں اور عصبیتوں کو ہوا دے کر مسلمانوں کے ملی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں ، جو پاکستان کے وجود کی اصل بنیاد ہے اور دوسری طرف سوشل ازم کے فتنے کو ابھار کر مار دھاڑ کے ذریعے اسلام کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کرنے اور اس کی جگہ ایک ملحدانہ اور مادہ پرستانہ نظام حیات قائم کرنے کی سازش کی جارہی ہے تاکہ پاکستان اپنی اس نظریاتی اساس ہی سے محروم ہو جائے جس پر یہ قائم ہوا تھا اور جس کے بغیر یہ قائم نہیں رہ سکتا ۔ ان دونوں قسم کی سازشوں کی پشت پر عالمی قوتیں بھی سرگرم عمل ہیں اور ان میں سے جو سازش بھی کامیاب ہو ، نتیجہ ہر حال میں انتشار اور ملک و ملت کی تباہی کی صورت میں نکلے گا ۔ ان فتنوں کا مقابلہ کرنا جہاد کا درجہ رکھتا ہے اور تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس راہ میں کسی قربانی سے دریغ نہ کریں اور متحد ہو کر ان کے استحصال کے لیے جدوجہد کریں تاکہ ملک کی وحدت و سالمیت کی حفاظت کی جاسکے اور یہاں اسلام کا وہ نظام عدل قائم کیا جاسکے جس کے تحت ہر علاقے ، ہر طبقے اور ہر فرد کے ساتھ عدل و انصاف ہو ۔ لہذا ،

۱ .... مرکزی جمعیت علمائے اسلام و نظام اسلام پارٹی
۲ .... پاکستان جمہوری پارٹی
۳ .... کونسل مسلم لیگ
۴ .... جمعیت علمائے پاکستان (اہل سنت)
۵ .... جماعت اہل حدیث
٦ .... جماعت اسلامی (۱)

نے طے کیا ہے کہ وہ ان فتنوں کا مقابلہ متحد ہو کر کریں گی ۔ اس اتحاد کا نام " اسلامی متحدہ محاذ " ہو گا ۔ اور اس کا دروازہ مزید ان جماعتوں کے لیے کھلا رہے گا جو اپنی پالیسی اور پروگرام کے لحاظ سے اور اپنی تاریخ و روایات کے اعتبار سے ان مقاصد سے ہم آہنگ ہوں ، جو اس اتحاد کی بنیاد ہیں ۔

مقاصد

اسلامی متحدہ محاذ حسب ذیل مقاصد کے لیے جد و جہد کرے گا:

(۱) نسلی، علاقائی اور لسانی عصبیتوں کے مقابلے میں ملی وحدت کا احساس پیدا کرنا اور پاکستان کی وحدت و سالمیت کا تحفظ کرنا۔

(۲) سرمایہ داری نظام، سوشل ازم اور دیگر لادین نظاموں کا مقابلہ کرنا اور پاکستان میں خالص اسلامی نظام کے قیام کی سعی کرنا۔

(۳) پاکستان میں قرآن و سنت پر مبنی آئین کے نفاذ کی کوشش کرنا۔

اس سلسلے میں پہلے مرحلے پر حسب ذیل ترمیمات کے ساتھ سنہ ۱۹۵۶ء کے آئین کو ملک کا آئین قرار دے دیا جائے۔

الف؛ وفاقی مرکز میں دو ایوانوں پر مشتمل مقننہ کا قیام۔

ب؛ وحدت مغربی پاکستان کے خاتمے کے بعد سابق صوبوں کی بحالی کو دستور میں شامل کر دیا جائے۔

ج؛ دفاع، امور خارجہ، کرنسی اور وفاقی مالیات، بیرونی اور بین العلاقائی تجارت اور مواصلات اور دوسرے امور جن پر اتفاق ہو، مرکز کے پاس رہیں اور ان شعبوں کے لیے مرکز کو براہ راست خود ٹیکس عائد کرنے کے اختیارات حاصل ہوں۔

د؛ شق (ج) میں مذکور امور کے سوا تمام اختیارات ان حکومتوں کی طرف منتقل کر دیے جائیں جو از روے دستور ملک کے دونوں بازوؤں میں قائم ہوں اور انھیں مکمل علاقائی خود مختاری حاصل رہے۔

ان ترمیمات کے بعد سنہ ۱۹۵۶ء کا دستور، ۲۲ نکات کی بنیاد پر ملک کا متفقہ آئین قرار پاجائے اور اقتدار اسمبلی کو منتقل کر دیا جائے تو اس کے بعد دستور میں ایسی ترمیمات کی جائیں کہ وہ قرآن و سنت سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے اور اس ضمن میں جو خامیاں اس دستور

میں موجود ہیں وہ سب دور کر دی جائیں۔

(۴) ملک کے معاشی نظام کی قرآن و سنت کی روشنی میں اس طرح اصلاح کی جائے کہ وہ سرمایہ داری نظام اور سوشل ازم کی خرابیوں سے پاک ہو جائے۔ ارتکاز زر اور معاشی لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ ہو جائے، پیدائش دولت میں اضافہ ہو، تقسیم دولت منصفانہ ہو، ہر شہری کو بنیادی ضروریات زندگی (غذا، لباس، مکان، تعلیم اور علاج) کی ضمانت حاصل ہو، ہر طبقے (مزدور، کسان، صنعت کار اور ملازم) کے ساتھ انصاف کیا جائے اور کوئی اپنی جائز کمائی اور اپنے حقوق سے محروم نہ رہے۔ پاکستان کے دونوں بازوؤں میں عدم مساوات کو جلد از جلد دور کیا جائے اور ملک کے مختلف حصوں کی ترقی پر یکساں توجہ دی جائے اور کسی حصے کے ساتھ بے انصافی نہ ہو۔ سود، جوا اور کمائی کے دیگر تمام ناجائز ذرائع بند کر دیے جائیں۔ معاشی ترقی محض چند خاندانوں کو دولت و ثروت فراہم کرنے کے بجائے عوام کی معاشی خوشحالی کا ذریعہ بنے اور اس کے ساتھ افراد کے بنیادی حقوق اور معاشرے کی شہری آزادیاں بھی برقرار رہیں۔

(۵) فواحش (زنا، شراب، قمار، رقص و سرود) پر پابندی عائد کی جائے اور اسلامی شعائر کی ترویج کا اہتمام کیا جائے۔

(۶) مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔ انھیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا پورا حق حاصل ہو گا۔ وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کر سکیں گے۔ ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہو گا کہ انھی کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

(۷) اقلیتوں کے تمام شہری اور قانونی حقوق کی حفاظت کی جائے اور ان کی جان و مال، آبرو اور شہری آزادیوں کے تحفظ کی ضمانت دی جائے

طریق کار

(۱) ان مقاصد کے حصول کے لیے اسلامی متحدہ محاذ میں شریک جماعتیں اپنے طور پر کام کرنے کے ساتھ مشترکہ پروگرام (بیانات، جلسے، جلوس انتخابات میں باہمی تعاون واتحاد اور اسمبلی میں تعاون واشتراک) کے ذریعے جدوجہد کریں گی۔

(۲) انتخابات میں اس بات کی پوری کوشش کی جائے گی کہ محاذ میں شریک جماعتوں کا باہم ایک دوسرے سے مقابلہ نہ ہو بالخصوص ایسی نشستوں پر جن پر مقابل میں کوئی ایسی جماعت ہو جو علاقائی تعصبات ابھارنے والی یا سوشل ازم کی علم بردار ہو تاکہ ان کے مقابلے پر اسلام پسند جماعتوں کی طرف سے صرف ایک ہی نمائندہ کھڑا ہو اور ان کا متحدہ قوت سے مقابلہ کیا جائے۔

(۳) اسلامی متحدہ محاذ میں شریک جماعتیں باہم ایک دوسری جماعت پر یا اس کے لیڈروں پر تنقید اور نکتہ چینی سے پرہیز کریں گی اور باہمی شکایات کو گفت وشنید کے ذریعے یا محاذ کے اجلاس میں پیش کرکے رفع کرنے کا طریقہ اختیار کریں گے۔

اسلامی متحدہ محاذ میں شریک جماعتوں کے مابین سنہ ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں مفاہمت کے لیے حسب ذیل طریق کار طے پایا ہے:

(۱) تمام جماعتیں ان حلقہ ہائے انتخاب کی فہرست تیار کریں گی۔ جن کے بارے میں معقول وجوہ ودلائل کی بنا پر ان کا اندازہ یہ ہو کہ ان حلقوں میں وہ اپنی قوت اور اپنے وسائل سے انتخاب میں کامیابی کی توقع رکھتی ہیں اور اس محاذ سے تعلق رکھنے والی جماعتوں کی صرف تائید ہی ان کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔

(۲) ان فہرستوں میں نمائندگان کے بارے میں حسب ذیل کوائف درج

کیے جائیں گے:

نام، عمر، تعلیم، برادری، پیشہ، متعلقہ جماعت میں حیثیت، کامیابی کے امکانات اور ان کے وجوہ و دلائل۔

(۳) ان فہرستوں میں کسی ایسے شخص کا نام شامل نہیں کیا جائے گا جو دور آمریت میں حکمران جماعت میں شریک رہا ہو یا جس نے اس دور میں حکومت سے مفادات حاصل کیے ہوں، البتہ جو لوگ اپنی اس روش کو ترک کر کے بحالی جمہوریت کی مہم میں حصہ لے چکے ہوں، ان کے نام شامل کیے جا سکتے ہیں۔

(۴) فہرستیں مرتب ہونے کے بعد تمام شریک اتحاد جماعتوں کے درمیان ان کا باہم تبادلہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ان میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکے گا۔

(۵) فہرستوں کے تبادلے کے بعد ہر شریک اتحاد جماعت اپنی طرف سے مشرقی اور مغربی پاکستان میں دو دو تین تین نمائندے نامزد کر دے گی اور باہم گفت و شنید کے ذریعے اس بات کی پوری کوشش کی جائے گی کہ محاذ میں شریک جماعتوں کے درمیان ایسی مفاہمت ہو جائے جس کے نتیجے میں کسی حلقہ انتخاب میں ان جماعتوں کا آپس میں مقابلہ نہ ہو۔ بالخصوص ایسی نشستوں پر جن کے انتخاب میں دوسری جانب عوامی لیگ، نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ)، نیشنل عوامی پارٹی (ولی خان گروپ)، پیپلز پارٹی، جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ) یا سندھ متحدہ محاذ کا کوئی امیدوار ہو۔ ان نمائندوں کے طے کیے ہوئے سمجھوتوں کی توثیق جب شریک اتحاد جماعتوں کے انتخابی بورڈ کر دیں گے تو یہ سمجھوتے قطعی حیثیت اختیار کر لیں گے اور ہر جماعت کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنی جماعت کے کارکنوں سے ان کی پابندی کرائے۔

مفاہمت کے لیے حسب ذیل امور پر انحصار کیا جائے گا:

الف:

ہر جماعت کے مرکزی اور صوبائی سربراہوں یا انتہائی اہم شخصیتوں سے حتی الوسیع دوسری جماعتیں مقابلہ نہیں کریں گی۔

ب: دیکھا جائے گا کہ جو جماعتیں کوئی حلقہ انتخاب اپنے لیے لینا چاہتی ہیں اس حلقے میں جماعتی قوت، وسائل اور اثر ورسوخ کے لحاظ سے کامیابی کے امکانات کس کے حق میں زیادہ ہیں۔

ج: مرکز اور صوبے کی بنیاد پر نشستوں کی تقسیم کے کیا امکانات ہیں۔

(۶) انتہائی کوشش کے باوجود اگر چند نشستیں ایسی رہ جائیں جن پر کوئی سمجھوتا نہ ہو سکے تو انھیں کھلی نشستیں قرار دے دیا جائے گا، لیکن وہاں محاذ کی جو جماعتیں انتخاب میں حصہ لے رہی ہوں وہ باہم ایک دوسرے پر حملہ کرنے یا کیچڑ اچھالنے سے سختی کے ساتھ اجتناب کریں گی اور شرافت کے ساتھ اپنے حق میں کنویسنگ کریں گے۔

(۷) جماعتوں کے درمیان مفاہمت کے نتیجے میں جو نشست جس جماعت کے حصے آئے گی۔ اس کے لیے متعلقہ جماعت اپنا ٹکٹ جاری کرے گی اور نشست پر انتخابی مہم چلانا اور اس کے لیے وسائل مہیا کرنا اسی جماعت کی ذمے داری ہو گی۔ باقی جماعتیں صرف اس کی تائید اور مدد کریں گی۔

(۸) مفاہمت کے نتیجے میں کسی جماعت کو ملنے والی نشست پر اگر محاذ میں شریک کسی دوسری جماعت کا کوئی آدمی انتخاب میں کھڑا ہو جائے تو متعلقہ جماعت اسے اپنی رکنیت سے خارج کر دے گی اور اس کا عام اعلان کر دیا جائے گا اور وہ جماعت اپنے ان ارکان کے خلاف بھی مناسب تادیبی کارروائی کرے گی، جن کے خلاف ایسے امیدوار کی

کھلی یا چھپی امداد کرنے کا الزام ثابت ہو جائے۔

(۹) تمام جماعتیں مرکزی اسمبلی کے لیے اپنی نشستیں ۳۰۔ جولائی تک اور صوبائی اسمبلی کے لیے ۵۔ اگست تک مکمل کر لیں گی اور باہم مفاہمت کا تمام کام ۱۵۔ اگست تک مکمل ہو جانا چاہیے۔

(۱۰) اسمبلی کے اندر ان جماعتوں کے جو نمائندے کامیاب ہو کر پہنچیں گے وہ اپنی الگ الگ پارلیمانی پارٹی بنائیں گے۔ لیکن جن مقاصد کے لیے یہ اتحاد کیا جارہا ہے ان میں یہ سب پارلیمانی پارٹیاں مل کر کام کریں گی۔

---

(۱) اس مقام پر نمبروں کے سامنے مسودے میں جماعتوں کے نام درج نہیں تھے لیکن جن جماعتوں کا اتحاد موضوعِ بحث تھا اور جن کے اشتراک سے "اسلامی متحدہ محاذ" کا قیام عمل میں آرہا تھا، ان کے نام چوں کہ باب دوم کے شروع ہی میں آچکے تھے اور اس کے بعد بھی بار بار ان کا ذکر آیا تھا، اس لیے یہاں نمبروں کے سامنے ان جماعتوں کے نام درج کر دیے ہیں (ا۔س۔ش)۔

باب پنجم:

اتحاد کی تیسری اور آخری کوشش

اتحاد کی ناکامی اور اسلام کی رسوائی میں

جماعت اسلامی کا حصہ

اکتوبر کے وسط میں کونسل مسلم لیگ اور قیوم گروپ کے مابین اتحاد کے سلسلے میں میرا لاہور جانا ہوا۔ مجھے مفتی محمد شفیع صاحب کے صاحبزادے مولانا محمد ذکی صاحب نے یہ بتایا کہ میاں ممتاز دولتانہ اور مولانا مودودی صاحب کے مابین اتحاد کے سلسلے میں ملاقات ہوئی ہے اور امیدواروں کی لسٹوں کا تبادلہ بھی ہوا ہے۔ اس لیے اب اتحاد میں مسلم لیگ کو شامل کرنے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔

اسی روز مولانا ذکی صاحب نے اپنے مکان پر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب اور مجھے کھانے پر مدعو کیا، تاکہ دولتانہ مودودی ملاقات والی خبر کی روشنی میں اتحاد کی کوششوں کو آگے بڑھایا جائے۔ یہ ملاقات غالباً ۲۲۔ اکتوبر کی شب میں ہوئی تھی۔ اس ملاقات میں وسیع تر اتحاد کی ضرورت پر روشنی ڈالتے ہوئے، میں نے پھر ایک مرتبہ مولانا مودودی صاحب اور نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب کے سامنے اپنا موقف پیش کرتے ہوئے کہا:

"اس وقت اصل مسئلہ حکومت کی تشکیل اور تقسیم اقتدار کا نہیں

ہے بلکہ پاکستان کی سالمیت ، اسلام کے تحفظ اور آئین کی تشکیل کا ہے جو قومی اسمبلی میں اسلام پسند نمائندوں کی غالب اکثریت کے بدوں ممکن نہیں ہے اور چھوٹی چھوٹی آٹھ جماعتوں کا اتحاد کیا گیا ہے ۔ ان میں سے اکثر و بیشتر انتخابات میں حصہ نہیں لے رہی ہیں اور یہ ضرورت اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک انتخابات میں حصہ لینے والی اسلام پسند جماعتوں کو شامل نہ کیا جائے اور تمام جماعتیں اپنے اپنے جماعتی مفادات اور گروہی تعصبات سے بلند ہو کر ایک متحدہ محاذ نہ بنالیں اور سوشلسٹ ، علاحدگی پسند اور لادین امیدواروں کے مقابلے میں ہر سیٹ پر اپنا صرف ایک امیدوار کھڑا کریں ۔ "

نواب زادہ نصر اللہ خان نے کہا کہ :

" ہماری نظر قومی اسمبلی میں اسلام پسند امیدواروں کی اکثریت لانا نہیں ہے ، بلکہ ایسے صالح اور نیک لوگوں کو منتخب کرنا ہمارے پیش نظر ہے ، جو تعداد میں اگرچہ تھوڑے ہوں اور چاہے وہ دستور نہ بنا سکیں ، لیکن اپنے کردار کا مظاہرہ کر کے ایک سو بیس دن کے بعد اسمبلی سے باہر آجائیں اور اپنی نیکی کی شہرت سے اگلی مرتبہ انتخاب میں اپنی جیسی بھاری اکثریت اسمبلی میں لے کر آئیں (۱) ۔ لہذا ایسی اسلام پسند سیاسی جماعتوں کو شامل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جن کی دینی اور سیاسی وفاداری قابل اعتماد نہ ہو ، اگرچہ اس وقت وہ بھی سوشل ازم کے خلاف جہاد میں مصروف ہوں ۔ "

مجھے حیرت ہوئی کہ یہ بات نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب کہہ رہے ہیں اور انھوں نے جماعت اسلامی کی محبت میں اور اسلام پسندی کے جوش میں کس طرح حقائق کو نظر انداز کر دیا ہے ۔ میرا خیال تھا کہ نواب زادہ صاحب ایک مسلمان حقیقت پسند سیاست دان ہیں لیکن آج اندازہ ہوا کہ ان کے ذہن و دماغ پر جماعت اسلامی کا سحر کس طرح اپنا کام کر چکا ہے اور وہ کس طرح اپنی صلاحیتوں سے جماعت اسلامی کی بزم افکار کی تزئین و آرائش میں مصروف اور جماعت اسلامی کی ترجمانی میں پرجوش ہیں ۔ اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے :

انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں ، زبان میری ہے ، بات ان کی
انھیں کی محفل سنوارتا ہوں ، چراغ میرا ہے ، رات ان کی

میں نے دوبارہ اپنے موقف پر اصرار کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا:

"اگر آپ کے نزدیک مسئلہ موجودہ الیکشن میں دستور سازی کا نہیں ہے اور اگر سوشلسٹوں اور علاحدگی پسندوں کو شکست دینا مقصد نہیں ، بلکہ صرف اپنے کردار کا مظاہرہ کر کے واپس آنے اور پھر دوبارہ بھاری اکثریت کے ساتھ جانے کا جو منصوبہ بنایا ہے، ممکن ہے آپ نے اس کو اسلام اور پاکستان کے لیے مفید سمجھا ہو لیکن یہاں یہ حقیقت آپ کو فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ موجودہ الیکشن میں جن عناصر کے ساتھ آپ کا مقابلہ ہے وہ امریکہ اور برطانیہ کی طرح یا پاکستان کے گزشتہ الیکشنوں کی طرح محض سیاسی پارٹیاں نہیں ہیں بلکہ اس کے علاوہ وہ ایک دوسرا نظام حیات لے کر آنے والی اور نظریاتی جماعتیں ہیں۔ جن کے یہاں اپوزیشن کا وجود حرام ہے اور چنگیز خانی آمریت سے چھوٹی اقلیت ہونے کے باوجود بھاری اکثرت کو بے دست و پا بنا دیتی ہے اور جس کے لیے ایک مرتبہ قابض ہو جانے کے بعد دوبارہ الیکشن کا تصور اور اسمبلی میں بھاری اکثریت سے جانے کا خیال ایک خوش فہمی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ یہ ایک اچھا خواب تو ہے عملی دنیا میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں

اگر لادینی عناصر اور سوشلسٹ جماعتیں ایک مرتبہ قومی اسمبلی میں بھاری اکثریت حاصل کر لیتی ہیں تو دنیا کی کوئی طاقت نہ ان کو دستور بنانے سے روک سکتی ہے اور نہ صدر یحییٰ صاحب اپنے ضابطے کی لگام ان کے منہ میں دے سکتے ہیں اور اگر دستور مرتب نہ ہو سکا تو مرکزی اسمبلی ٹوٹ تو سکتی ہے۔ لیکن اس کے بعد کیا حالات پیش آئیں گے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اور اگر حالات جماعت اسلامی اور پی ڈی پی کے تصور کے مطابق ہی پلٹ جائیں ، تب بھی صوبائی اسمبلیوں کے ٹوٹنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر ایک مرتبہ تمام صوبوں میں سوشلسٹ اور علاحدگی پسند عناصر اپنی حکومتیں قائم کر لیں اور ضرور

کر لیں گے ، اس لیے کہ محب اسلام عناصر کا انتشار انھیں اس کا پورا موقع دے رہا ہے تو کیا سوشلسٹ آمریت میں اس کا کوئی امکان باقی رہ جائے گا کہ پھر ان صوبوں سے کوئی اسلام پسند جماعت اپنے امیدوار کو کامیاب بنا سکے ۔ خواہ وہ صالحیت و تقویٰ اور تفقہ فی الدین کے معیار پر اپنے زمانے کا جنید بغدادی اور ابو حنیفہ ہی کیوں نہ ہو ۔ آمریت میں ایسے نتائج کا اندازہ لگانے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں ۔ ایوب خان کے دور آمریت میں انتخاب کے نتائج سے لگایا جا سکتا ہے ۔"

میں نے نواب زادہ صاحب سے اپنے اس خیال کا اظہار بھی کیا:

" اس کا مطلب میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ آپ صالحیت اور معیاری کردار کے صرف مظاہرہ کے لیے پاکستان اور اسلام دونوں کو داؤ پر لگانا چاہتے ہیں ۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے اس موقف کی تائید نہیں کر سکتا ۔ میرے خیال میں یہ ایک انتہائی غیر دانش مندانہ نقطہ نظر ہے ۔ میں سمجھتا ہوں اس موقف میں جماعتی نام و نمود اور اس کی اصول پسندی کی نمائش کے سوا اور کوئی جذبہ کار فرما نہیں ہے اور حیرت کا مقام ہے کہ نیک کردار اور صالحیت کے مظاہرے کی یہ باتیں اس وقت ہو رہی ہیں جب کہ جماعت اسلامی مشرقی پاکستان میں کم سے کم اخبارات کی اطلاع کی حد تک کونسل لیگ اور پی ڈی پی کے ساتھ اتحاد کر چکی ہے اور مغربی پاکستان میں اس نے کونسل مسلم لیگ کے امیدوار اور سندھ کے مشہور وڈیرے محمد ایوب خان کھوڑو سے ، کونشن لیگ کے سابق رکن پھر عوامی لیگ کے سابق رکن اور قیوم گروپ کے حالیہ رکن جناب پیر پگاڑو صاحب سے اور کونسل مسلم لیگ کے امیدوار ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے وعدے اور معاہدے کر رکھے ہیں ۔"

اگر نیکی اور صالحیت کو تولنے کا معیار یہی شخصیتیں ہیں تو یہ بات میری سمجھ میں آج تک نہیں آئی کہ پھر کونسل مسلم لیگ اور قیوم لیگ میں وہ کون سے ابو جہل تھے جن کی بنا پر ان جماعتوں سے اتحاد کو صالحیت کے معیار کے خلاف سمجھا گیا۔

نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب نے معلوم نہیں میرے موقف کو تسلیم کرنے کی وجہ سے یا گفتگو کو مختصر کرنے کی وجہ سے میرے خیالات پر جرح نہیں کی۔

مولانا مودودی صاحب نے یہ کہا کہ:

"آج میاں ممتاز دولتانہ صاحب سے ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی سیٹ کے مسئلے میں تبادلہ خیال ہوا تھا اور میں نے ان سے پورے مغربی پاکستان کے امیدواروں کی فہرست مانگی ہے جو شاید آج رات تک میرے دفتر میں پہنچ جائے گی۔ آپ اگر چاہتے ہیں کہ اتحاد ہو جائے تو ہم آپ کو اپنی طرف سے کنوینر مقرر کرتے ہیں کہ آپ دولتانہ گروپ، قیوم گروپ، پی ڈی پی، جماعت اسلامی، جمعیت علمائے پاکستان اور مرکزی جمعیت کے نمائندوں کو بلا کر گفتگو کا آغاز کریں۔"

شب کی اس گفتگو کے بعد جب صبح کو میاں ممتاز دولتانہ صاحب سے میری بات چیت ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ مولانا مودودی صاحب سے ان کی بات چیت ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کے مسئلہ پر ہوئی ہے۔ باقی رہا کل پاکستان بنیاد پر اتحاد کا مسئلہ تو دولتانہ صاحب نے کہا:

"میں نہیں سمجھتا کہ مولانا مودودی صاحب اس بارے میں سنجیدہ ہیں۔"

میں نے مولانا محمد ذکی صاحب کی معرفت مولانا مودودی سے رابطہ قائم کیا جس پر چودھری رحمت الٰہی صاحب نے یہ جواب دیا کہ

"شب کی گفتگو مولانا مودودی صاحب کی اپنی ذاتی حیثیت میں تھی۔ اگر آپ ان کی پیشکش کو پسند کرتے ہیں تو دولتانہ صاحب سے منوالیں اور میاں ممتاز دولتانہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب سے رجوع کریں۔"

اس جواب سے صاف معلوم ہو گیا کہ جماعت اسلامی، مولانا مودودی صاحب کے قول وقرار اور پیشکش سے گریز کر رہی ہے اور اتحاد کے سلسلے میں کوئی بات کرنا

نہیں چاہتی۔

غرض یہ کہ بار بار کوشش کرنے کے باوجود بات آگے نہیں بڑھ سکی اور نظریہ۔ پاکستان کے تحفظ کے لیے وسیع تر اتحاد کی کوششوں میں ناکامیوں کے بعد بجز صبر کے کوئی چارہ۔ کار باقی نہیں رہ گیا تھا۔

میرے نزدیک مسئلہ اس وقت صالحیت کا نہیں تھا اگر اس چیز کو معیار بنا لیا جاتا کہ صرف صالح افراد سے اور صالح جماعتوں سے اتحاد کیا جائے اور ان سے اتحاد کیا جائے جو اسلام کا نعرہ لگانے میں مخلص ہیں تو اول تو اس کے لیے ہمارے پاس کوئی ایسی کسوٹی نہ تھی جس پر ہم ان افراد کی صالحیت اور اخلاص کو پرکھ لیتے۔ بالفرض اگر کسوٹی ہوتی تو اس پر جس طرح کنونشن لیگ اور قیوم لیگ کے رہنما اور ارکان پورے نہ اترتے تھے۔ اس طرح پاکستان جمہوری پارٹی میں بھی وہ لوگ موجود تھے جو اسی غیر صالح اور غیر مخلص جماعت سے آئے تھے۔ جماعت اسلامی بھی اس کے لیے تیار نہ تھی کہ جن امیدواروں سے اس نے تائید و حمایت کے وعدے کر رکھے تھے ان سے دستبردار ہو اور یہ معلوم ہے کہ ان میں ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب بھی تھے۔ محترم پیر پگاڑو بھی تھے اور جناب محمد ایوب کھوڑو بھی تھے اور یہ بات ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ ان میں سے کوئی جماعت اسلامی اور اس کے فلسفے سے متفق نہ تھا۔ اور ان میں سے بعض کی وفاداریاں مختلف زمانوں میں مختلف جماعتوں کے ساتھ رہی تھیں۔ کوئی ایسا بھی نہ تھا جو کسی ایک جماعت سے عشق میں سچا اور عہد میں استوار رہا ہو اور جماعت اسلامی ان کی صرف وفاداری بشرط استواری اور وضع داری کی بنا پر قدر دان ہو۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

میرا خیال شروع سے یہی تھا کہ یہ وقت تقویٰ و اخلاص جانچنے کا نہیں ہے اور اگر یہی ہے تو ہر کسی کے عقائد و افکار کی جانچ پڑتال کیوں نہ کی جائے اور دیکھا جائے کہ

کس کے عقائد اسلام کے اصول کے مطابق اور کس کے افکار و اعمال سلف صالحین کی فکر و سیرت کے مطابق ہیں ۔ میرے نزدیک اس قسم کی بحث چھیڑنے کا یہ موقع قطعاً مناسب نہیں تھا ۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت ہر اس جماعت کو اتحاد میں شریک کیا جائے ، جو چاہے اصول و معیار پر پوری نہ اترے ، لیکن وہ سوشلزم اور علاحدگی پسند رجحانات کی مخالفت میں مخلص ہو ۔ اس لیے میرے نزدیک وقت کا ایک نہایت اہم فریضہ یہ تھا کہ مسلم لیگ کے مختلف گروپوں میں بھی اتحاد ہو اور افتراق و انتشار کی موجودہ حالت باقی نہ رہے ۔ چنانچہ مسلم لیگ کو متحد کرنے میں میں شروع ہی سے کوشاں تھا ۔ اس کے لیے میں نے لاہور اور پشاور کے سفر بھی اختیار کیے اور کراچی میں بیٹھ کر بھی جو کچھ کر سکتا تھا اس میں فروگزاشت نہیں کی اور اس سلسلے میں مختلف مراحل سے گزرا ۔

ایک مرحلے میں مجھے قوی امید ہو گئی کہ اب شاید مسلم لیگ کے قیوم اور دولتانہ گروپ ایک ہو جائیں گے ۔ اس کے لیے روزنامہ وفاق لاہور کے ایڈیٹر جناب مصطفیٰ صادق صاحب اور جماعت اسلامی کے سابق رکن سردار اجمل لغاری صاحب کے مشورے سے حسن محمود صاحب سے گفتگو کا آغاز ہوا ۔ حسن محمود صاحب نے سردار اجمل خان لغاری کے قلم سے لکھی ہوئی دو شرطیں پیش کیں ۔ اور کہا کہ اگر دولتانہ صاحب انھیں منظور کر لیں تو ہمارے اور دولتانہ صاحب کے درمیان اتحاد ممکن ہے ۔ دولتانہ صاحب نے ان دونوں شرطوں کو قبول کر لیا ۔ میرے مکان پر حسن محمود صاحب اور دولتانہ صاحب کی ایک ملاقات طے پائی ۔ یہ دونوں حضرات اپنے اپنے دوروں کو ملتوی کر کے کراچی تشریف لائے اور میرے مکان پر میری موجودگی میں دونوں رہنماؤں کی بات چیت ہوئی ۔ تعاون اور اتحاد کے امکانات کا جائزہ لیا گیا ۔ میں نے اسلام کے مفاد اور پاکستان کی سالمیت کے واسطے ان سے التجا کی کہ اس وقت اپنی رنجشوں کو دور کر دیں اور کھلے دل سے خوشگوار فضا میں ایک دوسرے سے تعاون کریں ۔ یہ دونوں

یہاں گلے ملے اور طے پایا کہ اب ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈہ نہیں کریں گے۔

ان دونوں حضرات نے مجھ سے یہ گذارش بھی کی کہ ۲۱۔اگست کو جب کہ کونسل مسلم لیگ کے انتخابات کے سلسلے میں مشرقی پاکستان کے بہت سے مندوبین لاہور آئے ہوئے ہوں گے، اگر آپ بھی لاہور میں موجود رہیں تو ہمیں امید ہے کہ مشرقی پاکستان کے دوستوں کو بھی ایک دوسرے کے قریب لانے اور ان کا تعاون حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔

ان تمام کوششوں کے باوجود سیٹوں کے مسئلے پر دونوں جماعتوں کے درمیان سمجھوتے کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی اور مسلم لیگ کے مختلف دھڑوں میں اتحاد کی یہ کوشش بھی بار آور نہ ہوئی۔

لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی نے، اس کے اخبارات نے اور اس کے رہنماؤں نے میری ان مخلصانہ کوششوں کو جماعت اسلامی کے خلاف محاذ بنانے کی کوشش سے تعبیر کیا۔اور برابر اس کوشش میں لگے رہے کہ مسلم لیگ کے مختلف گروپ ایک نہ ہونے پائیں۔لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کی یہ کوشش بھی تھی کہ عوام پر یہ ظاہر کریں کہ جماعت اسلامی مخلصانہ طور پر چاہتی ہے کہ ان میں اتحاد ہو جائے۔چنانچہ ایک طرف مسلم لیگ کے تمام گروپوں کے خلاف محاذ بنایا ہوا تھا اور ان کے رہنماؤں پر رکیک حملے جاری تھے۔ان کی سیرت، ان کی دیانت، ان کے کردار اور ان کے اخلاص پر کیچڑ اچھالی جا رہی تھی۔دوسری طرف اتحاد کے مسئلے میں اپنے رہنماؤں کی کوششوں کو اچھالا جاتا رہا۔چنانچہ ظفر احمد انصاری صاحب کے پروپیگنڈے کے لیے ان کی تصویر چھاپی گئی اور ان کے اخلاص وخدمات اور قائد اعظم سے ان کی بے بنیاد رفاقت کا ڈھنڈورا پیٹا گیا اور اسلامی اتحاد کے لیے ان کی بے چینیوں اور بے قراریوں کے افسانے بیان کیے گئے۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا حصہ اس سلسلے میں اگر کچھ ہے تو یہ ہے کہ

انھوں نے انتشار پھیلایا ہے، افتراق کے بیج بوئے ہیں اور جماعت اسلامی کے امیر جب کہ ایک مرتبہ اتحاد پر آمادہ ہو گئے تھے تو ہماری اطلاع کے مطابق جناب انصاری صاحب نے لاہور کا سفر اختیار کر کے اور چودھری رحمت الٰہی صاحب سے مل کر مولانا مودودی صاحب کو یہ یقین دلایا کہ اتحاد جماعت اسلامی کے لیے ہرگز مفید نہیں بلکہ مضر ہے اور دوسری جماعتیں جماعت اسلامی کو اپنی کامیابی کا سہارا بنانا چاہتی ہیں اور اس سے معاہدہ کر کے اور اس کے اثرات سے کام لے کر اپنے کچھ امیدواروں کو الیکشن میں کامیاب بنانا چاہتی ہیں۔

مسلم لیگوں کے اتحاد کے سلسلے میں ان کے مساعی خود ہفت روزہ زندگی کی رپورٹ کے مطابق یہ ہیں کہ انھوں نے مسلم لیگ کے گروپوں میں اتحاد کے سلسلے میں مولانا مودودی صاحب کے مشورے سے ایک عظیم الشان منصوبہ بنایا۔ اس مسئلے پر نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب سے بات چیت کی۔ میاں ممتاز دولتانہ صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکی، کیوں کہ وہ لاہور سے باہر تھے اور قیوم خان اور فضل القادر صاحب سے بھی بوجوہ ملاقات نہیں ہو سکی، اس لیے کراچی واپس آ گئے۔ یہ ہے اتحاد کے سلسلے میں ان کا بڑا کارنامہ اور عظیم شاہکار!

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خون نکلا!

اس کارنامۂ عظیم کی روداد "زندگی" ہی کے الفاظ میں پڑھ لیجیے۔

"ہماری اطلاعات کے مطابق انصاری صاحب نے دولتانہ صاحب سے ملنے کی کوشش کی۔ مگر دولتانہ صاحب دورے پر تھے، اس لیے ملاقات نہ ہو سکی قیوم خان اور فضل القادر چودھری صاحب مختلف وجوہ کی بنا پر اس مرحلے میں شاید پی ڈی پی اور جماعت اسلامی کے لیے قابل قبول نہ تھے۔ اس لیے سیاسی جماعتوں کے ساتھ دینی جماعتوں کا اتحاد ناگزیر شکل اختیار کر گیا۔ دینی جماعتوں

میں سے یوں تو ہر سمجھ دار اور محب وطن تنظیم نے علاحدگی پسندی اور سوشل ازم کے خلاف مقدور بھر جہاد کیا تھا۔ مگر مولانا احتشام الحق کی وجیہہ شخصیت کے اثرات بہت وسیع تھے۔ چنانچہ انصاری صاحب نے مولانا سے خاکے کے بارے میں گفتگو کی۔ اس گفتگو میں کیا ہوا یہ تو معلوم نہیں۔ البتہ انھیں دنوں مولانا احتشام الحق نے بھی اس بات کا اظہار کیا کہ اتحاد کے لیے دولتانہ صاحب کو بھی اعتماد میں لینے کی اشد ضرورت ہے۔ ان کی رائے تھی کہ ۱۷ اور ۱۸۔ مئی تک کونسل مسلم لیگ کا معاملہ طے ہو جائے گا۔ اس لیے اس وقت تک انتظار کر لینا چاہیے" (۲)۔

قطع نظر اس سے کہ ہماری کوششوں پر اس کا کیا اثر پڑا۔ اس میں ایک طرف تو انصاری صاحب کے بارے میں جھوٹ گھڑا گیا۔ دوسری طرف میرے بارے میں یہ غلط بیانی کی گئی کہ انصاری صاحب نے مسلم لیگوں میں اتحاد کے متعلق اپنے خاکے کے بارے میں مجھ سے گفتگو کی اور میں نے اس مرحلے میں مسلم لیگ میں اتحاد کی مہم شروع کی تھی۔ حالانکہ خود جماعت اسلامی کو مجھ سے ایک یہ شکایت رہی ہے کہ میں صرف دینی جماعتوں ہی میں اتحاد کا خواہاں نہیں ہوں، بلکہ اسلام پسند سیاسی جماعتوں میں بھی اتحاد کا آرزومند ہوں۔

جماعت اسلامی اور نواب زادہ نصراللہ خان اس بات پر مجھ سے خفا تھے کہ میں کونسل مسلم لیگ کو ساتھ لیے بغیر اتحاد میں شریک ہونا نہیں چاہتا۔ چنانچہ ۱۹۔جون کے اخبارات میں بھی تاثر دیا گیا تھا اور جماعت اسلامی کے ایک مضمون نگار نے تو یہاں تک لکھ دیا:

"جن سیاسی جماعتوں کا نام انتخابی اتحاد کے ضمن میں لیا جا رہا ہے، ایک اخباری اطلاع کے مطابق مولانا احتشام الحق صاحب کنونشن لیگ کے گروپوں کو بھی اس اتحاد میں شامل کر رہے ہیں۔"

اور اس کے بارے میں مضمون نگار کی رائے یہ ہے:

"جس اتحاد میں کنونشن لیگی شامل ہوں گے وہ اتحاد پاکستان کے عوام کی بد ترین نفرتوں کا مستحق ہو گا۔" (۳)

لیکن عجیب بات ہے کہ انصاری صاحب کنونشن لیگ اور قیوم لیگ سے اتحاد کے لیے کوشاں ہوں تو ان کی مساعی "مساعی جمیلہ" اور اگر میں اس کا آرزومند ہوں تو یہ میرے نامہ۔ اعمال کی سیاہی بن جائے۔

تمھاری زلف میں آئی تو حسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامہ۔ سیاہ میں ہے

رمضان سے ایک ہفتہ قبل اکتوبر کی آخری تاریخوں میں "علیٰ سبیل التنزل" میں نے ایک کوشش اور کی جس کا مقصد یہ تھا کہ پورے پاکستان میں جن سیٹوں پر اسلام پسند امیدواروں کے مقابلے میں لادینی جماعت کا کوئی امیدوار نہیں، اس میں اگر اتحاد نہیں ہو سکا تو کچھ زیادہ مضائقے کی بات نہیں۔ کیونکہ کوئی نہ کوئی اسلامی ذہن کا نمائندہ ہی منتخب ہو گا۔ لیکن جس سیٹ پر ایک لادینی امیدوار کے مقابلے میں کئی کئی اسلام پسند امیدوار کھڑے ہیں کم از کم انھیں محدود سیٹوں پر سمجھوتا ہو جائے۔ ورنہ کوئی طاقت ہمیں شکست سے نہیں بچا سکے گی۔ چنانچہ میں نے ایک دعوت نامہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، میاں ممتاز محمد خان دولتانہ، مسٹر نورالامین، خان عبدالقیوم خان صاحب اور خواجہ قمرالدین صاحب سیال شریف کی خدمت میں بھیجا۔ اس سے پہلے ایکسپریس ٹیلی گرام سے سب کو آنے والے دعوت نامہ کی اطلاع بھی دے دی تھی۔

دعوت نامے کا مکمل متن یہ ہے:

"السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

کفر واسلام کی نظریاتی جنگ میں اسلام دوست جماعتوں کے مابین جو انتشار موجود ہے۔ اسلام اور ملک دونوں کے حق میں اس کے نتائج نہایت

بھیانک اور مہلک نظر آتے ہیں۔ بالخصوص مشرقی پاکستان میں اسلامی محاذ کی تحلیل اور باہمی تصادم خود کشی کے مترادف ہے۔ اتحاد اور سمجھوتے کی مسلسل کوششیں اب تک بارآور نہیں ہو سکی ہیں۔ ایک آخری کوشش یہ ہے کہ حسب ذیل جماعتوں کے سربراہوں پر مشتمل ایک ہائی پاور کمیٹی منظور فرما دیں۔ جس کا فیصلہ آخری اور سب کے لیے قابل قبول ہو گا۔ طریق فیصلہ یہ ہے:

طریق فیصلہ

۱.... ہر جماعت سے اس کے ایسے اہم امیدواروں کی ایک فہرست حاصل کی جائے جن کے بغیر سمجھوتا ممکن نہیں ہے۔

۲.... ہائی پاور کمیٹی کے ارکان شریک جماعتوں کے اہم امیدواروں کا فیصلہ اتفاق رائے سے کریں گے۔

۳.... شریک جماعتوں کے باقی امیدواروں کا فیصلہ ہائی پاور کمیٹی کثرت رائے سے کرے گی۔

۴.... اور جو سیٹیں سب کے نزدیک متنازع فیہ ہوں، ان کا فیصلہ کمیٹی کے اس چیرمین کے حوالے کیا جائے۔ جس کو ارکان کمیٹی کثرت رائے سے چیرمین منتخب کریں۔

یا

متنازع فیہ سیٹوں کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کر لیا جائے۔

۵.... شریک جماعتوں کے سربراہ اس امر کی تحریر دیں گے کہ مذکورہ بالا طریقے کے مطابق فیصلے کے بعد کسی کو اختلاف کا حق نہ ہو گا اور شریک جماعتیں متفقہ طور پر ایک بیان دیں گی کہ فیصلے کے خلاف جو امیدوار اپنا نام واپس نہ لے قوم اس کو ووٹ نہ دے۔

۶.... جن سربراہوں کو اس تجویز سے اتفاق ہو وہ اپنی جماعت کے سامنے دستخط فرما دیں اور اس تجویز کو دعوت نامہ تصور فرما کر ۲۰۔ اکتوبر ۱۹۷۰ء بروز جمعہ پانچ بجے شام احقر کے مکان جیکب لائن، کراچی میں

تشریف لے آئیں۔

۱.... آل پاکستان مسلم لیگ (قیوم گروپ)

۲.... مسلم لیگ (دولتانہ گروپ)

۳.... پاکستان جمہوری پارٹی

۴.... جماعت اسلامی پاکستان

۵.... مرکزی جمعیت علمائے اسلام و نظام اسلام پارٹی

۶.... جمعیت علمائے پاکستان

نیاز مند

(مولانا) احتشام الحق تھانوی

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی خدمت میں اقبال احمد صاحب ایڈوکیٹ (کراچی) اور مولانا عبدالرحمن صاحب نائب مہتمم جامعہ اشرفیہ، لاہور یہ دعوت نامہ لے کر حاضر ہوئے۔ مولانا مودودی صاحب نے زبانی گفتگو میں جو کچھ فرمایا اس کا حاصل یہ تھا کہ اب وقت بہت تنگ ہے جس میں مذاکرات کا کوئی فائدہ نہیں نکل سکے گا۔ اور دعوت نامے میں کثرت رائے کے مطابق طریق فیصلے سے مجھے اتفاق نہیں ہے، کیوں کہ اتحاد میں شریک جماعتیں سب ہمارے خلاف ہیں۔ اس لیے نہ میں آسکتا ہوں نہ کسی نمائندے کو بھیجنے کی ضرورت سمجھتا ہوں۔ لیکن اس کے جواب میں جو تار امیر جماعت اسلامی نے مجھے بھیجا، اس کا مضمون یہ تھا:

"مولانا احتشام الحق تھانوی!

آپ کا تار مل گیا۔ پچھلے لاحاصل مذاکرات کی روشنی میں اور اب اس درجے تاخیر سے یہ مذاکرات میرے خیال میں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوں گے۔ اس لیے میں اس میں شرکت نہیں کر سکتا۔

ابو الاعلیٰ"

خان قیوم خان نے ایک طویل ٹیلی گرام میں یہ کہا کہ میں اس وقت جان پر

کھیلنے والے معرکے میں مصروف ہوں آپ میری طرف سے پیرپگاڑو صاحب یا حسن محمود صاحب کو شامل کرلیں۔ میاں ممتاز دولتانہ صاحب نے مجھ سے ٹیلی فون پر کہا کہ میں نے جسٹس لاری صاحب اور حسن اے شیخ کو نمائندگی کرنے کے لیے حکم دے دیا ہے۔ ایئر مارشل اصغر خان نے پیش امام صاحب کو اپنا نمائندہ مقرر کیا۔ نورالامین صاحب نے اپنے تار میں کہا کہ میری اہلیہ سخت بیمار ہے۔ اس لیے بذات خود شریک نہیں ہو سکتا۔ آپ نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب سے رابطہ قائم کریں۔ چنانچہ نواب زادہ نصر اللہ خان نے پاکستان جمہوری پارٹی کے جنرل سکریٹری محمد صابر جعفری صاحب کو نمائندہ بنا کر بھیجا۔ اس طرح کنونشن لیگ کی نمائندگی زین نورانی صاحب نے کی۔ اس طرح سات جماعتوں کے مابین ۳۰۔ اکتوبر کو بند کمرے میں مذاکرات شروع ہوئے جن کو ناکام بنانے کے لیے جماعت اسلامی کے اخبارات نے پہلے دن سے پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔

مذاکرات میں مرکزی جمعیت علمائے اسلام ونظام اسلام پارٹی کی طرف سے میں نے یہ پیشکش کی کہ مشرقی پاکستان سے قومی اسمبلی کے لیے مرکزی جمعیت علمائے اسلام کی ونظام اسلام پارٹی کی طرف سے جو امیدوار کھڑے کیے گئے ہیں ان پر مجھے اس وقت کچھ زیادہ اختیار نہیں ہے۔ لیکن مغربی پاکستان کے تمام امیدواروں کو میں واپس لینے کے لیے تیار ہوں تاکہ آپ ایک متفقہ سمجھوتے سے امیدوار کھڑے کریں اور اس کے بغیر فیصلے کی کوئی صورت نہیں ہے کہ کسی کمیٹی کو یا کمیٹی کے کسی چیرمین کو فیصلے کے لیے کلی اختیار دیا جائے اور جن سیٹوں پر فیصلہ نہ ہو سکے ان کا قرعہ اندازی کے ذریعے فیصلہ کیا جائے۔

یہ مذاکرات دو روز تک جاری رہے، لیکن مسلسل کوششوں کے باوجود جماعتوں کو ایک دوسرے کے قریب نہ لایا جا سکا۔ اتحاد کے سلسلے کی یہ تیسری اور آخری کوشش تھی جس میں کامیابی نہ ہو سکی۔ انتخابات کے بعد جو نتیجہ سامنے آیا اسے

میری بصیرت پہلے ہی دیکھ چکی تھی۔ وہ کسی تخمینے اور اندازے کا محتاج نہیں تھا بلکہ دو اور دو چار کی طرح بدیہی تھا۔ کیونکہ اسلام پسندوں کی کتنی ہی بھاری اکثریت ہو، لیکن اگر وہ اقلیت کے ایک نمائندے کے مقابلے میں ۶-۶، ۷-۷ حصوں میں تقسیم ہو کر ناکام ہو جائیں گے اور اسلام پسند اکثریت ناکامی کا داغ بن جائے گی۔ جس کا صرف ماتم کیا جاسکتا ہے۔ اس کے تدارک کی کوئی صورت نہ ہوگی۔ یہ نتیجہ بڑا افسوس ناک تھا جسے میری بصیرت دیکھ رہی تھی۔ اس موقع پر میں نے آئندہ انتخابات میں اپنی جماعت کی پالیسی اور اپنے غم وحزن کو ان الفاظ میں ظاہر کیا تھا:

یہ بیان ۶۔ نومبر ۱۹۷۰ء کو اخبارات کو دیا گیا تھا اس کا مکمل متن یہ ہے:

"ایوب خان کی فوجی آمریت اور شخصی استبداد کے خلاف ملک میں بغاوت کا جو طوفان اٹھا تھا۔ اس میں ملک کی تمام سیاسی ومذہبی اور طبقاتی وسماجی تنظیمیں شامل تھیں، مگر سب سے زیادہ اشتعال مذہبی حلقوں میں اور سیاسی گروہوں میں تھا۔ مذہبی حلقوں میں یہ اشتعال دینی اقدار کی مسلسل پامالی اور اسلام کو موڈرن بنانے کی سرکاری سازش کی بنا پر تھا اور سیاسی حلقوں میں ملت کی روح آزادی کو استبداد کے ذریعے کچلنے کی وجہ سے تھا۔ اگر آمریت کے خلاف عناصر کا تجزیہ کیا جائے تو اس تحریک میں وہ سیاسی جماعتیں اور افراد بھی شامل نظر آتے ہیں، جن کو آج پاکستان کی تباہی کا واحد ذمہ دار قرار دیا جارہا ہے اور وہ لیڈر بھی شریک تھے، جو غیر اسلامی ازموں کے علم بردار اور داعی ہیں۔ اس اختلاف خیال بلکہ اختلاف نظریات کے ہوتے ہوئے بھی "پی ڈی ایم" اور "ڈیک" کی صورت میں ان عناصر کو صرف اس احساس نے متحد کر دیا تھا کہ آمریت کا قلعہ تنہا کسی ایک جماعت سے سر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ آمریت کے خلاف منفی جنگ کا محاذ ختم ہوتے ہی اسلام اور سوشل ازم کی نظریاتی جنگ یعنی اسلام اور پاکستان کی بقا وعدم بقا کی جنگ کا محاذ کھل گیا۔

اس محاذ پر سوشل ازم اور لادینیت کے خلاف ذہنی وفکری تبلیغ کے طور پر جہاد کی جو توفیق اللہ تعالیٰ نے علما کو عطا فرمائی وہ کسی دوسری جماعت

کے حصے میں نہیں آسکی۔ اس کی کامیابی کا سہرا تنہا مشرقی و مغربی پاکستان کے علما کے سر ہے۔ مگر کفر و اسلام یا ملک کی بقا و عدم بقا کی موجودہ انتخابی جنگ انتہائی خطرناک بھی ہے اور باعث شرم بھی۔ کیونکہ پاکستان دشمن اور لادینی جماعتوں کے ایک ایک امیدوار کے مقابلے میں چار چار اسلام پسند جماعتوں کے امیدوار کھڑے ہیں اور اسلامی نقطہ نظر رکھنے والی تنظیموں کے مابین جماعتی مفاد اور سیٹوں کا مسئلہ سد سکندری بن کر اس طرح حائل ہو گیا ہے کہ اب کوئی شخص اس کے تباہ کن نتائج پر سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہے۔ سوشلزم کے نعرے اور اسلام اور پاکستان کے لیے جس خطرے کی نشان دہی ہم عام پبلک میں کرتے رہے ہیں۔ کاش! اتنا ہی خطرہ ہمیں اسلام پسند جماعتوں کے انتشار میں بھی نظر آتا ہے۔

چھ ماہ سے زائد عرصہ ہو رہا ہے کہ ہماری طرف سے پہلے عام اسلام پسند جماعتوں کے مشترک انتخابی بورڈ کی کوشش کی جاتی رہی۔ پھر دوسری کوشش جماعتوں کے درمیان سیٹوں پر سمجھوتے کے لیے کی گئی اور آخر میں صرف ان سیٹوں پر مفاہمت کی کوشش کی گئی۔ جہاں سوشلسٹ یا نیشنلسٹ امیدواروں کے مقابلے میں چار چار اسلام پسند امیدوار کھڑے ہیں۔ افسوس ہے کہ مفاہمت کی آخری شکل میں بھی کامیابی نہیں ہوئی۔ ان حالات میں ہماری جماعت مرکزی جمعیت علمائے اسلام و نظام اسلام پارٹی مشرقی پاکستان میں چار اسلام پسند جماعتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ یا چاروں کے ساتھ اشتراک عمل اور اتحاد کرے گی۔ مغربی پاکستان میں ہماری جماعت صوبہ سرحد میں خان قیوم لیگ سے اور سندھ و پنجاب اور بلوچستان میں کونسل مسلم لیگ سے اشتراک عمل اور اتحاد کرے گی۔

پیپلز پارٹی، عوامی لیگ اور نیپ کے مقابلے میں ضلعی سطح پر پی ڈی پی، تحریک استقلال، جماعت اسلامی، کنونشن لیگ اور جمعیت علمائے پاکستان سے بھی اشتراک عمل اور تعاون کیا جائے گا۔

جماعتوں کے مابین اگر اتحاد نہیں ہو سکا تو اس میں کچھ نہ کچھ ذمہ داری

تمام جماعتوں کی ہے۔ غلطیاں اور کوتاہیاں دانستہ یا نادانستہ ہر کسی سے ہوئی ہیں۔ لیکن کسی کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے اتحاد کے مذاکرات کو ناکام بنانے کی کوشش کی ہے۔ جس جماعت نے دیدہ و دانستہ خود اتحاد نہیں کیا اور دوسروں کے اتحاد کو ناکام بنانے میں افسوسناک کردار ادا کیا وہ صرف "جماعت اسلامی" ہے۔ جماعت اسلامی نے بارہا قوم کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہ اس ملک میں بلکہ دنیا میں صحیح اسلامی نظریہ و نصب العین رکھنے والی اور صحیح طریقہ کار کی پابند واحد جماعت ہے۔ لیکن اس دور میں اسلام کے بہترین مفاد کو جو نقصان پہنچا اور علمائے کرام کی جو رسوائی ہوئی ہے۔ اس کی ذمہ دار تنہا جماعت اسلامی ہے۔

---

(۱) اس نقطۂ نظر کا اظہار اس سے قبل عبد الکریم عابد کے ایک مضمون میں "ایسے اتحاد سے بچنے کی ضرورت ہے" زندگی، لاہور، ۲۵۔ مئی ۱۹۷۰ء، ص ۲۳ میں اس سے قبل پرزور انداز میں ہو چکا تھا۔

(۲) صورت حال۔۔ اتحاد کی بات چیت کے خفیہ اور کھلے پہلو (۱) از الطاف حسن قریشی ہفت روزہ "زندگی" لاہور، ۶۔ جولائی ۱۹۷۰ء

(۳) روزنامہ "جسارت" کراچی (اشاعت خصوصی)، ۲۱۔ جون ۱۹۷۰ء

باب ششم:

کیا جماعت اسلامی اتحاد چاہتی تھی؟

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ

پچھلے صفحات میں یہ بات بار بار آئی ہے کہ جماعت اسلامی اتحاد نہیں چاہتی تھی بلکہ اسے اپنی تنظیم پر، اپنے کارکنوں پر، اپنے اخبارات ورسائل کی طاقت پر اپنے نشرواشاعت کے وسائل پر اور پروپیگنڈے کے ذرائع پر اتنا اعتماد تھا کہ اسے اتحاد کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے نزدیک اتحاد کوئی اسلامی مقصد اور نصب العین نہیں تھا، بلکہ اس کی حیثیت مقصد کے لیے صرف ذریعے اور وسیلے کی تھی اور اس کے نزدیک یہ کوئی عقل مندانہ بات نہیں تھی کہ ذرائع کو مقاصد پر ترجیح دی جائے۔ آتش سیال کو رگوں میں دوڑانا ہے تو کیا ضروری ہے کہ اس کے لیے بلوری جام ہی کا اہتمام کیا جائے۔ اوک سے بھی تو اس دشمن ہوش وخرد کو حلق سے نیچے اتارا جاسکتا ہے:

کب گدائے درِ مے خانہ کو عار آتی ہے
اوک سے پی جو میسر قدح مل نہ ہوا

اور اگر جام ہی کا اہتمام لازم ہے تو یہ کام جام سفال سے بھی لیا جاسکتا ہے۔

جام جم کی تلاش محض لاحاصل ہے:

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جام جم سے تو مرا جام سفال اچھا ہے

اس لیے اگر مقصد انتخاب جیتنا ہے اور اتحاد کے لیے اسی مقصد سے چیخ و پکار کی جارہی ہے تو یہ دیکھ لینا چاہیے کہ اس ذریعے کے اختیار کیے بغیر انتخاب جیتا جاسکتا ہے یا نہیں۔ جماعت اسلامی کے اکابر و اصاغر، اس کے صحافیوں، اس کے مبصروں اور اس کے نکتہ رس مفکروں کا خیال یہی تھا کہ یوم شوکت اسلام کے موقع پر عوام نے سوشلزم کے خلاف اور اسلام پسند عناصر، جن کی رہنمائی کی باگ ڈور جماعت اسلامی کے ہاتھ میں تھی، کے حق میں فیصلہ کر دیا ہے۔ اب شکست سوشلسٹوں اور لادینی عناصر کا مقدر بن چکی ہے۔ اس لیے اتحاد کی ضرورت باقی نہیں ہے۔ مولانا صدیق احمد صاحب نے اپنے ایک بیان میں بالکل بجا فرمایا تھا کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے اتحاد کی اسلامی حیثیت کو سمجھا ہی نہیں۔

بنیادی خرابی یہیں سے پیدا ہوئی۔ اگر ایک غلط بات دماغ میں بیٹھ گئی ہو، تو اس کے لیے گردوپیش سے استدلال فراہم کر لینا کچھ مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن جماعت اسلامی نے اتنا ہی نہیں کیا کہ اس کے نزدیک اتحاد کی ضرورت نہیں تھی اور اس لیے وہ اس سے گریزاں ہو گئی، بلکہ اس کی کوشش مختلف محاذوں پر تقسیم ہو گئی۔

* ایک طرف تو اس نے یہ کوشش کی کہ اتحاد کے مذاکرات کو التوا میں ڈالا جائے۔
* دوسری طرف مذاکرات میں تعطل پیدا کرنے اور انھیں سبوتاژ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔
* تیسری طرف اخبارات و رسائل کے ذریعے عوام میں یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی کہ اول تو اتحاد کی ضرورت نہیں اور بالفرض ہو بھی تو۔

* اس کے لیے تمام جماعتوں میں وہ مسلمہ شرائط مساویانہ طور پر نہیں پائی جاتیں جو اس کے لیے ضروری ہیں۔
* ایک یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش بھی کی کہ اتحاد کی چیخ و پکار صرف وہ جماعتیں کرتی ہیں جنھوں نے مختلف اسباب کی بنا عوام میں مقبولیت کھو دی ہے اور عوام نے انھیں رد کر دیا ہے۔

اس سلسلے میں جماعت اسلامی نے اپنے اخبارات ورسائل کے ذریعے، اپنی تقریروں کے ذریعے اور اپنے کارکنوں کے ذریعے اتحاد کے خلاف مہم کا آغاز کیا۔

ہم یہاں صرف دو ایک مضامین کی طرف قارئین کی توجہ دلائیں گے۔ جماعت اسلامی کے ایک مبصر جسارت کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

"انتخابی اتحاد کی ضرورت اس وقت محسوس ہوئی جب ملک میں سوشل ازم نے ایک خطرے کی حیثیت سے سر اٹھایا اور اسلام سے اس کی نظریاتی کشمکش تیز ہوئی۔ اسلامی قوتوں نے یہ محسوس کیا کہ سوشل ازم کے فتنے کا سر کچلنے کے لیے تمام اسلام دوست قوتوں کا باہم اتحاد ضروری ہے۔ جب خطرہ سامنے تھا تو عملاً یہی ہوا کہ سب نے مل کر اس کا مقابلہ کیا۔"

اس کے بعد اس سوال کا جواب دیا کہ آخر انتخابی اتحاد سے مراد کیا ہے؟ فرماتے ہیں:

"انتخابی اتحاد سے مراد یہ ہے کہ جن پارٹیوں کے درمیان اتحاد ہو وہ باہم مل کر یہ طے کریں کہ کس حلقے سے کس پارٹی کا امیدوار کھڑا ہوگا اور پھر سب مل کر مشترکہ مساعی سے اسے کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔ اس میں یہ بات بھی مضمر ہے کہ وہ کسی ٹھوس پروگرام پر متفق ہوں اور کامیاب ہونے کی صورت میں اس پر عمل درآمد کے لیے عوام کے سامنے جوابدہ ہوں۔"

"بدقسمتی سے اس وقت تک ہمارے ہاں انتخابی اتحاد کی جو کچھ گفتگو بھی سامنے آرہی ہے۔ اس کا سارا زور محض امیدواروں کے اس باہمی سمجھوتے

تک محدود معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کا مقابلہ نہ کریں گے۔ لیکن بعد میں کس مشترکہ پروگرام پر عمل ہو گا۔ اس کا کوئی ذکر نہیں ہوتا۔ شاید اسلام کے نعرے کو کافی سمجھ لیا گیا ہے۔"

اس کے بعد یہ تاثر دینے کی سعی فرماتے ہیں کہ اتحاد کے لیے جو حضرات کوشاں ہیں، ان میں سب مخلص نہیں اور جب تک ان کوششوں میں اخلاص کارفرما نہ ہو کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ کوششیں بارآور ہوں گی۔ لکھتے ہیں:

"بہرحال اس انتخابی اتحاد کے لیے آواز اٹھائی جارہی ہے۔ کچھ لوگ خلوص سے یہ آواز اٹھا رہے ہیں، کچھ لوگ سادہ لوحی سے اس کا ساتھ دے رہے ہیں اور کچھ بطور ایک سیاسی چال کے اس سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ کچھ کے پیش نظر ملک وقوم کی بھلائی ہے اور کچھ کو سیاسی زندگی میں اپنے وجود کی ضمانت اسی اتحاد کے سایے میں نظر آتی ہے۔"

یہ مضمون ٹھیک ان دنوں میں لکھا گیا جب کہ کراچی میں اتحاد کے مذاکرات ہو رہے تھے اور ۲۱۔ جون کے جسارت میں شائع ہوا۔ ان مذاکرات میں،

* جماعت اسلامی،
* پاکستان جمہوری پارٹی،
* جمعیت اہل حدیث اور
* مرکزی جمعیت علمائے اسلام کے نمائندے شریک ہوئے تھے۔

مضمون نگار نے ان نمائندوں کو جن خطابات سے نوازا ہے، غور فرمایئے؛

۱۔ جماعت اسلامی اور پی ڈی پی کے نمائندے مخلص اور ملک وقوم کے بہی خواہ۔

۲۔ جمعیت اہل حدیث کے نمائندے سادہ لوح۔

۳۔ مرکزی جمعیت علمائے اسلام کے نمائندے چالباز، فریبی اور

سیاسی زندگی میں اپنے لیے ضمانت کے متلاشی۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے !
تمھیں بتاؤ یہ انداز گفتگو کیا ہے ؟

جماعت اسلامی، اسلام پسند عناصر میں اتحاد کے لیے جو کوشش کر رہی تھی اس کا یہ ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔

اس کے بعد مسئلے کے دو پہلو تھے؛

۱۔ کیا اتحاد مطلوب و مقصود ہے؟

۲۔ اتحاد ممکن بھی ہے یا نہیں؟

اگر اتحاد مطلوب ہے تو پھر اس کا حصول بہر صورت لازم ہے اور اس عنقا کو زیر دام لانے کے لیے کوئی نہ کوئی صورت ضرور اختیار کی جائے۔ اور اگر اتحاد مقصود و مطلوب نہیں تو پھر اس میں تضیع اوقات کیوں کیا جائے اور اس کے لیے لاحاصل شور و شغب اور خواہ مخواہ کی چیخ و پکار سے کیا حاصل۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

"قطع نظر اس امر کے کہ انتخابی اتحاد پاکستان کے موجودہ حالات میں مطلوب بھی ہے یا نہیں، میں اس مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ممکن العمل بھی ہے یا نہیں؟ عین ممکن ہے کہ ایک شے مطلوب ہو، ہماری خواہش اور تمنا ہو کہ ایسا ہو جائے لیکن عمل کی دنیا میں یہ سرے سے ممکن نہ ہو۔ ایسی صورت میں محض جذباتی انداز میں اس کے لیے چیخ و پکار کرتے رہنا اہل عقل کا شیوہ نہیں۔"

مضمون نگار کے نقطہ نظر کے مطابق یہاں وہ شرائط بھی موجود نہیں ہیں جو اتحاد کے لیے ضروری ہیں۔ مصنف نے نہایت تفصیل کے ساتھ ان شرائط پر بحث کی ہے فرماتے ہیں:

"میری نظر میں انتخابی اتحاد کے لیے درج ذیل شرائط ضروری ہیں؛ اگر خوش قسمتی سے یہ موجود ہوں تو انتخابی اتحاد بار آور ثابت ہو سکتا

ہے۔ بصورت دیگر ساجھے کی ہنڈیا یا تو چڑھے گی ہی نہیں اور اگر چڑھی تو کہیں نہ کہیں پھوٹ جائے گی۔

۱.... انتخابی اتحاد میں شریک ہونے والی سب پارٹیاں با اصول اور منظم ہوں ان کو اپنی جماعت کے نام اور وقار کا اتنا خیال ہو کہ اتحاد میں فریق بن جانے کے بعد اس سے روگردانی کرنے کو اپنی سیاسی موت سمجھیں۔ ان کا ممبر شپ کا انتظام ہو۔ پارٹی کے کچھ اصول و قواعد ہوں اور ان سے مطابقت رکھنے والا ہی جماعت میں شامل ہو سکے۔ دوسرے الفاظ میں معروف جمہوری مفہوم کے مطابق (پاکستان کے عام قاعدے کے مطابق نہیں) ایک سیاسی پارٹی ہو جو کسی پروگرام پر تشکیل پائی ہو۔

۲.... اتحاد میں شریک ہونے والی تمام پارٹیوں میں اتنا ڈسپلن ہو کہ وہ اپنے اراکین سے اپنے فیصلوں کی پابندی کروا سکیں۔ پارٹی کے قائدین جو کچھ طے کر دیں، مقامی طور پر اس میں نقصان نظر آئے، تب بھی اس کی پابندی میں کوتاہی نہ ہو۔ اگر کوئی رکن اپنی پارٹی کے فیصلے کی خلاف ورزی کرے تو پارٹی میں اتنا ڈسپلن ہو کہ اس کا اخراج کرے۔ خواہ وہ کتنا ہی بااثر اور بارسوخ کیوں نہ ہو اور ظاہری طور پر پارٹی کے لیے مفید ہی کیوں نہ نظر آرہا ہو۔

۳.... ان پارٹیوں کے ماضی کے کارنامے، عوام میں ان کی جڑیں، بحیثیت مجموعی ان کی مقبولیت، کارکنوں کی تعداد وغیرہ اس طرح ہو کہ اتحاد برابری کی بنیاد پر ہونے میں کسی کے لیے خاص طور پر وجہ شکایت نہ ہو۔ کسی ایک صوبے اور علاقے میں کوئی ایک پارٹی مضبوط ہو سکتی ہے اور کسی دوسرے صوبے میں دوسری۔ اگر کوئی پارٹی کسی دوسری پارٹی کے مقابلے میں کمزور ہو، عوام میں اپنا حلقہ اثر نہ رکھتی ہو، نئی نئی بنی ہو تو اس میں اتنا ظرف ہو کہ وہ اپنے اثرات کے لحاظ سے کم نشستوں پر قانع ہو سکے۔

۴ .... یہ انتخابی اتحاد بنیادی طور پر خلوص پر مبنی ہو اور مصلحت کو ثانوی حیثیت حاصل ہو ۔ اس کی ضرورت واہمیت کو دل سے محسوس کیا جاتا ہو اور ایک دوسرے سے تعاون کے لیے جذبہ پایا جاتا ہو ۔ ایسا اتحاد جو محض مجبوری کی بنا پر کیا جارہا ہو اور دلوں میں عناد موجود ہو اور باوجود اتحاد ایک دوسرے کو زک دینے سے باز نہ رہا جاسکے ، فائدے سے زیادہ نقصان کا موجب ہو گا ۔

۵ .... کوئی ایسا نقشہ کار سامنے ہو جس پر انتخاب کے بعد عمل کرنے کا عزم وارادہ موجود ہو ۔ جس پروگرام کا وعدہ کیا جارہا ہو ، عوام یہ محسوس کریں کہ یہ جماعتیں اس پر عمل کرنے کا ارادہ اور صلاحیت رکھتی ہیں ۔ اگر ان پارٹیوں میں سے بعض محض انتخابی یقین دہانیاں کروارہی ہوں اور ایک لمحے کے لیے بھی وہ اس پر عمل درآمد کا نہ سوچتی ہوں ۔ کچھ کا ماضی کا ریکارڈ ایسا ہو کہ ان سے سچے وعدے کی توقع بھی نہ کی جاسکے یا کچھ کے ساتھ ایسے گروپ ہوں ؛ جن کا مفاد پروگرام پر عمل کرنے سے ختم ہو جاتا ہو تو عوام میں شکوک وشبہات پیدا ہوں گے کہ یہ سب چکر محض انھیں چکر دینے کے لیے چلایا جارہا ہے ۔ مخالفانہ مہم کے لیے اتنے آسان ہدف موجود ہوں تو انتخابات کی کامیابی مشکوک ہو جاتی ہے ۔ محض اتحاد کے جھوٹے سچے نام پر تو ووٹ نہ پڑیں گے ۔

٦ .... اتحاد کے لیے لازمی شرط تو یہ ہے کہ مشترکہ دشمن اتنا قوی اور مضبوط ہو کہ اتحاد کیے بغیر لڑنے میں سب کو اپنی شکست نظر آتی ہو ۔ یہ بھی ضرورت ہے کہ اتحاد میں شریک سب فریق اس دشمن کو واقعی اپنا دشمن سمجھتے ہوں اور اس بات کا امکان نہ ہو کہ اتحاد کا کوئی فریق اندر ہی اندر دشمن سے جا ملے اور اسے فائدہ پہنچائے یا وہ اتحاد میں شریک کسی فریق سے اپنی مخاصمت رکھتا ہو کہ اسے زک دینے کی خاطر وہ

دشمن سے جاملنے میں کوئی تکلف محسوس نہ کرے۔"

مضمون نگار کا خیال یہ ہے کہ کوئی جماعت چونکہ یہ شرائط پوری نہیں کرتی ہے اس لیے اتحاد ہرگز ممکن الوقوع نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:

"ان بنیادی شرائط کی موجودگی کے بغیر کسی انتخابی اتحاد کی بیل منڈھے چڑھنا سرے سے ممکن ہی نہیں۔ اگر ہم ملک کے موجودہ حالات اور مختلف سیاسی پارٹیوں کے ماضی اور حال پر ایک نظر ڈالیں تو ایک عام فہم آدمی بھی یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ انتخابی اتحاد کے لیے کتنی ہی نیک خواہشات کیوں نہ ہوں عمل کی دنیا میں یہ ممکن الوقوع امر نہیں ہے۔"

سیاسی جماعتوں کے کردار کے بارے میں یہ تو مضمون نگار کا صرف اشارہ تھا۔ آگے چل کر اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف فیصلہ سنا دیا کہ:

"ہمارے ملک میں اب تک برسراقتدار رہنے والی سیاسی پارٹیوں نے بااصول سیاست کی روایت نہیں ڈالی۔ ایوب خان سے پہلے کے گیارہ سال اور بعد کے دس سال عوام نے جس چیز کے تلخ نتائج بھگتے اور آج تک بھگت رہے ہیں، وہ ان سیاسی پارٹیوں کی موقع پرستی، بے اصولی، ابن الوقتی اور اقتدار پرستی ہی تھی۔ یہ بدصفات اس حد تک آگے بڑھیں کہ ملک وملت کا مفاد بھی پس پشت ڈال دیا گیا۔ سیاست کا مطلب ہی ہر جائز و ناجائز طریقے سے دھاندلیوں کے ذریعے عوام کو بے وقوف بنا کر جوڑ توڑ اور سازشوں کے ذریعے اقتدار کی کرسی تک پہنچنا یا اس کا قرب حاصل کرنا تھا۔ ماضی کے یہ واقعات عوام بھولے نہیں ہیں اور مستقبل کے لیے جو بھی لائحہ عمل طے کیا جائے اس میں ان حقائق کو ضرور پیش نظر رکھا جانا چاہیے۔"

یہ معلوم نہیں کہ یہ سطریں لکھتے وقت مضمون نگار کی ذہن میں کون سی جماعتیں ہیں اور یہ فیصلہ کن جماعتوں کے بارے میں صادر فرمایا گیا ہے۔ لیکن جن جماعتوں میں اتحاد کی بات چیت ہو رہی تھی ان میں۔

* مضمون نگار کی محبوب اور اصول پسند "جماعت اسلامی" کے علاوہ

* مرکزی جمعیت علمائے اسلام،
* جمعیت علمائے پاکستان،
* پاکستان جمہوری پارٹی اور
* جمعیت اہل حدیث،

شامل ہیں اور مجھے معلوم نہیں کہ ان جماعتوں نے؛

* بااصول سیاست کی روایت کو ماضی میں کب توڑا تھا،
* موقع پرستی کا مظاہرہ کب کیا تھا،
* بے اصولی کی روایت کون سی ڈالی تھی،
* ان جماعتوں کی ابن الوقتی کے بارے میں معلوم نہیں مضمون نگار کے پاس کیا دلائل تھے؟
* ان میں سے کس جماعت نے اقتدار پرستی کا مظاہرہ کب کیا تھا،
* اور یہ بد صفات جماعتیں کب اس حد تک آگے بڑھی تھیں کہ انھوں نے ملک وملت کا مفاد پس پشت ڈال دیا تھا۔

"جن سیاسی جماعتوں کا نام انتخابی اتحاد کے ضمن میں لیا جارہا ہے وہ جماعت اسلامی، مرکزی جمعیت علمائے اسلام، پاکستان جمہوری پارٹی اور کونسل مسلم لیگ ہیں۔ اب تک کسی نے کنونشن لیگ کو درخور اعتنا نہ سمجھا تھا۔ لیکن ایک اخباری رپورٹ کے مطابق مولانا احتشام الحق حب کنونشن لیگ کے گروپوں کو بھی اس اتحاد میں شامل کررہے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ اتحاد دراصل سوشلسٹوں کے خلاف ایک متحدہ محاذ ہوگا اور اس کی جیت سوشلسٹوں کی شکست تصور کی جائے گی۔"

اس میں یہ بھی فرض کرلیا گیا ہے کہ میں نے کنونشن لیگ کو بھی اس اتحاد میں شامل کرنے کی کوشش کی تھی۔ شاید اس مفروضے کے بغیر تحریر میں زور پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے بعد کنونشن لیگ کے بارے میں تیز وتند الفاظ میں اظہار رائے

کر کے متنبہ فرماتے ہیں:

"اگر اسلام پسند گروپ سے یہ حماقت سرزد ہوئی کہ اس نے کنونشن لیگ کی لاش کا بوجھ بھی اٹھالیا تو اس کے فہم و فراست پر ماتم کیا جاسکتا ہے۔ مولانا احتشام الحق صاحب کی طرف سے ان کا نام لیا جانا اگر مصدقہ ہے تو ہوسکتا ہے کہ یہ مستقبل کی کسی نئی سیاسی گروپنگ کا پیش خیمہ ہو۔"

اس کے بعد مضمون نگار نے کونسل مسلم لیگ، پاکستان جمہوری پارٹی، مرکزی جمعیت علمائے اسلام اور جماعت اسلامی کے تعلق سے انتخابی اتحاد کے امکانات پر بحث کی ہے۔ جمعیت اہل حدیث اور جمعیت علمائے پاکستان مضمون نگار کے نزدیک اس قابل بھی نہیں تھیں کہ ان کے بارے میں اپنے افکار عالیہ سے ان جماعتوں کے کارکنوں کی فکر کو جلا بخشیں اور رہنمائی فرمائیں۔ "کونسل لیگ اور انتخابی اتحاد" کے عنوان سے فرماتے ہیں:

"جہاں تک کونسل لیگ کا تعلق ہے اس کے سربراہ نظریہ، پاکستان اور اسلام کے لیے تقاریر تو بہت کر رہے ہیں لیکن انتخابی اتحاد کے سلسلے میں کسی گفتگو پر آمادہ نہیں ہیں۔ جی۔ ایم۔ سید گروپ سے ان کا انتخابی اتحاد ہو کر ختم بھی ہو چکا ہے۔ یہ افواہیں بھی پہلے سے گرم ہیں کہ اس لیگ نے کچھ ایسے گروپ سے پہلے ہی سمجھوتا کر رکھا ہے۔ جن سے اس انتخابی اتحاد کی صورت میں درحقیقت مقابلہ ہو گا۔ اس پس منظر میں "یوم شوکت اسلام" سے علاحدگی دراصل ایک سوچا سمجھا اقدام قرار دیا جاسکتا ہے۔ کنونشن لیگ کا ایک خاصا عنصر اس میں بھی شامل ہو چکا ہے۔ اس صورت میں کیا کونسل لیگ کو کسی انتخابی اتحاد کا فریق بنایا جاسکتا ہے۔ کونسل لیگ میں کچھ مخلص لوگوں کی موجودگی سے انکار نہیں لیکن اس کا مجموعی مزاج جس چیز سے عبارت ہے وہ اقتدار کے حصول میں کسی عہد اور کسی معاہدے کی پروا نہ کرنے کا ہے۔ اگر بالفرض یہ جماعت کسی انتخابی اتحاد میں شامل ہو تو یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ اپنے کسی امیدوار کو دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ اس کی تنظیم نو کی

بنیاد ہی یہ ہے کہ جس امیدوار کے بھی جیتنے کا امکان ہے ، وہ اپنے لاؤ لشکر سمیت اس میں داخل ہو جائے ۔ خواہ اس کا ماضی کتنا ہی داغ دار کیوں نہ ہو اور مستقبل کے لیے اس کے عزائم کتنے ہی ناپاک کیوں نہ ہوں ۔ اس کی سیاست میں تو یہ بات بھی بالکل جائز ہو گی کہ اگر اتحاد کے معاہدے کے تحت ان کے نمائندے کو بیٹھنا ہو تو وہ متحدہ محاذ کے نمائندے کی حیثیت کے بجائے آزاد حیثیت سے انتخاب لڑے اور کھل کر متحدہ محاذ کے امیدوار کی مخالفت کرے ۔ ان میں سے کسی بھی چیز سے اس کی ساکھ پر کوئی برا اثر نہ پڑے گا ۔ یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ان کے امیدوار جیت جانے کی صورت میں ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ ذرا بھی آسان نہ ہو گی ، بلکہ وہی کچھ ہو گا جو پاکستان بننے کے بعد یہاں ہوتا آ رہا ہے ۔"

* اس میں کہا گیا ہے کہ کونسل مسلم لیگ نظریہ ٔ پاکستان کی صرف باتیں کرتی ہے ۔ وہ اس معاملے میں مخلص نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اتحاد کی گفتگو پر ابھی تک آمادہ نہیں ہوئی ہے ۔
* اس نے جی ایم سید قسم کے گروپوں سے خفیہ معاہدہ کر رکھا ہے اسی لیے وہ یوم شوکت اسلام سے الگ رہی ۔
* اس میں کنونشن لیگ کا خاصا عنصر شامل ہو گیا ہے ۔ اس صورت میں کسی بھی انتخابی محاذ میں اس کی شمولیت ملک و ملت کے لیے ہرگز مفید ثابت نہیں ہو سکتی ۔
* اس کا مزاج اقتدار پسندی ، عہد شکنی اور بے اصولی سے عبارت ہے ۔ اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا ۔
* اس میں کوئی ڈسپلن نہیں اور نہ رہنماؤں کا امیدواروں پر اتنا اثر ہے کہ وہ معاہدے کے مطابق کسی امیدوار کو انتخاب سے دستبردار ہونے پر مجبور کر سکیں ۔

* اس میں داغ دار ماضی اور مستقبل کے لیے ناپاک عزائم کے مالک اقتدار پرست لوگ اپنے لاؤ لشکر سمیت محض انتخابات جیتنے کے لیے شامل ہوئے ہیں۔
* اس کی سیاست میں عہد و پیمان شکنی جائز ہے۔اس لیے اس پر کیوں کر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔
* اس کے امیدوار جیت جانے سے اسلامی آئین کی تدوین یا اسلامی نظام کے نفاذ کی راہ ذرا بھی آسان نہ ہو گی، بلکہ وہی کچھ ہو گا جو پاکستان بننے کے بعد سے یہاں اب تک ہوتا رہا ہے۔

کیا ان تمام باتوں سے اس بات کی نفی نہیں ہو جاتی کہ مسئلہ یہ نہیں تھا کہ کونسل لیگ اتحاد کے معاملے میں مخلص نہیں تھی اور وہ اتحاد نہیں چاہتی تھی بلکہ جماعت اسلامی اسے اتحاد کے قابل ہی نہیں سمجھتی تھی اور اس سے اتحاد کو اسلامی آئین کی تدوین، اسلامی نظام کے نفاذ، نظریہ۔ پاکستان اور ملک وملت کے مفاد کے خلاف سمجھتی تھی۔اس لیے مسئلہ اس کے اتحاد پر آمادہ نہ ہونے کا نہیں، اسے اتحاد میں شامل نہ کرنے کا تھا۔یہ بات محض افترا ہے کہ اتحاد کے لیے کونسل لیگ آمادہ نہیں تھی۔واقعہ یہ ہے کہ کونسل لیگ کے رہنماؤں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ وہ اتحاد نہیں چاہتے، بلکہ جماعت اسلامی نے اتحاد میں اس کی شرکت کی ہمیشہ مخالفت کی اور اسے نظر انداز کرنے پر مصر رہے۔

"جمہوری پارٹی اور انتخابی اتحاد" کے عنوان سے مضمون نگار کا خامہ۔ عنبر فشان رقم طراز ہے:

"دوسری قابل ذکر سیاسی پارٹی "پاکستان جمہوری پارٹی" ہے۔ یہ دراصل نظام اسلام اور نواب زادہ نصراللہ خان کی عوامی لیگ پر مشتمل ہے۔ اس جماعت نے اپنی سرگرمیوں سے بحیثیت مجموعی اچھا تاثر چھوڑا ہے۔ لیکن

اس کا اندازہ انتخابی اتحاد کی صورت میں ہی ہو گا کہ اس کا ڈسپلن کتنا مضبوط ہے اور قیادت کے فیصلے کارکنوں کے لیے قابل قبول بھی ہوں گے یا نہیں؟ اس کے ساتھ بھی مفاد پرست تو نہیں لگ گئے۔ اس کے پیش نظر حقیقی معنوں میں ملک و قوم کی خدمت ہے یا بس الیکشن سے قبل کی گہما گہمی ہے۔ اس کے لیڈروں نے قومی زندگی میں بڑا صحت مند اور تعمیری رول ادا کیا ہے اور عوام کے ذہنوں میں اس سے اچھی توقعات وابستہ ہیں۔"

اگرچہ کونسل مسلم لیگ کی طرح اسے اتحاد کے معاملے میں غیر مخلص اور اسے ناقابل اعتماد تو قرار نہیں دیا کہ تاہم اعتماد کا اظہار اس پر بھی نہیں کیا۔ اس کے اخلاص، اس کے ڈسپلن، نظریہ ، پاکستان پر اس کے یقین اور قیادت کے اثر و رسوخ کے اعتراف کو انتخابات کی گہما گہمی کے بعد ان کے کردار پر مبنی قرار دیا۔ لیکن اس صورت میں کہ ان کے ڈسپلن کا اندازہ نہیں ہے۔ اس کے کارکنوں کی اطاعت شعاری کا تجربہ نہیں ہے اور ان کا اخلاص شک و شبہ سے بالاتر نہیں ہے اور ہو سکتا ہے کہ کہیں ان کے ساتھ بھی مفاد پرست لگ گئے ہوں۔ اتحاد کے معاملے میں ان کے اخلاص اور معاہدے کی پابندی اور ایفائے عہد میں ان پر بھی کامل طور پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

اب رہ گئی مرکزی جمعیت علمائے اسلام تو اس کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے:

"تیسری پارٹی جس کو سیاسی پارٹی کہنا زیادتی ہے، مرکزی جمعیت علمائے اسلام ہے۔ اس سے وابستہ علما نے سوشلزم کے خلاف لڑائی لڑنے میں گزشتہ سال بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اس بنا پر انھیں یہ خیال ہو گیا ہے کہ عوام میں ان کا بہت اثر ہے۔ لیکن ان کے ساتھ مجبوری یہ ہے کہ یہ کوئی منظم سیاسی پارٹی نہیں، کچھ علما جمع ہو گئے ہیں۔ علما کے تمام احترام کے باوجود عوام کا عام تاثر یہی ہے کہ یہ حضرات سیاسی زندگی کے لیے موزوں نہیں۔ ان کے پاس چند معروف نام ہیں اور سارا ڈھانچا انھی کے گرد قائم ہے۔ یہ کسی انتخابی اتحاد کے لیے مناسب فریق نہیں، کیوں کہ ان کے ساتھ چند قدم بھی چلا نہیں جا سکتا۔ یہ علما ہونے کی وجہ سے اپنے کو خصوصی سلوک اور ترجیح

کا مستحق گردانیں گے۔ عملاً ان کی یہ پوزیشن نہیں کہ یہ زیادہ نشستیں لے سکیں۔ اس سے پیچیدگی پیدا ہوگی۔ اگر اتحاد ہوا تو ان کی کوشش ہوگی کہ اسلام کے نام سے ان کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچے اور انھیں بھی بڑی سیاسی جماعتوں کے برابر سمجھا جائے۔ یہ ممکن نہیں اس لیے شکر رنجی لازمی ہے۔ امیدواروں کے سلسلے میں ان کا رویہ کیا ہوگا؟ کیا یہ کسی دوسرے کے لیے اپنا امیدوار بٹھانے پر آمادہ ہوں گے؟ اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن حال ہی میں شوکت اسلام کے سلسلے میں ذرا سی بات پر بڑے مقصد کو نقصان پہنچانے کا جو فعل ان سے سرزد ہوا ہے، جس کے صحیح ہونے پر ان کو اب بھی اصرار ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں بھی کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔"

اس اقتباس کی سطور میں اور بین السطور میں مرکزی جمعیت علماے اسلام کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ دفعہ وار یہ ہے؛

۱۔ مرکزی جمعیت علماے اسلام کو سیاسی پارٹی کہنا زیادتی ہے۔

۲۔ سوشل ازم کے خلاف جنگ میں کامیابی سے اس جماعت کے رہنما عوام میں اپنے رسوخ کے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا ہوگئے ہیں۔ حالانکہ یہ ان کی غلط فہمی ہے۔ عوام میں ان کا کوئی اثر و رسوخ نہیں ہے۔

۳۔ یہ منظم سیاسی پارٹی نہیں ہے۔ محض کچھ علما جمع ہوگئے ہیں۔ اس پر جماعت کا اطلاق نہیں ہوتا۔

۴۔ یہ حضرات سیاسی زندگی کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ (معلوم نہیں اپنے افکار کے لحاظ سے یا اپنے کردار کے لحاظ سے؟)

۵۔ اس کا ڈھانچا اصولوں کی بجاے چند معروف ناموں پر قائم ہے۔

۶۔ یہ کسی انتخابی اتحاد کے لیے مناسب فریق نہیں ہوسکتے۔

جماعت اسلامی کی عدالت العالیہ سے کیا خوب فیصلہ صادر ہوا ہے۔

۷۔ ان کے ساتھ چند قدم بھی نہیں چلا جاسکتا۔

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا !

۸۔ یہ اپنے آپ کو خصوصی سلوک اور ترجیح کا مستحق گردانیں گے۔

چاہتے ہیں خوب رووٴں یوں کو اسد
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

اللہ اللہ علما سے اتحاد میں کیا کیا خطرات در پیش ہیں۔

۹۔ چونکہ انتخابات میں ان کے جیتنے کی امید نہیں۔ اس لیے ان سے اتحاد میں پیچیدگی پیدا ہوگی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، محمد ایوب کھوڑو وغیرہ سے اس لیے اتحاد کیا کہ ان کے جیتنے کی امید تھی۔

۱۰۔ اتحاد کی صورت میں علما زیادہ فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں گے۔

اسلام کی تعلیم اور قرآن کے حکم کہ، "کسی مسلمان کے بارے میں بدگمانی نہ کرو بعض بدگمانیاں معصیت میں داخل ہیں"، کا کیا ہی عمدہ نمونہ جماعت اسلامی نے پیش کیا ہے۔

۱۱۔ علما کو اتنی زیادہ لفٹ نہیں دی جاسکتی کہ وہ اپنے آپ کو بڑی سیاسی جماعتوں (مثلاً جماعت اسلامی) کے برابر سمجھنے لگیں۔ اس سے شکر رنجی لازمی ہے۔

۱۲۔ اس بارے میں بھی ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا کہ یہ معاہدے کے مطابق دوسری کسی جماعت کے امیدوار کے مقابلے میں اپنے امیدوار کو بٹھانے پر آمادہ ہوں گے۔ معلوم نہیں جماعت اسلامی کو جمعیت علمائے اسلام سے کن کن مواقع پر نقض عہد اور پیمان شکنیوں کے تجربات ہوئے تھے۔

۱۳۔ یوم شوکت اسلام میں جماعت اسلامی کی عدم تقلید کا گناہ کبیرہ ان سے حال ہی میں سرزد ہو چکا ہے۔ لیکن اب تک اس کی صحت پر ان کا اصرار بدتر از گناہ کبیرہ ہے۔ اسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

۱۴۔ ان تمام خطرات، خدشات، شکایات ان کے گناہوں اور پھر ان کی صحت پر

اصرار کی معصیتوں کی بنا پر ان کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی جاسکتی!!!

اب اتحاد کے لیے میدان میں کون سی جماعت رہ گئی، جماعت اسلامی!

زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زبان کے لیے

اب "جماعت اسلامی اور انتخابی اتحاد" کے ضمن میں مضمون نگار کے افکار عالیہ ملاحظہ ہوں ارشاد ہوتا ہے:

"اگر یہ اتحاد ہوا تو جماعت اسلامی ہی اس کی سب سے بڑی فعال اور منظم پارٹی ہوگی۔ معروف مفہوم میں یہی ایک بااصول سیاسی پارٹی ہے۔ جس کے ڈسپلن کے بارے میں ہر شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کے امیدوار پارٹی کے فیصلے پر سرخم کرنے میں کوئی تکلیف محسوس نہ کریں گے، جو بھی معاہدہ ہو گا اس کی پابندی کی جائے گی، کسی اتحاد میں شریک ہونے کے لیے یہ ایک معقول اور قابل قبول فریق ہے۔

مختلف پارٹیوں کے اس مختصر جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان چاروں جماعتوں کا اتحاد بہ ظاہر ممکن العمل نہیں۔ اگر کوئی ایک ہی جماعت منظم اور اصولوں کا خیال کرنے والی ہو تو اس قسم کے اتحاد سے اسے ہی سب سے زیادہ نقصان پہنچے گا اور اتحاد کے جو فوائد حاصل ہونے چاہئیں وہ بھی اس لیے حاصل نہ ہوں گے کہ دوسرے فریقوں نے اتحاد کی اسپرٹ کو مدنظر نہ رکھا ہوگا۔"

ان ارشادات کی روشنی میں؛

۱۔ متحدہ محاذ میں جماعت اسلامی سب سے بڑی، فعال اور منظم پارٹی ہوگی۔
۲۔ جماعت اسلامی ایک بااصول سیاسی پارٹی ہے۔
۳۔ اس کا ڈسپلن مشہور ہے۔
۴۔ اس کے امیدوار اطاعت شعار ہیں۔

۵۔ اس کی طرف سے ہر معاہدے کی پابندی کی جائے گی۔
۶۔ کسی اتحاد میں شریک ہونے کے لیے یہ ایک معقول اور قابل قبول فریق ہے۔
۷۔ اتحاد سے اس منظم اور بااصول جماعت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچے گا۔

اب اتحاد ہو تو کیوں کر ہو اور کس کے ساتھ ہو۔ان اصولوں اور معیاروں پر کوئی دوسری جماعت پوری نہیں اترتی۔ایک جماعت اسلامی ہے تو اسے اس اتحاد سے نقصان پہنچ رہا ہے۔دوسری جماعتیں اپنی تنظیم، نظم وضبط، صحیح فکر، اصول پسندی، اسلامی شعور، بے داغ ماضی کے معیار اور مستقبل میں بہترین توقعات پر پوری نہیں اترتیں اور جماعت اسلامی اپنے تخت عظمت واجلال سے اتر کر ملک وقوم کی رہنمائی پر آمادہ نہیں۔جماعت اسلامی کے معیار کی کوئی دوسری جماعت تھی نہیں کہ جماعت اسلامی اس کے ساتھ اتحاد کرے۔

تجھ سا کہاں سے لائیں، سب اچھا کہیں جسے
اس صورت میں یہ اتحاد مطلوب بھی ہو تو کیوں کر ہو!

اس پر راہ کی مشکلات مستزاد واقعتاً "متحدہ محاذ" تو دور کی بات تھی، چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی اتفاق ناممکن تھا۔یہی مبصر فرماتے ہیں:

"انتخابی مہم تو بہت بعد کی بات ہے۔اگر نیت کرکے امیدواروں کی فہرست طے کرنے بیٹھ جائیں تو بھی پارٹیوں کے اتنے غیر مساوی حلقہ اثر، کارکنوں کی تعداد کے لحاظ سے اتنے بین فرق، ماضی کی خدمات کے لحاظ سے اتنے امتیاز اور زیادہ تر پارٹیوں میں ڈسپلن کے فقدان کی وجہ سے کوئی مشترکہ فہرست تیار ہونا ہی ناممکن ہے۔"

جماعتوں پر ان تبصروں کے بعد ارشاد عالی ہوتا ہے:۔

"اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک شے ناممکن العمل ہے تو اس کی خاطر یہ سارا شور وشغب کیوں؟ ہمارے سیاسی لیڈروں کو چاہیے کہ وہ عوام کو حقیقت حال سے آگاہ کریں اور بتائیں کہ یہ اتحاد سرے سے ممکن

العمل ہی نہیں اس لیے اس کے خیال میں بھی نہ رہنا چاہیے۔

ماضی میں اس سلسلے میں جو تجربات ہوئے وہ بھی اتفاق سے تلخ ہیں۔ مشرقی پاکستان میں جگتو فرنٹ کا بالآخر جو حشر ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔ ایوب خان کے مقابلے میں حزب اختلاف کے اندر جو کچھ ہوتا رہا وہ ایک طویل کہانی ہے۔ مناسب ہے کہ کوئی واقف حال سب کچھ لکھے۔ نیپ کی بد عہدی تو اپنی جگہ رہی، کراچی شہر کی حد تک یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سیٹوں کی جو تقسیم ہوتی ہے سب پارٹیوں کے پاس اس کے لحاظ سے بنیادی جمہوریت کے ایسے امیدوار تھے جو ان کی پارٹی سے متعلق ہوں اور قابل اعتماد ہوں۔ یہ گوارا نہ کیا گیا کہ شریک پارٹیوں کے قابل اعتماد افراد ہی کو ٹکٹ دیا جائے۔ بلکہ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اپنے بھتیجے بھانجے لائے گئے۔ معروف لوگوں کو ٹکٹ دے دیے گئے۔ یہ لوگ تھے جنھوں نے بعد میں اپنے ٹکٹ فروخت کیے اور لالٹین دکھا کر جیتنے والے یہ لوگ ایوب خان کے گلاب کے پھول ثابت ہوئے۔ بعض حضرات کے نزدیک یہی سیاست ہے۔"

اگر اس کے بعد بھی کسی قسم کی خوش فہمی باقی رہ جاتی ہے کہ اتحاد جماعت اسلامی چاہتی تھی اور اس کے لیے خلوص کے ساتھ داعی تھی تو اسے جماعت اسلامی کے اس مفکر اور مدبر کے یہ الفاظ بھی سن لینے چاہییں:

"ان تجربات کی روشنی میں اتحاد کو ممکن العمل سمجھنا نا سمجھی کی بات ہے۔ پارٹیوں کے موجودہ ڈسپلن اور جس طرح اب محض امیدواروں کی بنیاد پر اس میں لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ اس کی روشنی میں اس کا خیال ہی ترک کر دینا چاہیے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اتحاد مطلوب بھی ہے۔ اس اتحاد کے مطلوب ہونے کی صرف ایک ہی گنجائش ہے اور وہ یہ کہ بصورت دیگر سوشلسٹوں کے ایک قابل لحاظ قوت سے ابھر آنے کا امکان ہو۔ عام اندازہ یہ ہے کہ اگر انتخابات ہوئے اور تھوڑے بہت بھی غیر جانبدار ہوئے تو کم از کم

سوشلسٹوں کے کسی بڑی تعداد میں آنے کا امکان نہیں ۔ اکا دکا باوجود اتحاد کے بھی آسکتے ہیں اور اتحاد نہ ہوتے ہوئے بھی اکا دکا کو شکست دینے کے لیے منصوبہ بندی کی جاسکتی ہے ۔ بشرطیکہ آپس کی انتہائی کشمکش کے باوجود یہ احساس زندہ رہے کہ اصل دشمن سوشلسٹ عناصر ہیں ۔"

شاید آپ کا خیال ہو کہ اس سے صرف یہی ثابت ہوتا ہے کہ پاکستان کی سیاست کے اس دور میں اتحاد مطلوب نہیں تھا، یا بہت زیادہ مفید نہ تھا، یا وہ ناممکن الحصول تھا تو بات صرف اتنی ہی نہیں بلکہ جماعت اسلامی کے نزدیک یہ اتحاد نہ محبوب تھا نہ مطلوب، نہ مقصود نہ مفید تھا، نہ اس کا حصول ممکن تھا، بلکہ یہ اسلامی مفاد کے لیے مضر اور نقصان رساں تھا۔ اسی مفکر مضمون نگار کے الفاظ ہیں:

" درج بالا صورت میں اتحاد کوئی مطلوب شے بھی نہیں ہے ۔ اس لیے کہ اس سے ایک بڑے نقصان کا احتمال بھی ہے اور وہ یہ کہ اسلام کے نام پر موقع پرستوں اور ابن الوقتوں کی ایک ایسی تعداد منتخب ہو کر آجائے جو اسلامی نظام کا راستہ روکنے کی اپنی دیرینہ عادت سے باز نہ آئے ۔"

" یہ انتخابی اتحاد اس لیے بھی مطلوب نہیں کہ اس اتحاد کے باوجود ایک ایک حلقے سے اسلام کے نام پر ووٹ مانگنے والے کئی کئی افراد پھر بھی ہوں گے ۔ اسلام کے مخلص مجاہدین کی جدوجہد کی وجہ سے اللہ نے یہ فضل کیا ہے کہ اس ملک کی رائے عامہ اپنا ووٹ اسلام کے حق میں دے چکی ہے ۔ سوشلسٹ سوشلزم کے نام پر شاید ہی کوئی سیٹ لے سکیں ۔ ہر امیدوار خواہ اس کا ماضی کتنا ہی داغ دار کیوں نہ ہو اس نے ملک وقوم کو کتنا ہی کیوں نہ لوٹا ہو ۔ ایوب خان کو مسلط رکھنے میں کیسی ہی خدمات کیوں نہ انجام دی ہوں ۔ اس وقت اسلام کا علم بردار اور مخلص بن کر ووٹ مانگنے آئے گا ۔ اصل فیصلہ تو عوام ہی کو کرنا ہے کہ اسلام کے نام پر دھوکا کھاتے ہیں یا حقیقی نمائندوں کو منتخب کرتے ہیں ۔

ایسی صورت میں جب کہ اتحاد سے یہ صورت پیدا ہو سکتی ہے کہ

سوشلسٹ کے مقابلے میں ایک ہی اسلام کا نام لینے والا امیدوار ہو۔ اتحاد کا بہت زیادہ فائدہ نہیں۔"

بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ عدم اتحاد یا انتشار وافتراق کے ایک اہم فائدے کا ذکر رہ گیا۔ مضمون نگار کی نکتہ رسی، دیدہ وری اور اس کے تدبر اور اس کی سیاسی بصیرت کی کون ہے جو داد نہیں دے گا۔ ان افکار اعلیٰ کا کوئی جواب ہے اور جہاں تک ان کی عملی افادیت کا تعلق ہے تو وہ انتخابات کے نتیجے سے صاف معلوم ہو گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

"یہ پاکستان کے پہلے عام انتخابات ہیں۔ ساری دنیا کی نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ پہلی دفعہ یہ معلوم ہوگا کہ کس پارٹی کا کتنا اثر ہے۔ کس علاقے میں کس پارٹی کے کتنے ووٹ پڑے۔ بعد میں اس کے تجزیے ہوں گے۔ اس پر تحقیقی مقالے لکھے جائیں گے۔ پاکستان کے عوام کو بلکہ پارٹیوں کو خود یہ معلوم ہو گا کہ کسی پارٹی کی حقیقی قوت کیا ہے۔ جیتنے والے امیدواروں کی تعداد سے پارٹی پوزیشن معلوم ہوگی۔ ووٹنگ کا فیصلہ بھی معلوم ہو گا، ہو سکتا ہے کہ کوئی پارٹی جو اتحاد میں برابر کے فریق کی حیثیت سے شریک ہو کر بڑی تعداد میں نشستیں حاصل کرنے کی خواہاں ہے، عملاً دو تین نشستیں بھی حاصل نہ کر سکے۔ اتحاد ہو جانے کی صورت میں سب پر پردہ پڑ جائے گا، اور صحیح صورت حال سامنے نہ آسکے گی اور آئندہ کے لیے پھر ابہام باقی رہ جائے گا، اور بے بنیاد دعوے کیے جاتے رہیں گے۔

درج بالا گزارشات اس نتیجہ تک پہنچاتی ہے کہ جس نوعیت کے انتخابی اتحاد کا ذکر ہو رہا ہے وہ نہ مطلوب ہے نہ ممکن العمل۔"

کیا اس کے بعد بھی کہ جماعت اسلامی کے نزدیک اتحاد مطلوب و مقصود ہے، نہ مفید ہے بلکہ الٹا مضرت رساں ہے کوئی عقل مند یہ باور کر سکتا ہے کہ وہ اتحاد کی کوششوں میں مخلص تھی اور وہ واقعی دل سے چاہتی تھی کہ اسلام پسند سیاسی جماعتوں میں اتحاد نہ سہی دینی جماعتوں ہی کا متحدہ محاذ بن جائے؟

یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ مضمون ٹھیک اس وقت شائع ہوا تھا جب کراچی میں مذاکرات کا پہلا دور ختم ہوا تھا اور مختلف حلقوں میں اتحاد کا مسئلہ موضوع بنا ہوا تھا اور چند دن کے بعد لاہور میں ۲۴، ۲۵۔ جون کو مذاکرات کا دوسرا دور شروع ہونے والا تھا۔

کیا یہ بات قابل غور نہیں ہے کہ ٹھیک اسی موقعے پر ہی ان خیالات کی اشاعت کا مقصد کیا تھا۔ کیا اس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اگر جماعت اسلامی اپنی کوششوں کے مطابق مذاکرات کو ناکام بنانے میں کامیاب ہو جائے تو عوام کے لیے یہ مسئلہ کوئی اہمیت نہ رکھتا ہو اور وہ اس امر پر شور وہنگامہ برپا نہ کریں اور جماعت اسلامی کا کردار اس وقت موضوع بحث نہ بن جائے اور پھر لاہور کے مذاکرات میں جماعت اسلامی کے نمائندے کی جانب سے جمعیت علمائے پاکستان کے نمائندوں کی تحقیر کیا اسی سلسلے کی ایک کڑی اور پیشتر سے بنائے ہوئے ایک منصوبے کے مطابق نہیں تھی۔

اسی مکتبہ ٔ فکر کے ایک اور رسالے "اسوہ" کراچی نے ٹھیک انھیں دنوں جب کہ کراچی میں اتحاد کے مذاکرات ہو رہے تھے اور لاہور میں ہونے والے تھے، "انتخابی اتحاد اور معاہدے" کے عنوان سے ایک پیغام دیا۔ اس میں بھی ٹھیک انھی خیالات کا اظہار کیا گیا اور بتایا کہ:

۱۔ مختلف جماعتوں میں اتحاد اور معاہدے مختلف ضرورتوں کے تحت ہوتے ہیں اور اتفاق سے اس وقت ان میں سے کوئی ضرورت بھی موجود نہیں ہے۔

۲۔ جن مختلف جماعتوں میں اتحاد کی گفتگو ہو رہی ہے ان میں سب ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہیں اور ان جماعتوں کے مابین ایک بھی قدر مشترک نہیں ہے جن کی بنا پر اتحاد کیا جائے۔

۳۔ اس مضمون میں اس خاکسار پر راسپوتین کی پھبتی کس کر قلمی تہذیب اور

اسلامی صحافت ہی کا نمونہ نہیں پیش کیا گیا بلکہ علما کے احترام کا جو ادعا جماعت کی طرف سے کیا جاتا ہے اس کا ثبوت بھی فراہم کر دیا گیا:

• زبان بگڑی سو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

۴۔ اس کے بعد اتحاد کے سلسلے میں میری کوششوں کو سبوتاژ کرنے اور ناکام بنانے کے لیے میرے انداز فکر کا تجزیہ کیا گیا اور یہ ثابت کیا گیا کہ مختلف جماعتوں کے وسائل کی تنگ دامانی اور بد نظمی اصل محرک دعوت اتحاد ہے۔

۵۔ اتحاد کی ان مساعی میں میرا اور دوسری جماعتوں کا جذبہ، مستور اور پس پردہ خواہش یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے وسائل، اس کے اثرات، اس کی تنظیمی قوت کا سہارا لے کر اپنے کچھ امیدواروں کو کامیاب کرانے کی سبیل نکالی جائے۔

۶۔ جن حالات میں اتحاد کے لیے شور و غوغا کیا جارہا ہے ان میں کسی قسم کا کوئی انتخابی معاہدہ پاکستان میں مستحکم جمہوری سیاست کے ارتقا کے لیے سم قاتل ہے اور اس کے فوائد سے نقصانات زیادہ ہیں۔

۷۔ آخر میں اپنے اس خیال کے دلائل گنائے ہیں کہ یہ اتحاد مفید ہونے کے بجائے نقصان دہ کیوں ہوگا۔

آپ میرے ان خیالات سے متاثر نہ ہوں بلکہ یہ مقالہ پڑھ کر خود رائے قائم کر لیں۔ یہ اسلامی مفکر اور جماعت اسلامی کے جذبہ، اتحاد اور مفاد اسلامی کے ترجمان فرماتے ہیں:

"سیاسی جماعتوں میں مختلف جماعتوں کے درمیان اتحاد اور معاہدے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ تاہم یہ معاہدے اور اتحاد مخصوص حالات اور ضرورتوں کے پیش نظر ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ

"معاہدہ کرنے والی جماعتوں کو کسی ایسی مضبوط جماعت کو شکست

دینی مطلوب ہوتی جو حکومت کر رہی ہو۔ جیسے مشرقی پاکستان کا جگتو فرنٹ، یا جب کوئی مشترکہ پروگرام پیش نظر ہوتا ہے۔ مثلاً؛ "متحدہ حزب اختلاف" اور "جمہوری مجلس عمل" جو ایوبی آمریت کے خلاف وجود میں آئیں۔

ہمارا خیال ہے کہ اس وقت پاکستان میں ان دو وجوہ میں سے کوئی ایک وجہ بھی موجود نہیں ہے، نہ تو کسی مضبوط حکمران سیاسی جماعت کو شکست دینے کا مرحلہ درپیش ہے اور نہ کسی مشترکہ پروگرام کے لیے تمام سیاسی جماعتوں کو مل کر کچھ کرنا ہے بلکہ اس کے برعکس صورت حال یہ ہے کہ ایک درجن مختلف الخیال اور مختلف المشرب سیاسی جماعتیں انتخاب کے میدان میں اتری ہوئی ہیں، جن کے مقاصد اور منشور بھی ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے پروگرام اور طریقہ ہائے کار میں بھی نمایاں فرق ہے۔

تعجب ہے کہ اس صورت حال کے باوجود بھی ہر کس و ناکس کی جانب سے آئے دن انتخابی معاہدات اور اتحادات پر زور دیا جا رہا ہے۔ بعض "راسپوتین" تو اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ وہ کسی جماعت کی جانب سے انفرادی طور پر کسی مہم کے آغاز کے بھی روادار نہیں ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ سیاسی لیڈروں کو اگر چھینکنا بھی ہو تو باہم مشورے سے اور متفق ہو کر چھینکیں تاکہ اتحاد قائم رہے اور بوقت الیکشن ان کے کام آئے۔ اس طرز فکر کے تین اسباب ہیں؛

* ایک تو یہ کہ ایوبی آمریت کے خلاف اور اس کے بعد سوشلسٹ کوچہ گردی کے مقابلے میں مختلف حلقوں سے باہم مل کر آواز اٹھائی۔
* دوسرے یہ کہ اکثر حلقوں سے علاحدگی پسندی کے رجحانات کا بھی مقابلہ باہم مل کر کیا اور یہ خطرہ کسی حد تک آج بھی موجود ہے۔
* تیسرے یہ کہ اکثر جماعتوں کے دامن نہایت ہی تنگ ہیں اور ان میں سے کوئی جماعت بھی اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ تمام سیٹوں سے اپنے امیدوار کھڑے کر سکے یا معتدبہ سیٹوں پر دوسری جماعتوں کے تعاون کے بغیر اپنے

امیدواروں کو کامیاب کراسکے ۔

ہم سمجھتے ہیں کہ انتخابی اتحاد کے سلسلے میں موجودہ غوغا آرائی کے تحت صرف یہی جذبہ کار فرما ہے کیوں کہ اس سے قبل جس مقصد کے لیے اتحاد ہوا تھا یعنی بحالی جمہوریت وہ حاصل ہو چکا ہے ۔ نیز ملک میں سوشلسٹ ڈکٹیٹر شپ اور سوشلسٹ معاشی نظام کو لوگ رد کر چکے ہیں ۔ علاحدگی پسندوں اور صوبائی عصبیت پروروں کے زور میں زبردست کمی واقع ہو گئی ہے ۔ اگر یہ درست ہے کہ ملک کو اب سوشلسٹ انقلاب کا کوئی فوری خطرہ درپیش نہیں ہے اور اگر یہ درست ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان میں علاحدگی پسندوں کا زور ٹوٹ چکا ہے اور یہ دونوں باتیں یقیناً درست ہیں تو ہم سمجھتے ہیں کہ ایسے حالات میں کسی قسم کا کوئی انتخابی معاہدہ پاکستان میں مستحکم جمہوری سیاست کے ارتقا کے لیے سم قاتل ہے اور اس کے فوائد سے نقصانات زیادہ ہیں ۔ "

* " ایک تو اس لیے کہ ہمارے ملک میں نہایت ہی قلیل عرصے میں بے شمار سیاسی جماعتیں وجود میں آچکی ہیں اور ان میں سے ہر جماعت " جماعت حق " ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان کی عظیم اور طاقتور ترین جماعت ہونے کی مدعی ہے ۔ ایک درجن ایسی جماعتوں کی اصل طاقت اور حیثیت صرف اسی صورت میں سامنے آسکتی ہے کہ ہر پارٹی صرف اپنے بل بوتے پر انتخابات لڑے اور ہر سیٹ سے مقابلے کرے ۔ صرف یہی ایک ذریعہ ہے کہ جسے کام میں لا کر ہم پاکستان کی سیاسی جماعتوں کی تعداد میں کمی کر سکتے ہیں ۔ ورنہ اگر کسی ایک حلقے سے کسی جگتو فرنٹ کی کوئی ممبر جماعت دوسری چھ جماعتوں کی مدد سے کامیاب ہوتی ہے تو وہ اس زعم میں مبتلا ہو جاتی ہے اور لوگ بھی یہی سمجھتے ہیں کہ یہ جماعت اپنے بل بوتے پر کامیاب ہوئی ہے ۔ "
* " دوسرے یہ کہ ہر جماعت نے اپنا ایک منشور اور پروگرام قوم کے سامنے پیش کیا ہے اور قوم کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اسے کس منشور اور پروگرام کو صادر کرنا ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کسی حلقے سے چھ جماعتوں کا نمائندہ کامیاب ہوتا ہے ، تو اس حلقے کے ووٹروں نے کس منشور کو ووٹ دیا ۔ "
* " تیسرے یہ کہ اس ملک میں جمہوریت ناکام ہی اس لیے ہوئی کہ سالہا سال

تک جماعتی اور اصولی سیاسیات کے بجائے شخصی اور " اقتدار حصولی " سیاست کا کاروبار ہوتا رہا اور جو لوگ آج اتحاد اتحاد کا نعرہ لگا رہے ہیں، ان کے پیش نظر بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ دوسری سیاسی جماعتوں کی قوت کو کام میں لاکر اقتدار اور منصب کی کرسی تک رسائی حاصل کرلیں یا کم از کم کسی اسمبلی کے ممبر تو بن جائیں ۔ لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر جماعت اپنے اصولوں پر انفرادی طور پر میدان انتخاب میں اترے اور صرف واضح اور شدید ضرورت کی صورت ہی میں انتخابی معاہدہ ہو ۔ جہاں یہ محسوس کیا جائے کہ کسی دو یا زائد جماعتوں کا پروگرام بہت مماثل ہے تو انھیں انتخابی معاہدہ کرنے کے بجائے فی الفور ایک دوسرے میں ضم ہو جانا چاہیے ۔ " (۱)

کیا اس کے بعد بھی یہ بات مشکوک و مشتبہ رہ جاتی ہے کہ جماعت اسلامی اتحاد کے معاملے میں مخلص تھی:

چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر قریب ہے یارو روز محشر
جو چپ رہے گی زبان خنجر ، لہو پکارے گا آستیں کا

---

(۱) ماہنامہ " اسوہ ڈائجسٹ "، کراچی بابت ماہ جون ۱۹۷۰ء، صفحہ ۷ - ۸

ضمیمہ جات

ترتیب و تدوین

شاہد حسین خان

ان ضمیمہ جات کو الف، ب اور ج تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

الف کے ذیل میں جو معلومات جمع کی گئی ہیں۔ان کا تعلق تحریک جمہوریت پاکستان، انتخابات اور ان کے نتائج سے ہے۔

ب کے ضمن میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کے سیاسی افکار وعزائم اور مساعی سے متعلق چند ضروری حوالہ جات کو مرتب کر دیا گیا ہے اور

ج کے تحت مولانا مودودی کے مذہبی اور دینی عقائد کے بارے میں ان کے افادات کی تالیف عمل میں آئی ہے۔

ان تینوں دفعات کے تحت مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کے خلاف کوئی تالیف مقصود نہیں بلکہ صرف اس حد تک بعض معلومات مرتب کر دی گئی ہیں، جس حد تک مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کے ارشادات کی وضاحت اور ان کی تصویب کے لیے ضرورت تھی۔

ان میں مولانا مودودی کے بعض افکار وعقائد پر تبصرہ وتنقید بھی ہے لیکن ان میں اصل اہمیت مولانا مودودی کی تحریروں کے حوالہ جات کی ہے۔قارئین کرام تنقید وتبصرہ سے بالکل بے نیاز رہ کر حوالہ جات کی روشنی میں اپنی رائے قائم کرنے کے لیے بالکل آزاد ہیں۔

(ا۔س۔ش)

الف

تحریک جمہوریت کے آغاز سے

انتخابات کے نتائج تک

پس منظر کے چند واقعات پر ایک نظر

یوماً فیوماً

تحریک جمہوریت پاکستان کے آٹھ نکات کا ذکر پچھلے صفحات میں گزر چکا ہے اور یہ کہ تحریک جمہوریت کے آٹھ نکات میں سے کسی ایک میں بھی اسلام کا "الف" تک نہ آیا تھا۔ اور جماعت اسلامی اس اتحاد میں اپنی پوری شان کے ساتھ شریک تھی۔ اب ۱۹۶۹ء میں تحریک جمہوریت پاکستان کی پانچ جماعتوں نے مزید تین جماعتوں (نیپ ولی خان گروپ، چھ نکاتی عوامی لیگ اور جمعیت علماے اسلام ہزاروی گروپ) کے ساتھ جمہوری مجلس عمل تشکیل دی۔ اور اس نے مقاصد کا سفر شروع کیا تو اس میں بھی اسلام منزل تھا نہ، مقصود! فقط جمہوریت کی بحالی مطلوب تھی۔ جماعت اسلامی پوری تمکنت کے ساتھ ان کی شریک سفر تھی۔ مرکزی جمعیت علماے اسلام مولانا احتشام الحق تھانوی جس کے قائد تھے، اس وقت تک سرگرم عمل نہ ہوئی تھی۔ نظام اسلام پارٹی کے مرکزی جمعیت علماے اسلام سے ادغام کا واقعہ بھی اس کے بعد کا ہے۔ مرکزی جمعیت جنرل یحییٰ خان کے عہد صدارت میں سرگرم عمل ہوئی تھی۔ جب کہ انتخاب کی منزل کا اعلان ہوا تھا اور "غیر اسلام پسندوں" کے برسر اقتدار آجانے کے

خطرے نے "اسلام پسندوں" کو سراسیمہ کر دیا تھا۔

شیخ مجیب الرحمان پر ملک سے غداری کے الزام میں اگرتلہ سازش کیس چل رہا تھا اور وہ قید میں تھے۔ جمہوری مجلس عمل نے سیاسی کارکنوں کے خلاف کی جانے والی کارروائیوں کو فی الفور کالعدم قرار دیے جانے کا مطالبہ کیا تو اس میں مجیب الرحمان کی رہائی کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا۔ جنرل ایوب خان نے کہا تھا کہ مجیب الرحمان پر ملک سے غداری کے الزام میں مقدمہ عدالت میں زیر سماعت ہے، حکومت اسے مذاکرات میں حصہ لینے کے لیے پیرول پر رہا کر دے گی۔ لیکن اس کے بغاوت کے مجرم ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ عدالت ہی کرے گی۔ جمہوری مجلس عمل کے ایک رکن کی حیثیت سے جماعت اسلامی بھی مذاکرات کے لیے ۷۔ فروری کو پیش کی جانے والی شرائط کے ضمن میں شیخ مجیب الرحمان پر سے مقدمہ اٹھانے اور انھیں غیر مشروط طور پر رہا کرنے کے مطالبے پر ڈٹ گئی تھی۔ شیخ مجیب الرحمان کی رہائی سے لے کر ان کے چھ نکات اور بالآخر پاکستان کے دولخت ہونے تک کے واقعات کی ذمّے داری شیخ موصوف پر آتی ہے، تو اس میں جماعت اسلامی بھی برابر کی شریک ہے۔

مولانا احتشام الحق تھانوی، شیخ مجیب الرحمان کی رہائی کے سلسلے میں جنرل محمد ایوب خان کے موقف کو صحیح سمجھتے تھے۔ مولانا کے خیال میں شیخ صاحب کا معاملہ دوسرے سیاسی کارکنوں کے معاملے سے یک سر مختلف تھا۔ شیخ صاحب پر ملک کے خلاف سازش اور ملک سے غداری کا الزام تھا۔ جب کہ دوسرے سیاسی کارکن حکومت کے خلاف سیاسی سرگرمیوں کے الزام میں ماخوذ تھے۔ دونوں قسم کے قیدیوں کے جرائم میں زمین وآسمان کا فرق تھا۔

دوسری بات جو مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کو سخت ناپسند تھی۔ وہ "اسلام پسند" کی اصطلاح تھی۔ ایک مسلمان کے لیے "اسلام پسند" اور "غیر اسلام پسند" کی اصطلاحات نہ صرف بے معنی بلکہ باعث شرم تھیں۔ لیکن اس زمانے میں ان

اصطلاحوں کا استعمال اتنا عام ہو گیا تھا کہ افراد اور جماعتوں میں ان کے خاص ذوق ورجحان اور امتیاز کی تفریق کے لیے مولانا مرحوم خود بھی اس کے استعمال پر مجبور ہو گئے تھے۔

۴۔ جنوری سے ۲۵۔ مارچ ۱۹۶۹ء تک کے واقعات میں مولانا احتشام الحق تھانوی یا ان کی مرکزی جمعیت علمائے اسلام کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ لیکن ان کی موضوع بہ "جماعت اسلامی" کے بعد کے کردار کو سمجھنے کے لیے ان واقعات پر ایک نظر ڈال لینی ضروری ہے۔ تاکہ اندازہ کیا جاسکے کہ جماعت اسلامی کے مقاصد قیام اور اس کے اعلان شدہ "صحیح طریقہ کار" کی کس طرح یک سر قلب ماہیت ہو چکی تھی۔

یہ واقعات ہفت روزہ زندگی، لاہور کے شمارہ مورخہ ۲۔ مارچ ۱۹۷۰ء سے ماخوذ ہیں۔

۴۔ جنوری ۱۹۶۹ء تحریک جمہوریت پاکستان میں شامل پانچ جماعتوں (جماعت اسلامی، کونسل مسلم لیگ، آٹھ نکاتی عوامی لیگ، نظام اسلام اور قومی جمہوری محاذ) کے علاوہ نیپ (ولی خان گروپ) چھ نکاتی عوامی لیگ اور جمعیت علمائے اسلام ہزاروی گروپ) کے نمائندوں نے ڈھاکے میں بحالی جمہوریت کے لیے مشترکہ جدوجہد کی خاطر جمہوری مجلس عمل قائم کی۔ اس مجلس نے عام انتخابات میں حصّہ لینے کے لیے بنیادی شرائط کے طور پر آٹھ نکات ترتیب دیے۔

یکم فروری: صدر ایوب نے اپنی ماہانہ نشری تقریر میں اعلان کیا کہ وہ آئینی اور سیاسی مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے حزب اختلاف سے گفتگو کریں گے۔

۵۔ فروری: صدر ایوب خان کے نمائندے نے جمہوری مجلس عمل کے کنوینر نواب زادہ نصر اللہ خان کو ساڑھے دس بجے کے قریب پارک لگژری ہوٹل، لاہور میں مذاکرات کا دعوت نامہ دیا۔ اس میں گول میز کونفرنس کے انعقاد کی پیش کش کی گئی تھی اور اس کے لیے ۱۷۔ فروری کی تاریخ مقرر کی تھی۔ اس کانفرنس میں دوسرے

رہنماؤں اور جماعتوں کو شرکت کی دعوت دینے کا اختیار نواب زادہ صاحب کو دیا گیا تھا

۷۔ فروری: جمہوری مجلس عمل کے چار رہنماؤں مولانا مودودی، چودھری محمد علی، میاں ممتاز دولتانہ اور میاں طفیل محمد نے گول میز کانفرنس کے انعقاد کے لیے مندرجہ ذیل شرائط پیش کر دیں؛

۱۔ ہنگامی حالت فوراً ختم کر کے ڈیفنس آف پاکستان رولز ختم کیے جائیں۔

۲۔ تمام سیاسی لیڈروں اور طلبہ کو رہا کیا جائے۔

۳۔ پورے ملک سے دفعہ ۱۴۴ ہٹالی جائے۔

۴۔ تحفظ امن عامہ آرڈی ننس اور پریس آرڈی ننس کے تحت اخبارات اور سیاسی کارکنوں کے خلاف کی جانے والی کارروائیوں کو فی الفور کالعدم قرار دیا جائے۔

۵۔ طلبہ پر لاٹھی چارج کا سلسلہ ختم کیا جائے۔

۱۲۔ فروری: جمہوری مجلس عمل کی اپیل پر ملک بھر میں مکمل ہڑتال رہی۔ ایسی ہڑتال اس سے پیشتر برصغیر میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔

۱۴۔ فروری: خان عبدالولی خان، ذوالفقار علی بھٹو اور دوسرے رہنماؤں کو جمہوری مجلس عمل کی درخواست پر رہا کر دیا گیا اور ہنگامی حالت کے خاتمے کا اعلان کر دیا گیا۔ اسی روز لاڑکانہ سے جناب بھٹو نے نمائندہ "جنگ" کراچی کو انٹرویو دیتے ہوئے جمہوری مجلس عمل کے فیصلے کا خیر مقدم کیا۔

۱۶۔ فروری: جمہوری مجلس عمل نے لاہور میں دو دن تک مذاکرات کرنے کے بعد صدر کی دعوت قبول کر لی اور ان سے درخواست کی کہ وہ کانفرنس کو ۱۹۔ فروری تک ملتوی کر دیں۔

۱۷۔ فروری: جناب بھٹو نے گول میز کانفرنس میں شرکت کا فیصلہ کرنے کے

جمہوری مجلس عمل کے رہنماؤں پر شدید نکتہ چینی کی۔

۱۸۔ فروری: مجلس عمل کی سفارش پر ایوب صاحب نے آزاد رہنماؤں ایئر مارشل اصغر خان، جنرل اعظم، جسٹس مرشد پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو اور نیپ کے سربراہ بھاشانی صاحب کو دعوت نامے جاری کر دیے۔ جمہوری مجلس عمل کے رہنما کانفرنس میں شرکت کے لیے راولپنڈی پہنچ گئے۔ شیخ مجیب الرحمان نے پیرول پر رہا ہو کر کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا اور یوں معاملات ایک نازک موڑ پر آگئے۔

۱۹۔ فروری: جمہوری مجلس عمل کے رہنماؤں نے طویل بحث اور صلاح مشورے کے بعد اعلان کیا کہ شیخ مجیب الرحمان کی عدم شرکت کی وجہ سے کانفرنس نہ ہو سکے گی۔ اس لیے صرف نواب زادہ نصر اللہ خان صدر ایوب سے مل کر بات چیت کریں گے۔ حکومت کی جانب سے خواجہ شہاب الدین نے اس فیصلے کو مجلس عمل کے سابقہ فیصلے کی خلاف ورزی قرار دیا۔

۲۰۔ فروری: نواب زادہ نصر اللہ خان اور ایوب خان میں بات چیت نہ ہو سکی۔ خوفناک تعطل پیدا ہو گیا۔

۲۱۔ فروری: صدر ایوب نے ریڈیو پر قوم سے خطاب کیا اور آئندہ صدارتی انتخاب میں حصہ نہ لینے کا اعلان کر دیا۔

۲۲۔ فروری: حکومت نے اگرتلہ سازش کیس واپس لے لیا اور شیخ مجیب الرحمان رہا ہو گئے۔

۲۴۔ فروری: شیخ مجیب الرحمان گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے ڈھاکے سے روانہ ہوئے انھوں نے لاہور پہنچ کر آزاد رہنماؤں سے ملاقات کی۔

۲۵۔ فروری: شیخ مجیب الرحمان راولپنڈی پہنچ گئے اور جمہوری مجلس عمل نے ۲۶۔ فروری کو کانفرنس میں شریک ہونے کا فیصلہ کر لیا۔

۲۶۔فروری: صدر کے مہمان خانے میں گول میز کانفرنس شروع ہوئی۔اس میں آزاد رہنما اصغر خان اور جسٹس مرشد بھی شریک تھے۔یاد رہے کہ بھٹو اور بھاشانی نے کانفرنس میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا۔پہلے اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ عید الاضحیٰ کی وجہ سے اسے ۱۹۔مارچ تک ملتوی کر دیا جائے۔

۱۰۔مارچ: صبح دس بج کر باون منٹ پر گول میز کانفرنس کا دوسرا اجلاس شروع ہوا۔

۱۰۔مارچ: کو مذاکرات خوش گوار فضا میں شروع ہوئے۔مفتی محمود نے قرآن پاک کی تلاوت کی اس کے بعد صدر ایوب نے مجلس عمل کے کنونیر نواب زادہ نصر اللہ خان سے مطالبات پیش کرنے کے لیے کہا: نواب زادہ نے دو مقننہ پارلیمانی نظام اور بہ راہ راست بالغ رائے دہی مطالبات پیش کیے۔

۱۱۔مارچ: کو صدر ایوب نے کانفرنس ہال میں داخل ہوتے ہی حسب معمول ہاتھ اٹھا کر "السلام علیکم" کہا۔خواجہ خیر الدین نے جو دروازے کے بالکل سامنے بیٹھے تھے، سب کی طرف سے جواب دیا۔

۱۳۔مارچ: صدر ایوب خان نے بالغ رائے دہی کی بنیاد پر انتخابات اور پارلیمانی نظام کی بحالی کا اعلان کیا اور گول میز کانفرنس ختم ہو گئی اسی روز شیخ مجیب الرحمان جمہوری مجلس عمل سے الگ ہو گئے۔ان کے خیال میں ان کے نظریات کی حمایت نہ کر کے جمہوری مجلس نے مشرقی پاکستان کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔جمہوری مجلس عمل کے دوسرے تمام رہنماؤں اور دیگر سیاسی اکابرین نے مجلس عمل کے نتائج کا خیر مقدم کیا۔

۱۶۔مارچ: ذوالفقار علی بھٹو نے پشاور میں کہا کہ گول میز کانفرنس بحران کو ختم نہیں کر سکی۔

۱۷۔مارچ: بھاشانی صاحب نے کراچی میں اس بات کا اعلان کیا کہ انتخابات

نہیں ہونے دیے جائیں گے ، بیلٹ بکس پھینک دیں گے اور پولنگ ایجنٹوں کو زدوکوب کریں گے ۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہماری منزل پارلیمانی جمہوریت نہیں عوامی انقلاب ہے ۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے کارخانوں پر قبضہ کر لینے کی دھمکی دی

۱۸ ۔ مارچ: بھٹو صاحب نے پشاور میں بائیں بازو کی تمام جماعتوں سے اپیل کی کہ وہ متحد ہو کر موجودہ نظام کو تبدیل کریں اور اینٹ کا جواب پتھر سے دیں ۔

۲۰ ۔ مارچ: مرکزی وزیر داخلہ اے آر خان نے راولپنڈی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا اور بتایا کہ مشرقی پاکستان میں ۶۶ افراد قتل کیے جا چکے ہیں ۔ قانون کا احترام باقی نہیں رہا ۔ تشدد کو ہوا دی جا رہی ہے کسی شخص کی جان ، مال اور آبرو محفوظ نہیں ۔

۲۱ ۔ مارچ: پورے ملک میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا ۔ صدر ایوب خان مستعفی ہو گئے ۔ بری فوج کے سربراہ جنرل یحییٰ خان نے عنان حکومت سنبھال لی ۔ قافلہ جمہوریت کی راہیں ایک بار پھر دھندلا گئیں اور انتقال اقتدار کا مرحلہ دور ہو گیا ۔

تحریک جمہوریت پاکستان کے آٹھ نکات

ماخوذ

۱۹۶۷ء میں جمہوریت کی بحالی کے لیے جو تحریک منظّم ہوئی تھی، اس میں ملک کی تمام جماعتیں شامل تھیں۔ بعض حضرات کو حیرت تھی کہ اس میں جماعت اسلامی بھی شامل ہے، حالاں کہ ۱۹۶۲ء میں جب جمہوریت کی بحالی کے لیے کونسل مسلم لیگ کے رہنما، خواجہ ناظم الدین، مولوی تمیزالدین خان وغیرہ سرگرم عمل تھے اور مولانا مودودی صاحب سے پوچھا گیا تھا کہ آیا وہ اور ان کی جماعت اسلامی ان سے تعاون کرے گی تو انھوں نے جواب دیا تھا کہ مسلم لیگ سے ان کے اصولی اختلافات ہیں۔ اس کے پلیٹ فارم پر فرشتے بھی اتر آئیں تو ان سے تعاون کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت تو اس میں نظام اسلام پارٹی، قومی جمہوری محاذ اور کونسل مسلم لیگ کے علاوہ عوامی لیگ بھی شامل تھی جو آگے چل کر نیشنل عوامی پارٹی اور اس کے دو گروپوں (ولی خان گروپ اور بھاشانی گروپ) میں تقسیم ہوئی۔ ان میں سے کوئی جماعت اسلامی کے نزدیک مسلمان بھی نہ تھا۔ ان سے اتحاد کفر کے مترادف تھا۔ لیکن اب جماعت اسلامی ان سب کے ساتھ جمہوریت کی بحالی کی تحریک میں شامل تھی۔

اس سے زیادہ حیرت انگیز اور الم ناک بات یہ تھی کہ جماعت اسلامی جو حکومت الٰہیہ کے مقصد قیام کے سوا کسی اور نظام حکومت کے تصور کو "شرک فی الصفات" قرار دیتی تھی۔ اب پی ڈی ایم کی صرف اور صرف "جمہوریت" کی بحالی کی تحریک میں شریک تھی۔ جس کے نکات شیخ مجیب الرحمان کے دوستوں نے مرتب کیے تھے اور انھی کی منظوری سے پی ڈی ایم کا منشور بنا تھا۔ نواب زادہ نصر اللہ خان ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

"دس ماہ کی قید (٦٧-۱۹٦٦ء) سے رہائی ہوئی، تو ایک مشترکہ پلیٹ فارم کے قیام کی جدوجہد شروع کردی۔ ۱۹٦۷ء میں پی ڈی ایم کی تشکیل ہوئی۔ اس میں جماعت اسلامی، نظام اسلام پارٹی، قومی جمہوری محاذ، عوامی لیگ اور کونسل مسلم لیگ شامل تھیں۔ عوامی لیگ اس وقت دو گروہوں میں نہیں بٹی تھی۔ پی ڈی ایم نے آٹھ نکاتی پروگرام اپنایا۔ یہ پروگرام شیخ مجیب الرحمان کی رضامندی سے اور ان کے ہی دوستوں نے مرتب کیا تھا۔ شیخ صاحب اس وقت جیل میں تھے۔ ان سے باقاعدہ منظوری حاصل کی گئی تھی۔" (۱)

ان نکات میں حکومت الٰہیہ کے قیام یا اسلامی نظام کے نفاذ کا مطالبہ تو درکنار "اسلام" کا نام بھی نہ آیا تھا۔ تحریک جمہوریت پاکستان کے متفقہ نکات یہ تھے:

(۱) .... وفاقی پارلیمانی طرز حکومت کا قیام اور بالغ رائے دہی کے اصول پر بہ راہ راست انتخابات۔ (۲) .... مکمل علاقائی خود مختاری

(۳) .... وفاقی حکومت کے پاس صرف دفاع، خارجہ امور، کرنسی، وفاقی فنانس، بین الصوبائی مواصلات اور تجارت کے امور رہنے چاہییں۔ (۴) .... دس سال کے اندر اندر عدم مساوات کا خاتمہ۔

(۵) .... کرنسی، زرمبادلہ، مرکزی بنکاری، بیرونی تجارت، بین الصوبائی مواصلات اور تجارت کا انتظام کرنے کے لیے دونوں صوبائی اور قومی اسمبلی کے ارکان کی طرف سے منتخب شدہ بورڈ کا قیام۔

(٦) .... دس سال کے اندر سروسز میں مساوات پیدا کی جائے۔

(۷) .... دفاعی معاملات میں مساوات۔

(۸) .... ۱۹۵٦ء کے آئین کی دو سے سات تک شقوں کا نفاذ (۲)۔

حاشیہ: (۱، ۲) ۔ ہفت روزہ "زندگی" لاہور، ۲۔ مارچ ۱۹۷۰ء، ص ۱۴

رنجشیں بھلا دیجیے

وطن عزیز کو جمہوریت سے محروم رکھنے کی سازشیں ایک بار پھر عروج پر ہیں۔ تشدد پسند سیاسی رہنما اور جماعتیں ایسے حالات پیدا کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں جن میں انتخابات کا انعقاد ناممکن ہو کر رہ جائے۔ ان کی منزل اشتراکیت ہے اور اس منزل کا حصول پر امن ذرائع سے ممکن نہیں۔ ...... " لیکن ہمیں کہنے دیجیے کہ اشتراکیوں کے ان ہتھکنڈوں سے زیادہ نقصان اپنوں کی سرگرمیاں پہنچا رہی ہیں۔ وہ عناصر جو اس ملک میں جمہوریت کی بحالی اور اسلامی اقدار کی سربلندی چاہتے ہیں۔ قوم کو ایک قابل عمل دستور دینے کی تمنا کا اظہار کرتے ہیں، افسوس کہ ان میں کوئی یک جہتی اور اتحاد موجود نہیں۔ ...... "

جمہوریت نواز اور اسلام پرست حلقے اپنی صلاحیتیں اپنے ہی ہم سفروں کی ساکھ خراب کرنے میں کھپا رہے ہیں۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یہ سب حضرات جو اسلام اور جمہوریت کے گن گاتے ہیں اور ان پر عمل کرنے کے وعدے بھی کر رہے ہیں، اپنے اختلافات دور کیوں نہیں کر سکتے؟ ایک محاذ پر جمع کیوں نہیں ہو جاتے اور ان لوگوں کے خلاف متحدہ اور پرزور مہم کیوں نہیں چلاتے جو پاکستان کے ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے اور اس کی نظریاتی بنیادوں کو منہدم کرنے کے درپے ہیں؟ کچھ محب وطن سیاسی رہنما اپنے ذہنی حلیفوں کو موقع پرست قرار دے کر ان کے خلاف اعلان جہاد کر رہے ہیں، تو کچھ حضرات دوسروں پر وعدہ خلافی کے الزامات دھر رہے ہیں۔ حالانکہ یہ سب بے وقت کی راگنیاں ہیں۔ اس وقت سوال حکومت بنانے کا نہیں، پاکستان کو بچانے

کا ہے اور پاکستان کو بچانا تمام پاکستانیوں پر فرض ہے۔.....

جب جہاد فرض ہو جاتا ہے، تو قیدیوں کو بھی رہا کر کے میدان جنگ میں لا کر تلوار پکڑا دی جاتی ہے۔اب ہم عرصہ جہاد میں ہیں۔اس لیے ہر کلمہ گو کو اس جہاد میں شریک کرنا چاہیے اور اس میں حصّہ لینے کا موقع دینا چاہیے۔اس لیے ان تمام جماعتوں کو ایک متحدہ محاذ تشکیل دینا چاہیے، جو پاکستان کے لیے ایک قابل عمل، اسلامی اور جمہوری دستور کے تقاضے پر متفق ہیں۔اس طرح ان کی قوتیں ایک دوسرے کے خلاف کیچڑ اچھالنے پر ضائع نہیں ہوں گی، بلکہ وہ مثبت اور تعمیری کردار ادا کر سکیں گی۔ جمہوریت نواز اور اسلام پرست حلقوں کی "خانہ جنگی" جمہوریت دشمنوں اور اشتراکیت پسندوں کے ہاتھ مضبوط کر رہی ہے۔یہ حضرات ایک دوسرے کو بدنام کر کے کس کا کام آسان کر رہے ہیں؟ اس پر ان سب کو غور کرنا چاہیے۔

اس وقت قوم کو مولانا مودودی کے تدبر، دولتانہ کی فراست، قیوم خان کے جوش وجذبے، نصراللہ خان کی راست گوئی، میاں طفیل محمد کے اخلاص اور مولانا احتشام الحق تھانوی کی علمی متانت، ان سب کی ضرورت ہے۔ان سب رہنماؤں کو اپنی صلاحیتیں قوم کے لیے وقف کر دینی چاہییں۔اپنی باہمی رنجشیں بھلا کر ایک ہو جانا چاہیے تاکہ پاکستان ایک رہ سکے۔اگر یہ حضرات متحد نہ ہوئے تو خطرہ ہے کہ پاکستان بھی متحد نہ رہ سکے گا اور اس کی ساری ذمہ داری انھی پر عائد ہو گی۔

(اداریہ (مجیب الرحمان شامی) ہفت روزہ زندگی، لاہور

۲۷-اپریل ۱۹۷۰ء، ص ۵)

اپنے رویے کو تبدیل کیجیے!

جماعت اسلامی سے ایک گذارش

جماعت اسلامی پاکستان کی منظّم ترین سیاسی جماعت ہے۔ اس کا مقصد وطن عزیز میں حکومت الٰہیہ کا قیام اور دینی اقدار کا فروغ ہے۔ اس جماعت نے ملک میں جمہوریت کے احیاء کے لیے بے مثال جدوجہد کی ہے اور دوسری جمہوری جماعتوں کے شانہ بہ شانہ ایوبی آمریت کے بت کو پاش پاش کرنے میں اپنا حصّہ ادا کیا ہے۔ اس کے امیر دنیائے اسلام کے ممتاز عالم اور مفکّر ہیں۔ اس کے کارکنوں کی دین داری پر مخالفین بھی انگلی نہیں رکھ سکتے، لیکن گزشتہ کچھ عرصے سے انتخابی مہم کے دوران، جماعت کے مختلف اکابرین نے جس طرح کے مبالغہ آمیز دعوے شروع کیے ہیں، ان سے ہر صاحب نظر کو صدمہ پہنچا ہے۔ اس کے رہنماؤں کی طرف سے کبھی تو عوام کو یہ مژدہ سنایا جاتا ہے کہ بلوچستان میں ہماری حکومت قائم ہو جائے گی اور کبھی یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ فلاں علاقے پر ہم قبضہ کر لیں گے۔ ہمیں حیرت ہے کہ ایک ایسی سیاسی جماعت، جس کی بنیادی حیثیت دینی ہو، اس کے ذمّہ دار ارکان اس قدر غیر ذمّہ دارانہ اندازے لگا کر، خود کو خوش فہمیوں میں مبتلا کر کے اور عوام کو اپنی کامیابی کی لوریاں سنا کر آخر کون سی شے حاصل کر رہے ہیں یا کرنا چاہتے ہیں؟ جہاں تک اقتدار کا تعلق ہے اس کا حصول موجودہ حالات میں کسی نظریاتی یا اصولی جماعت کے لیے ممکن نظر

نہیں آتا۔ پھر تنہا جماعت اسلامی کی قوت اور طاقت اتنی ہے بھی نہیں کہ وہ پورے پاکستان پر اپنا پرچم لہرانے کے ذہنی سراب میں مبتلا ہو جائے۔ ہمیں توقع تھی کہ جماعت اسلامی اپنے دوسرے سیاسی حریفوں کی طرح اپنی قوت کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے یا خیال کرنے کی کوشش نہیں کرے گی، لیکن افسوس یہ تمنا پوری نہیں ہو سکی۔ اپنے تنظیمی ڈھانچے پر حد سے زیادہ اعتماد کی بدولت جہاں الیکشن میں بھاری اکثریت کے حصول کا خواب دیکھا جا رہا ہے، وہاں قوت کا بے جا زعم دوسری حلیف جماعتوں سے کاٹنے میں بھی بڑی مدد دے رہا ہے۔ شاید جماعت کے اکابرین نے یہ مفروضے قائم کر لیے ہیں کہ:

۱۔ ملک میں تحریک پاکستان کی سی فضا پیدا ہو چکی ہے اور اس تحریک کی قیادت جماعت اسلامی کے ہاتھ میں ہے۔

۲۔ اس تحریک کی بدولت کامیابی جماعت اسلامی کے قدم چومے گی۔

اس لیے کسی دوسری جماعت کے ساتھ اتحاد سے کیا فائدہ؟

ان مفروضوں کی تصدیق ہمارے پاس آنے والے ان بے شمار خطوط سے بھی ہو جاتی ہے، جو مختلف دینی اور اسلام پسند سیاسی جماعتوں کے کارکنوں اور علاقائی عہدہ داروں کی طرف سے موصول ہوتے ہیں۔ ان میں شکوہ کیا جاتا ہے کہ جماعت کے مقامی افراد، دوسری جماعتوں کو چنداں اہمیت نہیں دیتے اور ان کے ساتھ عملی طور پر ایسا سلوک روا رکھتے ہیں جیسے کوئی سخت مزاج مالک اپنے ملازم سے۔

ہم اس تلخ نوائی کی معذرت چاہتے ہیں کہ اگر معاملات کو سمجھنے کا یہ انداز جاری رہا تو اس سے کسی جماعت کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکے گا؛ البتہ نقصان پہنچنا یقینی ہے۔ کوئی اسلام پسند جماعت اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب نہیں ہو سکے گی۔ ہو سکتا ہے جماعتی کارکنوں کا یہ رویہ کسی شعوری سوچ کی پیداوار نہ ہو اور انھوں نے غیر شعوری طور پر اسے اپنا لیا ہو، لیکن ہم پورے شعور کے ساتھ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ

۱۹۷۰ء کے انتخابات کے لیے ابھی ایسی فضا پیدا نہیں ہوئی جیسی ۱۹۴۶ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت لوگوں نے مسلم لیگ کے کھمبوں کو بھی ووٹ دیے تھے، لیکن ابھی کسی کے کھمبوں کو ووٹ دینے کے لیے ذہن ہموار نہیں ہوئے۔ ملک میں کوئی نظریاتی تحریک جنم نہیں لے سکی۔ یہ تحریک چلانا کسی ایک جماعت کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لیے تمام اسلامی عناصر کو یک جا ہونا پڑے گا اور اپنی اجتماعی قوت لگا کر اجتماعی قیادت فراہم کرنی ہوگی۔ اگر حقیقی اسلام پسند جماعتیں ایک متحدہ پلیٹ فارم کی تشکیل کرکے نظریہ پاکستان کے تحفظ کی تحریک چلائیں، انتخابات میں نشستوں کے حصول کی طرف سے اپنی توجہ کچھ عرصے کے لیے ہٹالیں، تو یقین کیجیے انتخابی جنگ کا پانسہ پلٹنا اور نقشہ بدلنا ناممکن نہیں رہے گا۔ ایک طاقت ور تحریک ہی لوگوں کو یہ شعور عطا کر سکتی ہے کہ وہ صرف ان اشخاص کو ووٹ دیں، جو نظریہ پاکستان کے سپاہی ہوں۔ طاقت ور تحریک پیدا ہو جائے تو موقع پرست اور لادین عنصر کو کہیں ڈھونڈھے سے بھی جگہ نہیں ملے گی۔ اس تحریک کی حرف سے ایسے دعوے بھی کیے جاسکیں گے کہ اب پاکستان پر اسلام کا پرچم لہرا کر رہے گا اور بلوچستان یا مشرقی پاکستان نہیں، ہر جگہ اس تحریک کے سپاہیوں کو کامیابی نصیب ہوگی۔ اگر جماعت اسلامی، جماعت کے بجائے اسلام کا بول بالا چاہتی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ حقیقتاً چاہتی ہے تو پھر اسے نشستوں کے مسئلے کو بھی نظر انداز کرنا ہوگا۔ عین ممکن ہے جماعت کو ذرا کم نشستوں پر قناعت کرنی پڑے۔ اسی طرح دوسری جماعتوں کو بھی کچھ نہ کچھ قربانی دینی ہوگی۔ اس کے لیے، اسے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے اسلامی عنصر کو بھی ذہنی طور پر تیار ہو جانا چاہیے۔ جماعت اسلامی کو مضبوط تنظیم کی وجہ سے تحریک چلانے میں آگے بڑھ کر ہاتھ بٹانا چاہیے اور اپنی قوت کے غرور میں مبتلا ہونے سے بچنا چاہیے۔۔۔

کیا جماعت کے اہل نظر اس حقیقت کو بھول گئے ہیں کہ غرور کا سر نیچا ہو جاتا ہے؟

(اداریہ (مجیب الرحمان شامی) ہفت روزہ زندگی، لاہور

۱۳۔جولائی ۱۹۷۰ء، ص ۵)

جماعت اسلامی کے غلط اندازے، مغرورانہ روّیہ

اور اس کے افسوس ناک نتائج

شاہد حسین خان

خوش فہمیاں کوئی بری چیز نہیں اور اچھی آرزوئیں اور نیک تمنائیں ہی آدمی کو کرنی چاہییں، لیکن اگر حقائق کو نظرانداز کر دیا جائے تو خوش فہمیاں محض سراب ثابت ہوتی ہیں اور اچھی آرزوئیں اور نیک تمنائیں اگر جوش عمل کو متاثر اور کامیابی کے لیے ضروری سروسامان کی فراہمی سے غافل کر دیں، تو اس کے نتائج نہایت خطرناک نکلتے ہیں اور اگر خدانہ خواستہ اس میں غرور اور گھمنڈ کی آمیزش ہو جائے تو نہ صرف اس کے نتائج کی خطرناکی میں اضافہ ہو جاتا ہے بلکہ عزت سادات کے جانے کا خطرہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اگرچہ خود اعتمادی اور غرور میں فرق مشکل ہی سے محسوس ہو پاتا ہے۔ جماعت اسلامی اور اس کے رہنماؤں کے ساتھ یہ المیہ پیش آیا کہ وہ خوش فہمیوں میں مبتلا ہو گئے، حقائق کو انھوں نے نظرانداز کر دیا، غلط اندازوں کے سحر سے متاثر ہو گئے، غرور نے خود اعتمادی کا جامہ پہن لیا اور گھمنڈ نے عملی میدان کے تقاضوں کو ان کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔ وقت کے حالات کے بارے میں جماعت اسلامی کے رہنماؤں اور صحافیوں کے تجزیے اور رپورٹیں شاہد ہیں۔ مثلاً؛

۱۔ فتح تمھاری ہے (اداریہ) از مجیب الرحمان شامی (انتخابات میں متوقع کامیابی کے بارے

میں چودھری رحمت الٰہی کے بیان پر تبصرہ) ۔ زندگی ۔ لاہور، ۱۷۔ اگست ۱۹۷۰ء، ص ۶
۲۔ مشرقی پاکستان کا سیاسی جائزہ از الطاف حسن قریشی ۔ زندگی ۔ لاہور، ۱۵ ۔ نومبر ۱۹۷۰ء، ص ۷ ۔ ۱۸
۳۔ بلوچستان اور سندھ کا انتخابی جائزہ از الطاف حسن قریشی ۔ زندگی ۔ لاہور، ۲۹ ۔ نومبر ۱۹۷۰ء، ص ۷ ۔ ۱۷
۴۔ صوبہ سرحد کا انتخابی جائزہ از الطاف حسن قریشی ۔ زندگی ۔ لاہور، ۶ ۔ دسمبر ۱۹۷۰ء، ص ۱۱ ۔ ۱۸
۵۔ پنجاب کا انتخابی جائزہ از الطاف حسن قریشی ۔ زندگی ۔ لاہور، ۱۳ ۔ دسمبر ۱۹۷۰ء، ص ۵ ۔ ۱۵

ان کے علاوہ مولانا مودودی، میاں طفیل محمد اور جماعت اسلامی کے دوسرے اراکین کے بیانات، اہل قلم کے جائزوں، تبصروں اور تجزیوں نے جو آئے دن جسارت میں چھپتے تھے، عام طور پر اسلام پسندوں کو اور خصوصاً جماعت اسلامی والوں کو ایسی خوش فہمیوں میں مبتلا کر دیا تھا کہ کسی کے پیر زمین پر پڑتے نظر نہ آتے تھے ۔ آج کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ غرور اور گھمنڈ نے ان کی عقلوں پر کیسے پردے ڈال دیے تھے اور عملی دنیا اور اس کے تقاضوں سے ان لوگوں نے آرزوؤں اور تمناؤں کی دنیا کتنی دور بسائی تھی ۔ ان چند بیانات سے ان کی خوش فہمیوں کی دنیا، خوابوں کے شیش محلوں اور وزارت سازی کی حسین آرزوں کا اندازہ ہوتا ہے ۔

۱۔ ۶ دسمبر ۱۹۷۰ء کو مولانا مودودی صاحب نے ایک بیان جاری کیا ۔ فرماتے ہیں:

مجھے اپنی قوم پر اعتماد ہے!
ہارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا

کراچی، ۶ ۔ دسمبر ۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی امیر جماعت اسلامی پاکستان نے آج لاہور سے قوم کے نام درج ذیل پیغام جاری کیا ہے:

"آج قوم کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنا ہے۔ مجھے اپنی قوم پر پورا اعتماد ہے کہ ان کی عظیم اکثریت کا فیصلہ ان لوگوں کے حق میں ہو گا، جو پاکستان کو ایک متحدہ ملک رکھنا اور اسلام کا گھر بنانا چاہتے ہیں ....."

امیر جماعت اسلامی نے ایک انٹرویو میں کہا ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے چاہا تو جماعت کے نمائندے انتخابات میں کامیاب ہوں گے اور جہاں تک ہار کا سوال ہے، وہ سوشلسٹ جماعت کا ہی مقدر ہے۔"

مولانا مودودی نے کہا کہ "ماضی قریب میں اللہ تعالیٰ کی تائید سے جماعت اسلامی کی اہمیت اور مرکزیت میں روز بروز تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ان حالات میں جماعت کے ہارنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ....."

(روزنامہ "جسارت" کراچی، ۸۔ دسمبر ۱۹۷۰ء)

۲۔ محمود اعظم فاروقی نے تو جیتی جانے والی نشستوں کی تعداد بھی گن کر بتا دی تھی اور اپنی منشا کا دستور بنانے اور حکومت قائم کرنے کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ فرماتے ہیں:

۱۲۵ نشستیں لیں گے

حلقہ نمبر ۴ کراچی جماعت اسلامی کے امیدوار جناب محمود اعظم فاروقی نے آج نئی کراچی میں ایک افطار پارٹی سے خطاب کرتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا کہ انشاء اللہ ۷۔ دسمبر کے انتخابات میں جماعت اسلامی کم سے کم ایک سو پچیس نشستوں پر کامیابی حاصل کرے گی۔ اس طرح ہم آسانی سے اپنے منشاء کے مطابق آئین اور حکومت بنا سکیں گے اور ہمارا یہ اندازہ بے بنیاد نہیں۔

(روزنامہ "جنگ" کراچی، ۱۸۔ نومبر ۱۹۷۰ء)

۳۔ کراچی کے سات حلقوں سے جماعت اسلامی نے اپنے امیدوار کھڑے کیے تھے اور اسے توقع تھی کہ تمام نشستوں سے اس کے امیدوار جیت جائیں گے۔ جماعت اسلامی کے ناظم انتخابات نے اپنے ایک بیان میں کہا:

ساتوں نشستوں پر کامیابی

کراچی ٦ ۔ دسمبر (اسٹاف رپورٹر) ...... جماعت اسلامی کے ناظم انتخابات جناب سید منوّر حسن نے کہا ہے کہ گزشتہ دو دنوں کی مدت میں جو حالات رونما ہوئے ہیں ۔ اس کے نتیجے میں ساتوں نشستوں پر انشاء اللہ اب ہماری کامیابی یقینی ہو گئی ہے ۔

(روزنامہ "جسارت" کراچی، ۸ ۔ دسمبر ۱۹۷۰ء)

۴۔ سندھ میں لاڑکانہ کی نشست سے امیر جماعت اسلامی سندھ جان محمد عباسی انتخابات لڑ رہے تھے اور ان کے مقابلے میں کنونشن مسلم لیگ کے قاضی فضل اللہ اور پیپلز پارٹی کے ممتاز بھٹو تھے ۔ روزنامہ جسارت، کراچی نے ان کے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا تھا ۔

"سندھ کے مقبول ترین لیڈر"

امیر جماعت اسلامی سندھ جان محمد عبّاسی کی شخصیت پاکستان کی سیاست میں جس تیزی سے ابھری ہے اس کی مثال نہیں ملتی ۔ اس وقت وہ سندھ کے سب سے مقبول لیڈر ہیں ۔ ان کے اپنے حلقے میں مقبولیت اتنی زیادہ ہے کہ یہ دونوں جغادری سیاستدان قاضی فضل اللہ کنونشن لیگ اور ممتاز بھٹو پیپلز پارٹی بوکھلا اٹھے ہیں ۔ اس نشست سے جان محمد عبّاسی کی کامیابی یقینی ہے ۔

(روزنامہ "جسارت" کراچی، ۷ ۔ دسمبر ۱۹۷۰ء)

۵ ۔ نواب شاہ (سندھ) کے حلقے سے قومی اسمبلی کے امیدوار جماعت اسلامی کے رکن پروفیسر محمد سلیم تھے ۔ جماعت کے نزدیک ان کی کامیابی سو فی صد یقینی تھی ، لیکن افسوس کہ ان کی قسمت میں بھی ناکامی کا داغ آیا ۔ جسارت کی ایک رپورٹ میں کہا گیا تھا:

ان کی کامیابی یقینی ہو گئی

نواب شاہ، ۴۔ دسمبر (نمائندہ جسارت) آج یہاں کی تمام اسلام پسند جماعتوں کی طرف سے جماعت اسلامی کے امیدوار برائے قومی اسمبلی پروفیسر محمد سلیم کی حمایت میں ایک عظیم الشان اور تاریخی جلوس نکالا گیا۔ اس جلوس کی شان و شوکت نے یوم شوکت اسلام کی یاد تازہ کر دی۔ جلوس میں شامل ہزاروں افراد نے تین گھنٹے تک شہر کا گشت کیا اور اسلامی نظام کے حق میں ایمان افروز مظاہرہ کیا۔ اس مشترکہ جلوس میں جماعت اسلامی، پاکستان جمہوری پارٹی، جمعیت علمائے پاکستان، مرکزی جمعیت علمائے اسلام، تنظیم سرفروش، اسلامی جمعیت طلبہ اور کئی دیگر تنظیمیں شامل تھیں۔ جلوس کی قیادت پروفیسر محمد سلیم، جمعیت علمائے پاکستان کے صوبائی اسمبلی کے امیدوار شیر زماں اور جمہوری پارٹی کے محمد مشتاق ایڈوکیٹ نے کی۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ اس اجلاس سے اس شہر کی سیاسی فضا میں زبردست تبدیلی رونما ہو گئی ہے۔ تمام اسلام پسند جماعتوں اور ہزاروں افراد کی طرف سے حمایت حاصل ہو جانے کے بعد جماعت اسلامی کے امیدوار پروفیسر محمد سلیم کی کامیابی یقینی ہے۔

۶۔ پنجاب کے انتخابات کے بارے میں ہفت روزہ زندگی، لاہور کو توقع تھی کہ جماعت اسلامی ۱۹ نشستیں ضرور حاصل کرے گی۔ اس کے نزدیک تمام جماعتوں° کی متوقع کامیابی کا نقشہ یہ تھا:

۷۔ ہمارے ایک دوست کو تو اصرار ہے کہ یہ محض گپ ہے۔ لیکن سید وصی مظہر ندوی ایک سنجیدہ ندوی ہیں۔ انھوں نے جھوٹ نہیں بولا ہو گا۔ ہاں! یہ ممکن ہے کہ کسی نے مذاق کیا ہو اور انھوں نے اسے سچ سمجھ لیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ اسلام پسند ووٹرز کا مورال بلند رکھنے کے لیے ان کی زبان سے کوئی ایسا جملہ نکل گیا ہو۔ یہ "عشق اور جنگ" میں تو پہلے ہی سب کچھ جائز تھا۔ جماعت اسلامی نے "انتخاب" کو بھی اس

میں شامل کر لیا۔ اور مولانا مودودی کے یہ قول تو زندگی میں کبھی جھوٹ بھی "واجب" ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ وہی لمحہ ہو۔

لاکھوں کی پیش کش مسترد کر دیں

قومی اسمبلی کے لیے حیدر آباد سے جماعت اسلامی کے امیدوار پروفیسر سید وصی مظہر ندوی نے کہا ہے کہ جماعت اسلامی کے امیدواروں کو لاکھوں روپوں کی پیش کش کی جا رہی ہے کہ وہ الیکشن نہ لڑیں، لیکن وہ اللہ کے بھروسے اور عوام کے تعاون سے کامیاب ہوں گے۔

روزنامہ جنگ۔ کراچی، ۴۔ نومبر ۱۹۷۰ء

کامیابی کا جماعتی نقشہ

ہمارے جائزے کے مطابق پنجاب کی ۸۲ نشستوں کا نقشہ یہ ہے؛

کونسل مسلم لیگ	۲۴	آزاد	۷
جماعت اسلامی	۱۹	جمعیت علمائے اسلام	۴
قیوم لیگ	۱۰	جمہوری پارٹی	۴
پیپلز پارٹی	۶	اہل حدیث	۱
کنونشن لیگ	۷		

(ہفت روزہ زندگی، ۷ تا ۱۳۔ دسمبر، ۱۹۷۰ء)

اس توقع کے برعکس ان جماعتوں کو جو کامیابی حاصل ہوئی۔ اسے قومی اسمبلی میں کامیاب جماعتوں کے چارٹ میں دیکھا جا سکتا ہے۔

۷۔ جماعت اسلامی کے رومان پسندوں نے کامیابی کے جو حسین خواب دیکھے تھے، ان کی تعبیر یہ نکلی کہ جماعت اسلامی کے چار امیروں نے قومی اسمبلی کے انتخابات میں بری

طرح شکست کھائی ۔ ہفت روزہ "لیل ونہار" کراچی (۱۴ تا ۲۰ ۔ دسمبر ۱۹۷۰ء) نے "امیروں کے افلاس" کے عنوان سے لکھا:

یہ حضرات ناکام ہوگئے

(۱) میاں طفیل محمد ۔ نائب امیر جماعت اسلامی، پاکستان

(۲) پروفیسر غلام اعظم ۔ امیر جماعت اسلامی، مشرقی پاکستان

(۳) جان محمد عباسی ۔ امیر جماعت اسلامی، سندھ

(۴) صابر حسین شرقی ۔ امیر جماعت اسلامی، کراچی

کہاں تو صوبائی اور قومی اسمبلیوں کے مخالف امیدواروں کی ضمانتیں ضبط کروا رہے تھے ۔ کسی اسلام پسند جماعت کو خاطر میں نہ لا رہے تھے اور ان سے اتحاد وتعاون سے نقصانات کے اندازے لگائے جا رہے تھے، سوشلسٹوں کے جنازے نکا رہے تھے، صوبوں اور مرکز میں وزارتیں بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھی اور نتیجہ نکلا تو معلوم ہوا کہ اپنے لات ومنات کو بھی نہ بچاسکے ۔

الف: صوبائی اسمبلیوں کے نتائج کی یہ صورت سامنے آئی؛

مشرقی پاکستان ۱۷۱ / ۱، پنجاب ۸۰ / ۱، سندھ ۲۶ / ۲، سرحد ۲۷ / ۱ اور بلوچستان ۱۱ / ۰۰ ۔ کل ۳۳۵ نمائندے کھڑے کیے تھے ۔ صرف ۵ کامیاب ہوئے ۔

ب: قومی اسمبلی کے انتخابات میں مختلف صوبوں سے مندرجہ ذیل تعداد میں نمائندے کامیاب ہوئے؛

مشرقی پاکستان ۶۹ / ۰۰، پنجاب ۴۳ / ۱، سندھ ۱۹ / ۲، سرحد ۱۵ / ۱ اور بلوچستان ۱۱ / ۰۰ ۔ کل ۱۴۸ نمائندے کھڑے کیے تھے ۔ صرف ۴

کامیاب ہوئے۔

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ، خون نکلا!

مجیب الرحمان شامی نے زندگی کے ایک اداریے میں جماعت اسلامی کو اس کے مدعیانہ ومغرورانہ رویے پر ٹوکا تھا اور اس رویے کے نتیجے میں آنے والے خطرے سے بہت دل سوزی کے ساتھ متنبہ کیا تھا اور لکھا تھا:

"اگر جماعت اسلامی، جماعت کے بجائے اسلام کا بول بالا چاہتی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ حقیقتاً چاہتی ہے، تو پھر اسے نشستوں کے مسئلے کو بھی نظر انداز کرنا ہو گا۔ عین ممکن ہے جماعت کو ذرا کم نشستوں پر قناعت کرنی پڑے۔ اسی طرح دوسری جماعتوں کو بھی کچھ نہ کچھ قربانی دینی ہو گی۔ اس کے لیے اسے اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے اسلامی عنصر کو بھی ذہنی طور پر تیار ہو جانا چاہیے۔ جماعت اسلامی کو مضبوط تنظیم کی وجہ سے تحریک چلانے میں آگے بڑھ کر ہاتھ بٹانا چاہیے اور اپنی قوت کے غرور میں مبتلا ہونے سے بچنا چاہیے۔ کیا جماعت کے اہل نظر اس حقیقت کو بھول گئے ہیں کہ غرور کا سر نیچا ہو جاتا ہے۔"

ان مخلصانہ اور حقیقت پسندانہ خیالات پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے اور اس کا اعتراف کرنا چاہیے؛

۱۔ واقعتاً جماعت اسلامی اسلام کا نہیں صرف اپنا بول بولا چاہتی تھی۔

۲۔ اور اس تصور میں وہ قطعی مخلص تھی کہ اس نے اپنے تئیں اسلام کا مترادف سمجھ لیا تھا۔

۳۔ اس نے نشستوں کے مسئلے کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا اور وہ اپنی کامیابی کے زعم میں نشستوں پر قناعت کرنے پر تیار نہیں ہو سکی۔

۴۔ جماعت اسلامی نے اپنی مضبوط تنظیم کے غرور میں کسی دوسری جماعت کو لائق

اعتنا نہیں سمجھا اور نہ اس نے کسی دوسرے اسلامی عنصر کو تسلیم کیا، نہ اس کا ہاتھ بٹایا، بلکہ اس نے لاہور کے ایک جلسے میں جنرل سرفراز اتحاد کی ایک پارٹی کے امیدوار کے مقابلے میں ڈاکٹر جاوید اقبال کی حمایت کی، جن کا تعلق اتحاد کی کسی پارٹی سے نہ تھا اور اس طرح اپنے ووٹ صاحبزادہ۔ اقبال کے پلڑے میں ڈال دیے، جو اتنے نہ تھے کہ انھیں جتوا سکتے لیکن جنرل سرفراز کے ووٹ اتنے کم ضرور ہو گئے کہ تیسرا امیدوار جیت گیا۔

۵۔ جماعت اسلامی واقعی غرور میں مبتلا ہو گئی تھی اور اس حقیقت کو واقعی بھول گئی تھی کہ غرور کا سر نیچا ہوتا ہے اور اللہ نے اس کا سر نیچا کر دیا اور آخر کار "زندگی" کے اداریے میں جس خطرے کا اظہار کیا گیا تھا، وہ من و عن پیش آکر رہا۔

قومی اسمبلی کے انتخابات ایک نظر میں

صوبوں کے نام	نشستوں کی کل تعداد	عوامی لیگ	پاکستان پیپلز پارٹی	نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی (گروپ)	نیشنل عوامی پارٹی ولی خان گروپ	جماعت اسلامی	کونسل مسلم لیگ	کنونشن مسلم لیگ قادر گروپ	پاکستان مسلم لیگ قیوم گروپ	جمعیت العلمائے اسلام ہزاروی گروپ	جمعیت العلمائے پاکستان	پاکستان جمہوری پارٹی	آزاد امیدوار	نوٹ
	۳۱۳	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	—	۳۱۳ نشستوں میں خواتین کی ۱۳ نشستیں شامل ہیں
مشرقی پاکستان	۱۶۲	امیدوار ۱۶۲ کامیاب ۱۵۱	—	—	امیدوار ۳۶ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۶۹ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۵۰ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۹۳ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۶۵ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۱۳ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار کوئی نہیں	امیدوار ۸۱ کامیاب ۱	امیدوار ۱۰۹ کامیاب ۱	۹ متاثرہ حلقوں میں انتخابات نہیں ہو سکے
صوبہ بلوچستان	۴		—	—	امیدوار ۳ کامیاب ۳	امیدوار ۲ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۲ کامیاب کوئی نہیں		امیدوار ۳ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۳ کامیاب ۱	—	—	—	—
صوبہ سرحد	۲۵	امیدوار ۲ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۱۶ کامیاب ۱	—	امیدوار ۱۶ کامیاب ۳	امیدوار ۱۵ کامیاب ۱	امیدوار ۵ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۱ ناکام ہو گیا	امیدوار ۱۷ کامیاب ۷	امیدوار ۱۹ کامیاب ۶	امیدوار ۱ کامیاب نہیں ہوا	امیدوار ۲ کوئی کامیاب نہیں ہوا	امیدوار ۳۴ کامیاب ۷	
صوبہ سندھ	۲۷	امیدوار ۲ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۲۵ کامیاب ۱۸	امیدوار ۲ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۹ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۱۵ کامیاب ۲	امیدوار ۱۲ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۹ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۱۲ کامیاب ۱	امیدوار ۲۰ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۸ کامیاب ۳	امیدوار ۳ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۲۴ کامیاب ۳	
صوبہ پنجاب	۸۲	امیدوار ۷ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۷۷ کامیاب ۶۲	امیدوار ۶ کامیاب کوئی نہیں	—	امیدوار ۴۳ کامیاب ۱	امیدوار ۵۰ کامیاب ۷	امیدوار ۴۲ کامیاب ۲	امیدوار ۳۳ کامیاب ۱	امیدوار ۴۷ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۳۹ کامیاب ۴	امیدوار ۲۱ کامیاب کوئی نہیں	امیدوار ۱۱۳ کامیاب ۵	
مغربی پاکستان میں سیاسی پارٹیوں نے کل کتنی نشستیں حاصل کیں	۱۳۸	—	۸۱	—	۶	۴	۷	۲	۹	۸	۷	۱	۱۵	

صوبائی اسمبلیوں میں پارٹیوں کی پوزیشن

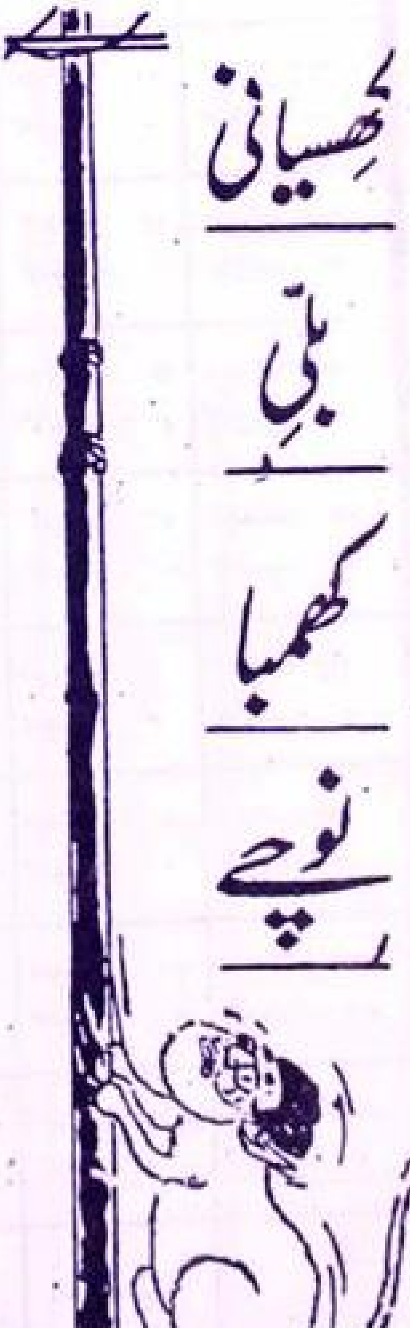
سیاسی جماعتوں کے نام	مشرقی پاکستان	پنجاب	سندھ	شمال مغربی سرحد	بلوچستان	میزان
عوامی لیگ سربراہ:۔ شیخ مجیب الرحمٰن	امیدوار: ۳۰۰ کامیاب: ۲۹۰	امیدوار: ۳ کامیاب: —	امیدوار: ۴ کامیاب: —	امیدوار: ۱ کامیاب: —	امیدوار: ۱ کامیاب: —	امیدوار: ۳۰۰ کامیاب: ۲۹۰
پاکستان پیپلز پارٹی سربراہ:۔ ذوالفقار علی بھٹو	امیدوار: ۴ کامیاب: —	امیدوار: ۱۶۳ کامیاب: ۱۱۳	امیدوار: ۴۹ کامیاب: ۳۲	امیدوار: ۳۱ کامیاب: ۳	امیدوار: ۹ کامیاب: —	امیدوار: ۲۵۱ کامیاب: ۱۴۸
قیوم مسلم لیگ سربراہ:۔ خان عبدالقیوم خان	امیدوار: ۱۳۰ کامیاب: —	امیدوار: ۶۰ کامیاب: ۹	امیدوار: ۲۳ کامیاب: ۵	امیدوار: ۳۳ کامیاب: ۱۰	امیدوار: ۱۴ کامیاب: ۳	امیدوار: ۲۸۱ کامیاب: ۲۳
کونسل مسلم لیگ سربراہ:۔ میاں ممتاز خان دولتانہ	امیدوار: ۱۱۹ کامیاب: —	امیدوار: ۱۰۶ کامیاب: ۱۵	امیدوار: ۴۹ کامیاب: ۴	امیدوار: ۸ کامیاب: ۱	امیدوار: ۱۰ کامیاب: —	امیدوار: ۲۹۳ کامیاب: ۲۰
نیشنل عوامی پارٹی سربراہ:۔ خان عبدالولی خان	امیدوار: ۱۰۹ کامیاب: ۱	امیدوار: ۴ کامیاب: —	امیدوار: ۹ کامیاب: —	امیدوار: ۳۹ کامیاب: ۱۳	امیدوار: ۱۳ کامیاب: ۸	امیدوار: ۱۷۵ کامیاب: ۲۲
جمعیت العلمائے اسلام سربراہ:۔ مولانا عبداللہ درخواستی	امیدوار: ۲۳ کامیاب: —	امیدوار: ۶۱ کامیاب: ۲	امیدوار: ۲۱ کامیاب: —	امیدوار: ۲۳ کامیاب: ۴	امیدوار: ۱۵ کامیاب: ۲	امیدوار: ۱۵۱ کامیاب: ۸
جمعیت العلمائے پاکستان سربراہ:۔ خواجہ قمرالدین سیالوی	امیدوار: — کامیاب: —	امیدوار: ۴۸ کامیاب: ۴	امیدوار: ۳۴ کامیاب: ۷	امیدوار: — کامیاب: —	امیدوار: — کامیاب: —	امیدوار: ۸۲ کامیاب: ۱۱
کنونشن مسلم لیگ سربراہ:۔ فضل القادر چودھری	امیدوار: ۲۰۶ کامیاب: —	امیدوار: ۵۲ کامیاب: ۲	امیدوار: ۶ کامیاب: —	امیدوار: ۶ کامیاب: ۲	امیدوار: — کامیاب: —	امیدوار: ۲۷۰ کامیاب: ۴
پاکستان جمہوری پارٹی سربراہ:۔ نورالامین	امیدوار: ۱۳۵ کامیاب: ۲	امیدوار: ۳۸ کامیاب: ۴	امیدوار: ۱۹ کامیاب: —	امیدوار: ۳ کامیاب: —	امیدوار: — کامیاب: —	امیدوار: ۲۱۳ کامیاب: ۶
آزاد	امیدوار: ۴۸۹ کامیاب: ۹	امیدوار: ۸۰۹ کامیاب: ۲۰	امیدوار: ۳۳۸ کامیاب: ۲	امیدوار: ۱۵۴ کامیاب: ۹	امیدوار: ۵۳ کامیاب: ۵	امیدوار: ۱۸۸۸ کامیاب: ۵۵
جماعت اسلامی سربراہ:۔ مولانا مودودی	امیدوار: ۱۸۱ کامیاب: ۱	امیدوار: ۸۰ کامیاب: ۱	امیدوار: ۳۶ کامیاب: ۱	امیدوار: ۲۶ کامیاب: ۱	امیدوار: ۱۱ کامیاب: —	امیدوار: ۳۲۵ کامیاب: ۴
صوبے کی کل نشستوں کی تعداد	۳۰۰ نشستیں، ۱۰ خواتین کے لئے مخصوص ہیں، ۱۰ حلقوں میں انتخابات نہیں ہوئے۔	۱۸۰ نشستیں	۶۰ نشستیں	۴۰ نشستیں	۲۰ نشستیں	

مولانا مودودی کا شکوہ اور جواب شکوہ

"امیر جماعت اسلامی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے صدر مملکت کے نام ایک تار میں "وسیع انتخابی دھاندلیوں" کی شکایت کرتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے کہ

"ہاتھوں پر انمٹ سیاہی مٹ جاتی ہے، جس سے ایک بڑا گروہ اپنے سابقہ تجربے کی بنا پر بوگس ووٹنگ کرا رہا ہے۔"

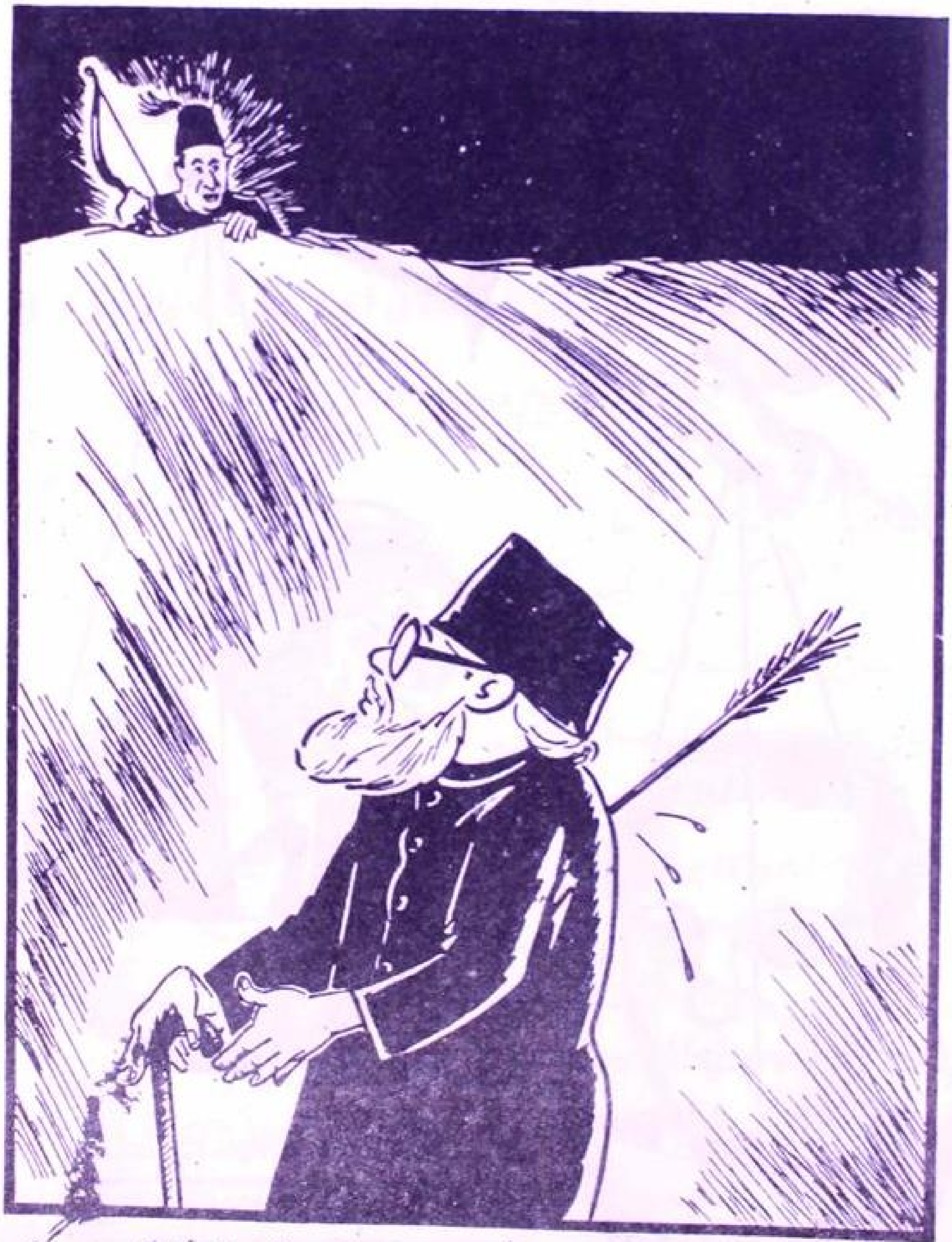
لیل ونہار کے نمائندہ خصوصی نے اس اطلاع کی اشاعت کے فوری بعد کراچی میں ممتاز سائنسدان اور پاکستان کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ کے چیرمین ڈاکٹر محمد شفقت حسین صدیقی سے ان کے دفتر میں ملاقات کی۔ روشنائی کے بارے میں یہ شکایت شام کے ایک روزنامے میں ایک روز پہلے، ۷۔ دسمبر کی سہ پہر میں ہی شائع ہو چکی تھی۔ اس سلسلے میں الیکشن کمیشن کی مستعدی یقیناً قابل داد ہے، جس کے ایک رکن جسٹس محمد اکرم نے اخبار میں اس مضمون کی شکایت دیکھتے ہی ان پولنگ اسٹیشنوں کا معائنہ کیا، جہاں کے متعلق شکایات شائع ہوئی تھی۔ اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ شکایت انتہائی مبالغہ آمیز ہے۔



ہفت روزہ لیل ونہار۔ کراچی، ۱۴ تا ۲۰۔ دسمبر ۱۹۷۰ء

یہ شذرہ لیل ونہار نے "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کے عنوان سے شائع کیا تھا اور اس کے ساتھ ایک کارٹون بھی بہ حوالہ شائع کیا تھا۔ جو اسی صفحے پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

دیکھا جو تیر کھا کے



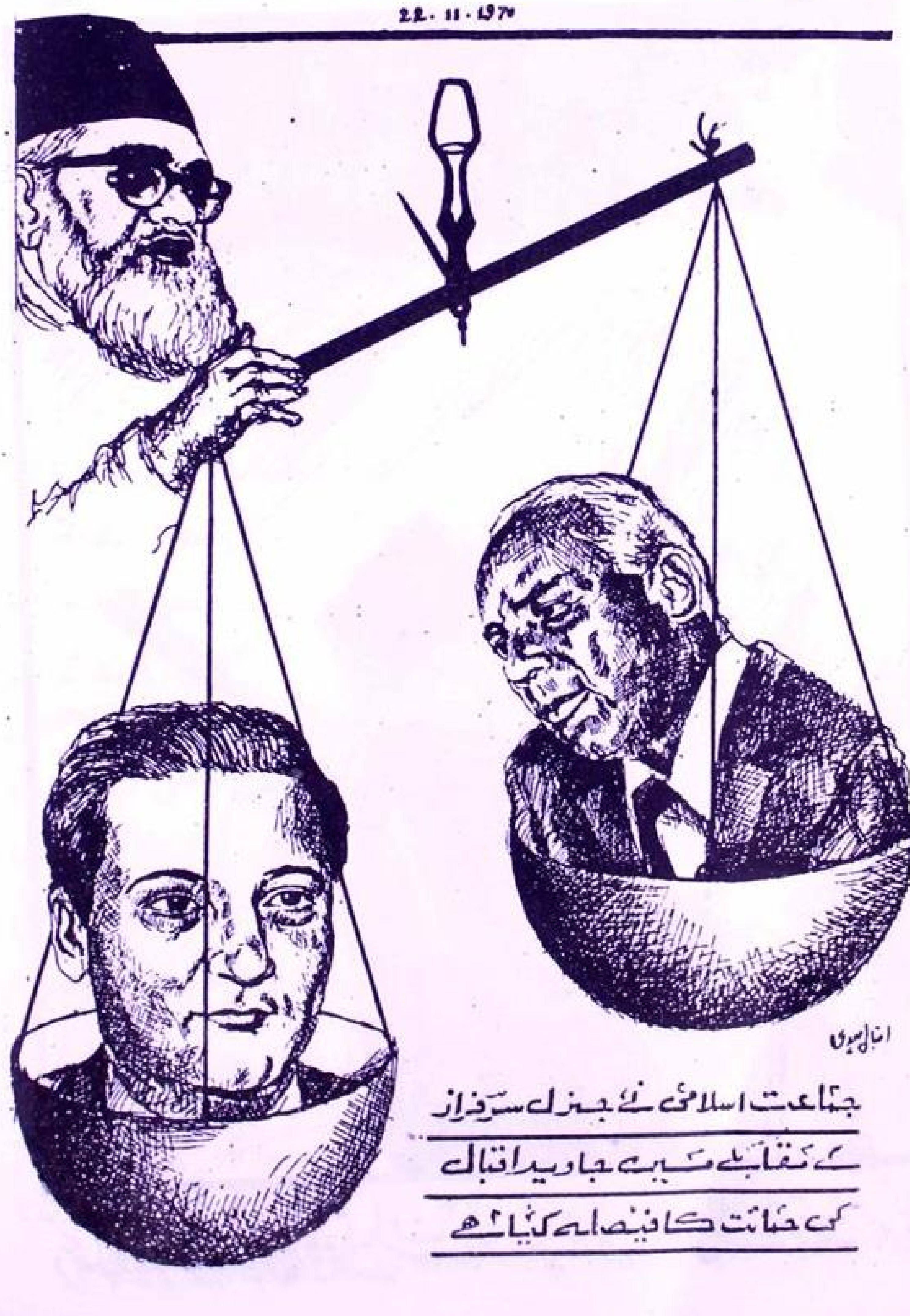
دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

جماعت اسلامی کی اصول پسندی

(ایک اور کارٹون)

THE LAILO-NAHAAR WEEKLY, KARACHI. R. L. No. S. 2744

22. 11. 1970



ب

سیاسی افکار و عقائد

فکر سے عمل تک

مسلم لیگ کی تحریکِ پاکستان اور مولانا مودودی

شیخ محمد اقبال

قیام پاکستان سے قبل

مسلم لیگ کی تحریک پاکستان اور اس کے رہنماؤں کی پراگندہ خیالی کے بارے میں جو ادارے لالہ مولانا ابوالاعلیٰ نے بکھیرے ہیں ۔ ان کا اندازہ ان کے اس بیان سے بہ خوبی ہو جاتا ہے ۔ فرماتے ہیں:

"دس سال تک مسلمانوں کی قومی تحریک اس انداز سے چلائی گئی کہ مسلمانوں کا ذہن پہلے سے زیادہ پراگندہ، ان کے اخلاق پہلے سے زیادہ خراب، اور ان کے اجتماعی اوصاف پہلے سے بھی زیادہ گئے گزرے ہو گئے ۔ مختلف خیالات، عقائد، نظریات، اغراض اور مقاصد رکھنے والے عناصر کو جمع کر لیا گیا جو اسلام کا نعرہ بلند کرنے کے ساتھ ایسی بھانت بھانت کی بولیاں بولتے رہے کہ مسلمانوں کا رہا سہا اسلامی تصور بھی دھندلا ہو گیا اور عین پاکستان بننے کے وقت بھی وہ کچھ نہ جانتے تھے کہ وہ کون سا اسلام ہو گا جس پر یہ نئی ریاست تعمیر کی جائے گی ۔ ہم نے اس پراگندہ خیالی پر بار بار ٹوکا ۔ مگر جواب میں الٹا اس بات پر فخر کیا گیا کہ ہم نے قوم کے سارے مختلف عناصر کو جمع کر کے رکھ

دیا ہے۔ حالاں کہ یہ عناصر ایک منفی جنگ کے لیے تو اکٹھے ہو سکتے تھے۔ مگر ایک ایجابی تعمیر کا مرحلہ آتے ہی ان کا منتشر اور متصادم ہو جانا بادی النظری میں یقینی تھا۔ ایسا ہی معاملہ اخلاقی اور اجتماعی حالت کا بھی تھا۔

قومی تحریک جس انداز پر چلائی جارہی تھی اس نے مسلمانوں کو اپنی جگہ پر بھی نہ ٹھیرنے دیا کجا کہ انھیں کچھ اوپر اٹھایا جاتا۔ بدترین سیرت و اخلاق کے لوگ صحافت و قیادت پر قابض ہو گئے۔ ہر میدان میں غیر مسلموں سے مسابقت شروع ہو گئی۔ ہر برائی کا جواب کار ثواب سمجھ کر برائی سے دیا جانے لگا۔ یہاں تک کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کی ضد میں گرتے گرتے اسفل السافلین تک پہنچ گئیں"

(جماعت اسلامی، اس کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل
از سید ابو الاعلیٰ مودودی، ص ۶۰، ۶۱)

قیام پاکستان کے بعد:

قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگیوں نے جس طرح گھٹیا اخلاق کا مظاہرہ کیا۔ لوٹ مار کا بازار گرم کیا اور انسانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کیے اور ان حالات میں صالحین کو اللہ تعالیٰ نے ان معصیتوں میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھا۔ اس پر مولانا مودودی صاحب نے بڑے اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ اس اطمینان میں انھیں اپنی پیشین گوئی کی صداقت سے ایک طرح کی مسرت اور فخر کا احساس ہوتا ہے۔ گویا کہ ہم نہ کہتے ہیں کہ یہ قیادت اس کی اہل ہی نہ تھی اور اس کے اخلاق و سیرت پر اعتماد کرنا ہی غلط تھا۔ اگر اس تاریکی میں روشنی کی کوئی کرن انھیں نظر آتی تھی تو وہ ان کی جماعت سے وابستہ چند صالحین تھے اور وہی ان کا سرمایہ تھے اور انھیں سے آئندہ انقلاب کی توقعات وابستہ تھیں۔ مولانا مودودی صاحب فرماتے ہیں:

"یہ سارے حالات ہمارے سامنے گزر رہے تھے اور ان کے نتائج کو

ہم خوب جانتے تھے ۔ اس لیے جس روز تقسیم ملک کا اعلان ہوا اسی وقت ہم نے سمجھ لیا کہ جیسی بری یا بھلی تعمیری سعی بھی آج تک ہم کر سکے ہیں ۔ اب اسی پر اکتفا کرنا ہو گا اور اس قوم کو سنبھالنے کی فوراً کوشش کرنی پڑے گی جو کسی واضح نصب العین کے بغیر اور کسی اخلاقی طاقت اور اجتماعی صلاح کے بغیر یک لخت بااختیار ہو گئی ہے ۔ اس فوری اقدام کی ضرورت کا احساس ان حالات کو دیکھ کر اور بھی زیادہ شدید ہو گیا جو عین تقسیم کے وقت اور اس کے معاً بعد پیش آئے ۔ "

(ایضاً، ص ۶۱)

پاکستان میں لوٹ مار اور لیگیوں کی برہنگی:

" ہندوستان کے بعض حصوں سے مسلمانوں کا خروج جس شان سے ہوا ۔ پاکستان سے غیر مسلموں کی نکاسی جس طرح عمل میں آئی ، غیر مسلموں کی چھوڑی ہوئی دولت کے ساتھ جو معاملہ کیا گیا اور مسلمان مہاجرین پاکستان میں جن حالات سے دوچار ہوئے ، یہ سب کچھ ایک ایسا آئینہ تھا جس میں پوری قوم کی ، اس کے عوام اور خواص کی ، اس کے لیڈروں اور پیشواؤں کی ، اس کے حکام اور عمال کی ، اس کے اہل دین اور اہل دنیا کی ، غرض سب ہی کی اخلاقی اور اجتماعی تصویر بالکل برہنہ نظر آگئی ۔ پھر اختیارات ہاتھ میں لیتے ہی ہماری قوم کے قائدوں نے ، جو اب قائد ہی نہیں حاکم بھی تھے ، ملک کے آئندہ نظام کے متعلق جیسی الجھی الجھی متضاد باتیں کرنی شروع کیں اور قوم جس طرح ابتدائی چند مہینوں میں ٹھنڈے دل سے ان کو سنتی رہی ، اسے دیکھ کر صاف معلوم ہو گیا کہ اس وقت ایک بے شعور قوم کی باگیں ایک بے فکر گروہ کے ہاتھ میں ہیں ۔ یہ وقت خاموش بیٹھ کر تعمیری کام میں لگے رہنے کا نہیں ہے ، اب اگر ایک لمحہ بھی ضائع کیا گیا تو بعید نہیں کہ جو لوگ منزل کا تعین کیے بغیر بے سوچے سمجھے چل پڑے تھے وہ یکایک کسی غلط نظریے کو اس نئی مملکت کی بنیاد قرار دے بیٹھیں اور پھر اس فیصلے کو بدلوانا موجودہ حالت کی بہ نسبت ہزار گنی زیادہ

قربانیوں کے بغیر ممکن نہ رہے ۔" (ایضاً، ص ۶۱، ۶۲)

غالباً انھی حالات کا اندازہ کرکے مولانا مودودی اور ان کے رفقا نے "دارالاسلام" (پٹھان کوٹ) سے راہ فرار اختیار کی تھی اور مسلمانوں کی اسی کافرانہ مملکت میں انھوں نے پناہ لی تھی، جس کی انھوں نے نہ تو کبھی آرزو کی تھی اور نہ اس کے قیام کی معصیت سے ان کا دامن تقویٰ داغ دار ہوا تھا۔

مولانا مودودی کی خوش قسمتی:

"خوش قسمتی سے اس زمانے میں متعدد آزمائشیں ایسی پیش آگئیں جن سے ہمیں تیسرے مرحلے کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے یہ اندازہ کرنے کا موقع مل گیا کہ ہماری جماعت اپنی اخلاقی تربیت اور اپنے نظم کے اعتبار سے اس وقت فی الواقع کتنی طاقت رکھتی ہے اور آگے کے مراحل میں اس پر کس حد تک اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

ان میں سے پہلی آزمائش ان لوگوں کو پیش آئی جو مشرقی پنجاب کے ہنگامہ قیامت سے گزر کر پاکستان پہنچے تھے۔ ہم نے فرداً فرداً ان کے حالات کا تفحص کیا اور یہ معلوم کرکے اطمینان ہوا کہ صرف ارکان جماعت ہی نہیں، جماعت کے ہمدرد اور متاثرین تک ہمت و جرأت اور صبر و استقلال کے ساتھ اپنا فرض انجام دے کر آئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی لیگ کے لیڈروں کی طرح بھاگنے والوں میں سب سے آگے نہ تھا۔ کسی نے بزدلی نہیں دکھائی۔ کسی نے خود غرضی سے کام نہیں لیا۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ خطرے اور مصیبت میں اپنے بھائیوں کے ساتھ رہا۔ ہر ایک نے اپنی استطاعت کی حد تک مظلوم مسلمانوں کو بچانے، سنبھالنے اور منظم طریقے سے نکلنے کی کوشش کی۔ بہت سوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر کام کیا اور اکثر و بیشتر اپنے علاقوں سے اس وقت نکلے، جب وہ مسلمانوں سے خالی ہو چکے تھے"۔ (ایضاً، ص ۶۲، ۶۳)

پاکستان میں مسلم لیگ کا کشت وخون:

"دوسری آزمائش مغربی پاکستان میں پیش آئی جہاں سے غیر مسلم نکل رہے تھے۔ یہاں بھی ہم نے پوری دقت نظر کے ساتھ جماعت کے رویے کا جائزہ لیا، اور یہ معلوم کر کے ہمیں اطمینان ہوا کہ جماعت کے ارکان ہی نہیں، ہمدردوں اور متاثرین تک میں کوئی ایسا نہ تھا جس نے کشت وخون یا لوٹ مار میں کوئی حصہ لیا ہو۔ بعض مقامات پر تو پوری پوری بستیوں میں اگر لوٹ سے بچنے والے کچھ لوگ پائے گئے تو وہ صرف وہی لوگ تھے جنھوں نے جماعت اسلامی کا اثر قبول کیا تھا۔ متعدد مقامات پر جماعت کے لوگوں نے اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر بھی غیر مسلموں کو پناہ دینے میں تامل نہ کیا اور کوئی ایک اطلاع بھی ہمیں ایسی نہیں ملی کہ جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کا دامن کسی غیر مسلم عورت کی آبروریزی سے آلودہ ہوا ہو، حالاں کہ اس کے مواقع کی اس وقت کمی نہ تھی"۔

(ایضاً، ص ۶۳، ۶۴)

مولانا مودودی کو اس بات سے بڑی خوشی ہوئی تھی کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیت کی بستیوں کو اجاڑنے، گھر بار کو لوٹنے، قتل وغارت گری کا بازار گرم کرنے اور غیر مسلم عورتوں کی آبروریزی کے واقعات میں جماعت اسلامی کا کوئی شخص ملوث نہ تھا یہ سب اعمال صالحہ مسلم لیگیوں نے انجام دیے تھے۔ ان حالات کو دیکھ کر انھوں نے فوراً اندازہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی جماعت کے ارکان وکارکنان کی ہمت اور عزم وحوصلے کی بدولت ایک دن ضرور پاکستان میں اقتدار پر قبضہ کر لیں گے اور اسلامی انقلاب برپا کر دیں گے۔ اس دوسری آزمائش سے کامیاب گزرنے پر مولانا مودودی صاحب فخریہ لکھتے ہیں:

"تیسری آزمائش اس وقت پیش آئی جب جماعت کے کارکنوں کو پناہ گزینوں کے کیمپوں میں کام کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس آخری آزمائش نے

ہمیں پوری طرح مطمئن کر دیا کہ اپنی تمام کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود جماعت اسلامی کے پاس اس وقت مردان کار کا ایک ایسا گروہ تیار ہے جس کے اخلاق اور نظم پر اعتماد کیا جاسکتا ہے ۔ لاہور، کراچی، پشاور، سیالکوٹ، سرگودھا، لائل پور، چنیوٹ اور ملتان میں مجموعی طور پر جماعت کے تقریباً سات سو ارکان اور ہمدردوں نے پناہ گزینوں کی خدمت کا کام کیا ۔ ان کارکنوں میں بہت سے وہ لوگ تھے جو خود پناہ گزین کی حیثیت سے آئے تھے اور ابھی کہیں جمنے بھی نہ پائے تھے، پھر بھی وہ خدمت کی پکار پر لبیک کہنے سے باز نہ رہے ۔ ان لوگوں نے ایثار، جفاکشی، ہمدردی، دیانت، امانت، عفت اور نظم وضبط کا پورا امتحان دیا، اور نتیجے میں کم از کم جو چیز ثابت ہوئی وہ یہ تھی کہ ان اوصاف میں نہ حکومت کے عمال ان سے کوئی نسبت رکھتے ہیں اور نہ قومی جماعتوں کے کارکن ۔ جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے سات سو آدمیوں میں سے ایک بھی ایسا نہ نکلا جو ناقابل اعتماد ثابت ہوا ہو اور جہاں تک نظم کا تعلق ہے دو تین خفیف شکایتوں سے زائد کوئی چیز ہمارے علم میں نہیں آئی ۔"

(ایضاً، ص ۶۴)

مسلم لیگ کی قیادت عظمیٰ؛
مسلمانوں کی تباہی کی ذمہ دار:

قیام پاکستان کے بعد حکومت نے جماعت اسلامی سے "ہمدردانہ برتاؤ کیا ۔ لیکن جماعت اسلامی کی نکتہ چینیاں، زبانی گفتگو اور تحریر اور تقریر میں مسلم لیگ اور حکومت پاکستان پر اسی طرح جاری رہیں (۱)، جس طرح قیام پاکستان سے پہلے تھیں بلکہ چوں کہ مودودی صاحب کا علانیہ مقصد "حکومت کی مشین پر قبضہ" کرنا تھا ۔ (۲) اس مقصد کے لیے حکومت وقت کو عوام کی نظروں میں گرا دینا بہترین طریق کار سمجھا گیا ۔ اور زبانی گفتگو کے علاوہ جماعت کے رسائل واخبارات میں حکومت کے خلاف

سخت ترین نکتہ چینی ہوئی اور سنگین ترین الزام لگائے گیے ۔ ترجمان القرآن فکری مباحث کے لیے مخصوص ہے اور عام طور پر اس سطح پر نہیں اتر آتا، جس پر کوثر، تسنیم، جہان نو اور جماعت کے دوسرے اخبارات ہیں ۔ لیکن ترجمان القرآن کا وہ پہلا نمبر پڑھیے جو قیام پاکستان کے بعد شائع ہوا ۔ اس میں سات مضامین تو ایسے ہیں جو پہلے ایک سرکاری ادارہ "ریڈیو پاکستان" پر تقریری صورت میں نشر ہوئے اور باقی تین حکومت کی مخالفت پر مبنی ہیں ۔ جس کی تان اس بات پر آکر ٹوٹتی ہے کہ مسلمانوں کی "قیادت عظمیٰ" سے زیادہ نالائق اور قوم کے لیے مضر کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی ۔ ایڈیٹوریل میں ایک عمومی تبصرے کے بعد مولانا نے سیاسی ڈرامے کے تین اداکاروں یعنی انگریزوں، کانگریس اور مسلم لیگ کے کام کا جائزہ لیا ہے ۔ اس میں وہ مسلمانوں کی "قیادت عظمیٰ" کے متعلق فرماتے ہیں:

> "اب تیسرے اداکار کو لیجیے جس کا پارٹ اس ڈرامے میں سب سے زیادہ ناکام رہا ہے ۔
>
> دس سال سے مسلمانوں کی "قیادت عظمیٰ" جس لائحہ عمل پر چل رہی تھی وہ سلطان عبدالحمید خان کی سیاست سے ملتا جلتا تھا ۔ جس طرح وہ ۳۳ سال تک محض دول یورپ کی باہمی رقابتوں سے فائدہ اٹھا کر جیتے رہے اور اس دوران میں خود ترکی کی کوئی طاقت انھوں نے نہ بنائی، جس کے بل بوتے پر وہ جی سکتا ۔ اسی طرح اس قیادت کا بھی سارا سیاسی کھیل بس انگریز اور کانگریس کی کش مکش سے فائدہ اٹھانے تک محدود تھا ۔ پورے دس سال میں اس نے خود اپنی قوم کی اخلاقی، مادی اور تنظیمی طاقت بنانے اور اس کے اندر قابل اعتماد سیرت پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہ کی، جس کی بنا پر وہ اپنے کسی مطالبے کو خود اپنی طاقت سے منوا سکتی ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جوں ہی انگریز اور کانگریس کی باہمی کشمکش ختم ہوئی، اس قیادت عظمیٰ نے اپنے آپ کو ایسی حالت میں پایا جیسے اس کے پاؤں تلے زمین نہ ہو ۔ اب وہ مجبور ہو گئی کہ جو کچھ

جن شرائط پر بھی ملے، اسے غنیمت سمجھ کر قبول کرلے۔ بنگال وپنجاب کی تقسیم اسے بے چون وچرا ماننی پڑی۔ سرحدوں کے تعین جیسے نازک مسئلے کو صرف ایک شخص پر چھوڑ دینا پڑا۔ انتقال اختیارات کے لیے جو وقت اور جو طریقہ تجویز کر دیا گیا، اسے بھی بلا تامل اس نے مان لیا۔ حالاں کہ یہ تینوں امور صریح طور پر مسلمانوں کے حق میں مہلک تھے۔ انھی کی وجہ سے ایک کروڑ مسلمانوں پر تباہی نازل ہوئی اور انھی کی وجہ سے پاکستان کی عمارت اول روز ہی سے سخت متزلزل بنیادوں پر اٹھی۔"

دنیا دار سیاسی جماعتوں کا وطیرہ ہے کہ وہ جماعتی مفاد کی خاطر بسا اوقات مخالف جماعتوں کی خوبیوں اور نیک کاموں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اور ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو بڑھا چڑھا کے بیان کرتی ہیں۔ لیکن ایک ایسی جماعت سے جو دینی نظام کی ترجمان ہو اور "صالحیت" پر بڑا زور دے۔ یہ توقع ہو سکتی ہے کہ وہ مخالفین پر نکتہ چینی کرتے وقت انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ دے گی اور جو کچھ کہے گی خوف خدا سے بیگانہ ہو کر نہ کہے گی۔ گویا کہ مولانا مودودی کے نزدیک اس برعظیم کے سیاسی ڈرامے میں "سب سے ناکام" پارٹ مسلم لیگ کا تھا (۳)۔ جماعت اسلامی کے مختلف پرچوں میں حکومت اور ارکان حکومت پر جس طرح الزام لگائے گئے، ان میں انصاف اور دیانت داری کے معمول اصولوں کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ مثلاً اسلامی جماعت کے ایک اخبار "مسلمان" کراچی میں ایک "تمثیلی افسانہ" شائع ہوا۔ عنوان تھا "کیبنٹ میٹنگ" اور اس میں "اسلامستان" کی مجلس وزرا کے ایک جلسے کی فرضی روئداد تھی۔ بظاہر تو یہ مضمون اسلامستان سے متعلق تھا۔ مگر فی الحقیقت اس میں پاکستان کے وزرا کے سر فرضی معائب تھوپنے کی کوشش کی گئی تھی۔ بلکہ نفس مضمون سے متاثر ہو کر کاتب نے ایک جگہ تو "اسلامستان" کے بجائے صاف طور پر لفظ "پاکستان" لکھ دیا۔ اسلامستان کا دارالسلطنت "چکرائی" بتایا گیا۔ جو ظاہر ہے "کراچی" کی مقلوب صورت ہے۔ مضمون کا آغاز تھا:

"مملکت اسلامستان کے پایہ تخت۔ چکرائی میں ایک عالی شان بلڈنگ ہے۔ جس کے ایک آراستہ وپیراستہ کمرے میں چند وزرائے مملکت ایک گول میز کے اطراف نہایت آرام دہ کرسیوں پر رونق افروز ہیں۔ ..... میز پر چند کاغذات کے سوا چند جام ہیں۔ جن میں قدیم صد سالہ انگوری شراب جھلکتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔"

تمام مضمون میں اسی طرح کے فرضی اور بے بنیاد اتہامات ہیں۔ مضمون کے آخر میں کہا گیا ہے:

"وزیر داخلہ: (ایک رنگین بوتل خالی کر کے میز پر زور سے پٹکتے ہوئے) "معلوم ہوتا ہے چیونٹیوں کے پر نکل رہے ہیں۔"

ان سطور میں اسلامستان (یعنی پاکستان) کے وزیر داخلہ سے "رنگین بوتل" کا انتساب ظاہر ہے ایک پابند صوم وصلوۃ مسلمان پر بہتان تھا۔

اسی طرح کے بے بنیاد اتہام مسلمان، کوثر اور تسنیم میں مسلم خواتین نیشنل گارڈز کے متعلق شائع ہوا۔ جس میں کہا گیا تھا:

"ویمنز نیشنل گارڈز کی کچھ لڑکیوں نے ڈاکٹری اور نرسنگ کے لیے اپنی خدمات پیش کیں اور جب ان کا معائنہ کیا گیا تو ان میں ۵۰ فی صد ایسی پائی گئیں جن کا شیشہ عصمت چور تھا۔"

"یہ خبر بالکل بے بنیاد تھی۔ جب حکومت پنجاب نے اس کے متعلق کوثر سے جواب طلب کیا تو اس اخبار نے بڑے معصومانہ انداز میں لکھا کہ اگر یہ خبر غلط ہے تو ہم اس کی تردید شائع کرنے کے لیے تیار ہیں۔ کوثر کے ایڈیٹر صاحب اسلامی نظام کے پرجوش ترجمان ہیں، اور بہتان وتہمت کے متعلق اسلامی اخلاق کے تقاضے دنیاداروں کے اصولوں سے کہیں زیادہ کڑے ہیں۔ لیکن مغرب میں بھی (جو اسلامی جماعت کے نزدیک فقط برائیوں کا مجموعہ ہے) ذمہ دار صحافت کا یہ پہلا اصول ہے کہ جب ایک اخبار کوئی خبر شائع کرتا ہے تو یہ اس اخبار کی ذمے داری ہے کہ وہ خبر کے صحیح ہونے کی

تحقیق کرے۔ بالخصوص جب خبر بھی ایسی ہو کہ اس میں شریف خواتین پر پرلے درجے کے رکیک الزامات لگائے گیے ہوں، اسلامی اخلاق میں اس طرح کے بہتان لگانے سے بدتر کوئی جرم نہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ اسلامی نظام کے ترجمان اخبارات نے یہ بہتان بغیر ذرہ بھر تحقیق و تفتیش کے شائع کیے اور وہ معمولی احتیاط بھی نہ برتی جو مغربی اخبارات صحافت کے ادنا اصولوں کی بنا پر ضروری سمجھتے ہیں۔"

یہ خدمت گذاری تو خیر ان اخبارات کے ایڈیٹروں بلکہ ایک ہی ایڈیٹر مولانا نصر اللہ خان عزیز، جماعت اسلامی کے بابائے صحافت کی تھی۔ جماعت اسلامی کے امیر بلکہ بہ زعم خود امیر المومنین مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کا پیمانہ اخلاق بھی اس سے کچھ زیادہ بلند نہ تھا۔ شیخ محمد اقبال لکھتے ہیں:

"لیکن افسوس ہے کہ حکومت کے متعلق الزامات لگانے میں وہ بھی اس احتیاط اور تامل سے کام نہیں لیتے جس کی مولانا جیسے پایے کے بزرگ سے توقع ہونی چاہیے۔ خان لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان کے امریکی دورے کے متعلق انھوں نے کراچی کے ایک جلسے میں کہا کہ وزیر اعظم کے دورہ امریکہ پر ۲۵ لاکھ روپے خرچ آئے۔ خود شہید ملت نے کراچی کے جلسہ عام میں اس کی تردید کی اور کہا:

> "یہاں ایک مولانا صاحب تشریف لائے۔ انھوں نے کہا میں نے اپنے دورہ امریکہ پر پچیس لاکھ روپیہ صرف کیا ہے۔ اس الزام میں پانچ فی صد بھی صداقت نہیں .... ہم علما کا احترام کرتے ہیں، لیکن اگر علما ہی جھوٹ پر اتر آئیں تو ملت کا خدا حافظ۔" (۴)

مولانا کی انتہا پسندی کا یہ عالم ہے کہ سید سلیمان ندوی جیسے مربیان ندوہ کو بھی ان کے طریق کار سے اختلاف کرنا پڑا۔ مثلاً اسلامی نظریہ سیاست کے مقدمے میں انھوں نے (نام لیے بغیر) ان اصولوں کے خلاف اظہار خیال کیا۔ جو نظام سیاسی کے متعلق جماعت اسلامی سے منسوب کیے جاتے ہیں (۵)۔ اور جیسا کہ مولانا مناظر احسن

گیلانی نے ایک سلسلہ، مضامین میں کہا عام طور پر سید سلیمان ندوی کو جماعت کے مخالفین میں شمار کیا جاتا ہے (۶)۔

ایک نیا فتنہ، خارجیت:

سید سلیمان ندوی تو اب پاکستان آگئے ہیں۔ ہندوستان میں اس وقت دارالمصنفین کے سرپرست، رسالہ معارف کے نگراں اور ندوی طریق خیال کے سب سے بااثر ترجمان مولانا عبدالماجد دریا بادی ہیں۔ انھوں نے ایک زمانے میں مولانا مودودی کے لیے "متکلم اسلام" کا خطاب وضع کیا تھا۔ لیکن ان کے بعد کے خیالات واقدامات سے وہ اس طرح برگشتہ ہوئے، کہ اب وہ مولانا مودودی کی تحریک کو ہمیشہ خارجیت سے تشبیہہ دیتے ہیں۔ (یہ تشبیہہ بعض اعتبارات سے موزوں ہے۔ کیوں کہ خوارج کی جماعت، علم وفضل زہد وتقویٰ اور غیرت دینی کی نمائش کے باوجود اسلامی حکومت اور مسلم معاشرے کے لیے نہایت مضرت رساں اور فتنہ پرور تھی (۷)۔

مولانا عبدالباری ندوی کا بیان:

ارباب ندوہ میں مولانا عبدالباری کا جو مرتبہ ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ وہ ایک صاحب تقویٰ بزرگ اور اسلامی طریق کار کے شیدائی ہیں۔ انھوں نے جماعت اسلامی کی ان کوششوں کی علانیہ تعریف کی ہے۔ جو اس نے نئے طبقے میں اسلام کا پیغام پہنچانے کے سلسلے میں کیں۔ لیکن مولانا مودودی اور ان کے رفقائے کار کا ذہنی تجزیہ ان کے قلم سے پڑھیے:

> " بلاشبہ جماعت کے بانی اور بہت سے اساطین خود علمی و عملی تربیت وصحبت سے محروم ہونے اور نرے کتابی علم وذہانت کے زور میں کہیں سے کہیں نکل گئے اور بہت سی مہلک بے اعتدالیوں کا شکار ہو کر اپنے اور

دوسروں کے لیے "نیم ملا خطرہ ایمان" بن گئے ہیں" (۸)۔

اسلامی جماعت کے بنیادی نظریہ، "حکومت الہیہ" کو بھی مولانا عبدالباری مذہب اسلام کا جزو نہیں سمجھتے۔ وہ ایک خط میں مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں:

"پچھلے صدق میں آپ کے صوفی نذیر احمد صاحب نے خاکسار کے بالکل دل کی اور بڑے پتے کی بات کہہ دی کہ حکومت الہیہ دین کے اصلی اجزا میں سے نہیں۔ جزاہ اللہ (۹)۔

علامہ مناظر احسن گیلانی مدظلہ، کے ارشادات:

دور حاضر کے علما میں مولانا مناظر احسن صاحب ایک بڑے پایے کے بزرگ ہیں۔ نہ صرف ان کی نظر قدیم عربی کتب پر بڑی گہری ہے۔ بلکہ خدا نے انھیں ذہن رسا اور ایک دل نشیں انداز تحریر عطا کیا ہے۔ وہ مولانا مودودی کو ایام حیدرآباد سے جانتے ہیں۔ ان کے قدردانوں میں سے ہیں اور ایک مرتبہ صدق جدید میں انھوں نے جماعت اسلامی کے آئندہ طرز عمل کی نسبت اپنے خدشات بیان کیے۔

۱۹۵۱ء میں مولانا مودودی نے ایک ایسے مسئلے پر قلم اٹھایا، جو ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ جون ۱۹۵۱ء کے ترجمان القرآن میں ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مودودی نے لکھا:

"جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ قرآن کا منشا یہی ہے کہ دارالاسلام اور دارالکفر کے مسلمانوں میں وراثت اور شادی بیاہ کے تعلقات نہ ہوں۔"

بلکہ یہ بھی لکھ دیا۔

"اگر زوجین میں سے ایک دارالاسلام میں ہجرت کر آیا ہے اور دوسرا ہجرت پر تیار نہ ہو تو عدالت میں اس بنیاد پر درخواست دی جاسکتی ہے اور ایسے زوجین کا نکاح فسخ کیا جاسکتا ہے۔"

ہمہ گیر اسٹیٹ:

جمہور کے متعلق مولانا مودودی کا جو نقطہ۔ نظر ہے۔ اس کا تقاضہ تھا کہ ان کی "اسلامی حکومت" ایک ہمہ گیر (Totalitarian State) قسم کی حکومت ہو۔ وہ خود اس مسئلے پر "اسلام کا نظریہ۔ سیاسی" میں فرماتے ہیں:

> "اس نوعیت کا اسٹیٹ ظاہر ہے کہ اپنے عمل کے دائرے کو محدود نہیں کر سکتا۔ یہ ہمہ گیر اور کلی اسٹیٹ ہے۔ اس کا دائرہ۔ عمل پوری انسانی زندگی پر محیط ہے۔ یہ تمدن کے ہر شعبے کو اپنے مخصوص اخلاقی نظریے اور اصلاحی پروگرام کے متعلق ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کوئی شخص اپنے کسی معاملے کو پرائیویٹ اور شخصی (PERSONAL) نہیں کہہ سکتا اس لحاظ سے یہ اسٹیٹ فاشستی اور اشتراکی حکومتوں سے یک گونہ مماثلت رکھتا ہے" (۱۰)۔

اسلامی حکومت میں مسلمان ذمی:

مولانا مودودی کی "اسلامی حکومت" میں ان مسلمانوں سے جو "اسلامی جماعت" کے پوری طرح ہم خیال نہیں، کیا سلوک ہو گا۔ اس کی توضیح خود مولانا "اسلام کا نظریہ۔ سیاسی" میں یوں فرماتے ہیں:

> "دوسری بات جو اسلامی اسٹیٹ کے دستور اور اس کے مقصد اور اس کی اصلاحی نوعیت پر غور کرنے سے خود بخود واضح ہو جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ایسے اسٹیٹ کو صرف وہی لوگ چلا سکتے ہیں جو اس کے دستور پر ایمان رکھتے ہوں۔ جنھوں نے اس کے مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا ہو اور جو اس کے اصلاحی پروگرام سے نہ صرف پوری طرح متفق ہوں، نہ صرف اس میں کامل عقیدہ رکھتے ہوں، بلکہ اس کی اسپرٹ کو اچھی طرح سمجھتے ہوں اور اس کی تفصیلات سے واقف بھی ہوں۔ اسلام نے اس باب میں کوئی نسلی، جغرافی،

لونی یا لسانی قید نہیں رکھی ہے۔ وہ تمام انسانوں کے سامنے اپنے دستور اپنے مقصد اور اپنے فلاحی پروگرام کو پیش کرتا ہے۔ جو شخص بھی اسے قبول کرلے خواہ وہ کسی نسل، کسی ملک اور کسی قوم سے تعلق رکھتا ہو۔ وہ اس جماعت میں شریک ہو سکتا ہے۔ جو اس اسٹیٹ کو چلانے کے لیے بنائی گئی ہے۔ مگر جو اسے قبول نہ کرے اسے اسٹیٹ کے کام میں دخیل نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اسٹیٹ کے حدود میں ذمی (SUBJECT) کی حیثیت سے رہ سکتا ہے۔ اس کے لیے اسلام کے قانون میں معین حقوق اور مراعات موجود ہیں۔ اس کی جان و مال اور عزت کی پوری حفاظت کی جائے گی اور اگر وہ کسی خدمت کا اہل ہو گا تو اس سے یہ خدمت بھی لی جائے گی۔ لیکن بہر حال حکومت میں شریک کی حیثیت نہیں دی جائے گی۔ کیوں کہ یہ ایک خاص مسلک رکھنے والی پارٹی کا اسٹیٹ ہے۔" (۱۱)

(جماعت اسلامی پر ایک نظر از شیخ محمد اقبال، ص ۵۸ تا ۱۰۹)

---

(۱) آج نواب صاحب ممدوٹ اور جماعت اسلامی کے درمیان (مرکز کی مخالفت کی بنا پر) اشتراک عمل کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔ لیکن پاکستان میں آنے کے بعد مولانا نے نواب صاحب سے پہلی ملاقات کے بعد جن خیالات کا اظہار کیا وہ میاں طفیل محمد صاحب قیم جماعت اسلامی کی زبانی سنیے، جو "قاصد" کے "کشمیر نمبر" میں فرماتے ہیں:

" مولانا کا تاثر یہ تھا کہ برسر اقتدار گروہ اس قدر خود غرضی میں مبتلا ہے کہ اگر کبھی اسے اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے پوری قوم کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت پیش آئی تو وہ اس سے بھی باز نہ رہے گا۔"

(۲) ترجمان القرآن، دسمبر ۱۹۳۷ء (۳) قائد اعظم اس وقت زندہ تھے اور یہ اشارہ صاف طور پر انھی کی طرف ہے۔ (۴) روزنامہ امروز۔ لاہور، ۱۷۔ اگست ۱۹۵۰ء (۵) ملاحظہ ہو۔ آفاق۔ لاہور، ۸۔ جنوری ۱۹۵۰ء میں مولانا محمد

سرور کا مضمون "مولانا سید سلیمان ندوی کے ارشادات، کاش جماعت اسلامی کے بزرگ ان پر غور کریں"! (٦) مولانا دریا بادی کے خیالات کے مطالعے کے لیے ملاحظہ ہو۔ صدق جدید لکھنو ١٨۔ اگست ١٩٥٠ء (٧) صدق جدید، لکھنو .... (٨) صدق جدید۔ لکھنو ٩۔ فروری ١٩٥١ء (٩) صدق جدید۔ لکھنو ٩۔ فروری ١٩٥١ء (١٠) اسلام کا نظریہ سیاسی، ٣٤۔ ٣٥، ہمہ گیر ریاست (Totalitatian State) کی تشریح میں محمد صدیق قریشی نے ان الفاظ میں کی ہے۔ "ریاست جہاں حکومت آمرانہ طرز پر کام کرے اور اسے آئینی قانون اور شعار انسانی تنظیم اور سیاسی، اقتصادی ذہنی اور اخلاقی سرگرمیوں کے تمام شعبوں پر لامحدود اختیارات تفویض کرتے ہیں۔"

(کشاف اصطلاحات سیاسیات، حصہ دوم)

(١١) اسلام کا نظریہ سیاسی، ص ٣٥ و ٩٦

مولانا مودودی کے چند سیاسی عقائد

شاہد حسین خان

اسمبلیوں کی رکنیت حرام ہے:

مولانا مودودی صاحب کی نظر میں ہندوستان، پاکستان میں جمہوری بنیادوں پر جو اسمبلیاں قائم ہیں، ان کا رکن بننا اور ان کے قیام کے لیے ووٹ دینا، دونوں حرام ہیں۔ مولانا ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں:

"موجودہ زمانے میں جتنے جمہوری نظام بنے ہیں کہ جن کی ایک شاخ ہندوستان کی موجودہ اسمبلیاں بھی ہیں۔ وہ اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ باشندگان ملک اپنے دنیوی معاملات کے متعلق تمدن، سیاست، معیشت، اخلاق اور معاشرت کے اصول خود وضع کرنے اور ان پر تفصیلی قوانین اور ضوابط بنانے کا حق رکھتے ہیں ..... (اس) جمہوری طریقے کو قبول کرنا گویا عقیدہء توحید سے منحرف ہو جانا ہے"! ۔ اس لیے، ہم کہتے ہیں کہ جو اسمبلیاں یا پارلیمنٹیں موجودہ زمانے کے جمہوری اصول پر مبنی ہیں ان کی رکنیت حرام ہے اور ان کے لیے ووٹ دینا بھی حرام ہے۔"

(رسائل و مسائل، حصہ اول، ص ۳۷۵)

افسوس کہ جماعت اسلامی نے اس حرام کو حلال کر لیا، اس نے اس حرام کام میں حصّہ لیا، اس کے لیے ووٹ دیے بھی اور دلوائے بھی اور اس "حرام" یعنی رکن بننے پر فخر کیا اور اسے قومی خدمت کا ذریعہ قرار دیا۔

انتخاب کی مثال:

کبھی مولانا مودودی صاحب نے موجودہ طریق انتخاب کو زہریلے دودھ سے نکلا ہوا اس سے زیادہ زہریلا مکھن قرار دیا تھا۔ حالاں کہ اب اسی طریقے کے مطابق دھڑلّے

کے ساتھ انتخاب میں حصّہ لیا جاتا ہے۔اس پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔مولانا ہی کے الفاظ ہیں:

"انتخابات کی مثال بالکل ایسی ہے، جیسے دودھ کو بلو کر مکھن نکالا جاتا ہے، اگر دودھ زہریلا ہو تو اس سے جو مکن نکلے گا قدرتی بات ہے کہ وہ دودھ سے زیادہ زہریلا ہو گا۔اسی طرح سوسائٹی اگر بگڑی ہوئی ہو، تو اس کے ووٹوں سے وہی لوگ منتخب ہو کر برسراقتدار آئیں گے۔جو اس سوسائٹی کی خواہش نفس سے سندِ قبولیت حال کر سکیں گے۔"

(جماعت اسلامی کا سیاسی کردار، ص ۱۴-۱۵)

امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا ناپاک طریقہ:-

"اب ہم کو اس امر میں کوئی شک نہیں رہا کہ ہماری اجتماعی زندگی اور قومی سیاست کو جن چیزوں نے سب سے بڑھ کر گندہ کیا ہے، ان میں سے ایک امیدواری اور پارٹی ٹکٹ کا طریقہ ہے۔اس بناء پر جماعت اسلامی نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ناپاک طریق انتخاب کی جڑ کاٹ دی جائے۔جماعت اسلامی نہ اپنے ٹکٹ پر آدمی کھڑے کرے گی، نہ اپنے ارکان کو آزاد امیدوار کی حیثیت سے کھڑا ہونے کی اجازت دے گی، نہ کسی ایسے شخص کی تائید کرے گی جو خود امیدوار ہو اور اپنے لیے ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرے، خواہ انفرادی طور پر یا کسی پارٹی ٹکٹ پر۔یہی نہیں بلکہ جماعت انتخابی جدوجہد میں خاص طور پر یہ بات عوام کے ذہن نشین کرے گی کہ امیدوار بن کر اٹھنا اور اپنے حق میں ووٹ مانگنا آدمی کے غیر صالح اور نااہل ہونے کی پہلی اور کھلی ہوئی علامت ہے۔ایسا آدمی جب کہیں اور کبھی سامنے آئے لوگوں کو فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ایک خطرناک شخص ہے۔جس کو ووٹ دینا اپنے حق میں کلنٹے بونا ہے۔"

(جماعت اسلامی کی انتخابی جدوجہد، ترجمان القرآن، اکتوبر ۱۹۵۰ء)

افسوس کہ جماعت اسلامی نے "اس ناپاک طریقے" کی جڑ نہیں کاٹی بلکہ اس کی آبیاری میں نہایت سرگرم اور مخلصانہ حصہ لیا۔

پاکستان اور تحریکِ پاکستان

مودودی صاحب کے افادات مزید

شاہد حسین خان

بدگمانیاں اور الزام تراشیاں:

مولانا مودودی صاحب نے مسلم لیگ، اس کے قائد اور ان کی تحریک کے بارے میں صرف بدگمانیوں ہی سے کام نہیں لیا کہ بعض فطرتیں سوء ظن کے لیے معاف کی جا سکتی ہیں۔ ان فطرتوں کی تعمیر ہی ایسی ہوتی ہے کہ ان کے قلب میں کسی کے بارے میں حسن ظن پیدا ہی نہیں ہوتا۔ مولانا مودودی صاحب کی فطرت کا خمیر بھی ایسی ہی مٹی سے اٹھا تھا کہ ان کی نظر جب کسی پر پڑی ... اور "کسی" میں انبیاے کرام، صحابہ عظام، امہات المومنین، صلحاے امت، علماے دین، مشائخ و رہنمایانِ عہد سب شامل ہیں، تو ان کی نظروں اور ذوق نکتہ چیں نے کوئی خامی تلاش یا کم از کم فرض ضرور کر لی۔ لیکن وقت کے رہنماؤں کے بارے میں ان کی فطرت نے صرف بدگمانیوں ہی سے کام نہیں لیا بلکہ الزام تراشی کا بھی کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا

> "جنت الحمقا میں رہنے والے لوگ اپنے خوابوں میں خواہ کتنے ہی سبز باغ دیکھ رہے ہوں لیکن آزاد پاکستان (اگر فی الواقع بنا بھی تو) لازماً لادینی جمہوری اسٹیٹ کے نظریہ پر بنے گا۔ جس میں غیر مسلم اسی طرح برابر کے شریک ہوں گے جس طرح مسلمان۔ اور پاکستان میں ان کی تعداد کم اور نمائندگی کی طاقت اتنی کمزور نہ ہو گی کہ شریعت اسلامی کو حکومت کا قانون اور قرآن کو اس جمہوری نظام کا دستور بنایا جا سکے۔"

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۴٦ء)

پھر لکھتے ہیں:

"مسلم لیگ کی تحریک کے متعلق پہلی بات تو یہ سمجھ لیجیے کہ اس کے بنیادی تصورات، اس کا نظام ترکیبی، اس کا مزاج اور اس کی اسپرٹ، اس کا طریق کار اور اس کے مقاصد سب کچھ وہی ہیں جو قومی اور قوم پرستانہ تحریکوں کے ہوا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ مسلمانوں کی قومی تحریک ہے اور مسلمانوں کی ہر چیز اسلامی بن جایا کرتی ہے۔ اس لیے خواہ مخواہ اسے بھی اسلامی تحریک سمجھ لیا گیا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل ایک دوسری ہی چیز ہے۔ جس کا کوئی شائبہ بھی مسلم لیگ کی قومی تحریک میں نہیں پایا جاتا اور یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ اسلام اپنے مخصوص طریق کار سے جس منزل تک پہنچنا چاہتا ہے۔ اس تک آپ ایک قوم پرستانہ تحریک کے ڈھنگ اختیار کر کے پہنچ جائیں۔ ہر منزل اپنی فطرت کے لحاظ سے اپنی ہی ایک مخصوص راہ رکھتی ہے۔ آپ اسلام کی منزل مقصود کو پہنچنا چاہیں تو آپ کو اسلامی تحریک ہی کی مخصوص راہ کو سمجھنا اور اسے اختیار کرنا پڑے گا۔ قوم پرستی کے طریقے اختیار کر کے آپ قومیت کی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتے ہیں، مگر یہ توقع کرنا انتہائی پراگندہ خیالی ہے کہ ان ڈھنگوں سے آپ اسلامی منزلِ مقصود تک جا پہنچیں گے۔ اس نکتے کی توضیح کا یہاں موقع نہیں ہے۔ میں "مسلمان اور سیاسی کشمکش حصہ سوم" میں تفصیل کے ساتھ بتا چکا ہوں کہ ایک اصولی تحریک اور ایک قوم پرستانہ تحریک میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ضرورت ہو تو پھر اس کی تشریح کر سکتا ہوں۔ یہاں پر اشارتاً صرف اتنی بات واضح کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ ایک اصول تحریک کے کارکنوں کو یہ خبر دینا کہ تمھارے لیے ایک قوم پرستانہ تحریک نے بڑے اچھے مواقع پیدا کر دیے ہیں، کسی بصیرت اور معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں ہے۔ اس کی مثال تو بالکل ایسی ہے جیسے کسی عازم کلکتہ کو یہ خبر دی جائے کہ کراچی میل کھڑا ہے۔"

(ترجمان القرآن، فروری ۱۹۴٦ء)

جماعت اسلامی کا اجلاس ٹونک اور اس کے فرمودات:

۱۷، ۱۸۔ اپریل ۱۹۴۷ء کو ٹونک میں جماعت اسلامی کا ایک اہم جلسہ ہوا۔ اس میں مودودی صاحب سے مسلم لیگ کے بارے میں سوال ہوئے۔ جن کے جواب دیتے ہوئے انھوں نے کہا:

" یہ لوگ ہندوستان کے ایک ذرا سے کونے میں پاکستان بنانے کو اپنا انتہائی مقصد بنائے ہوئے ہیں۔ لیکن اگر یہ فی الواقع خلوص قلب سے اسلام کی نمائندگی کے لیے کھڑے ہو جائیں تو سارا ہندوستان پاکستان بن سکتا ہے اور اس میں ایک لادینی جمہوریت (Secular Democracy) یا عوامی پارلیمنٹری حکومت (Popular Parliamentary Govt.) نہیں بلکہ خالص خدا کی حکومت کتاب و سنت کے اصول پر قائم ہو سکتی ہے۔ اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی۔ اگر لوگ اسلام اور اسلامی طریقہ کار کو اپنی خواہشاتِ نفس کے خلاف پاکر ان کو ترک کر دینا چاہتے ہیں، تو ہیر پھیر کے راستوں سے آنے کے بجائے صاف صاف کیوں نہیں کہتے کہ اللہ اور رسول کے کام کو چھوڑیے اور ہمارے نفس کے کام میں حصّہ لیجیے۔"

(ترجمان القرآن، جون ۱۹۴۷ء)

یہ تقریر پاکستان قائم ہونے سے چار ماہ بلکہ قیام پاکستان کے اعلان (جون، ۱۹۴۷ء) سے صرف ڈیڑھ ماہ قبل کی ہے اس میں انھوں نے بڑی وضاحت سے اعلان کیا کہ

"اسلام کی لڑائی اور قومی لڑائی ایک ساتھ نہیں لڑی جا سکتی۔"

بلکہ پاکستان کے نظریے کے لیے جدوجہد کرنے والے تمام لیڈروں کو "خواہشات نفس" کے پیچھے چلنے والے قرار دیا۔ لیکن جب ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو چکا اور مودودی صاحب کے لیے کوئی جائے پناہ نہ رہی تو لاچار اور مجبور ہو کر سیدھے پاکستان کا رخ کیا جس کو ملعون اور مبغوض اور دار الکفر قرار دیتے آرہے تھے

اور اب سولہ سال بعد اپنی تمام تحریرات اور پاکستان کے نظریے کے خلاف اپنی انتہائی جدوجہد کے برعکس یہ اعلان کر رہے ہیں کہ

"جماعت اسلامی نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی پاکستان کی مخالفت نہیں کی۔

سوال یہ ہے کہ جماعت اسلامی اوّل سے آخر تک اپنی تاریخ میں سے کوئی ایسا لمحہ تو ثابت کرے، جب اس نے پاکستان کی تائید کی ہو؟

جماعت اسلامی کا اجلاسِ مدراس اور مودودی صاحب کے ارشادات:

جماعت اسلامی کی روداد (حصّہ پنجم) ہمارے سامنے ہے جس میں مدراس کے اجلاس کی پوری کارروائی اور مودودی صاحب کی تقریر مورخہ ۲۶۔اپریل ۱۹۴۷ء شائع کی گئی ہے۔اس میں اوّل سے آخر تک نظریہ۔پاکستان کی تائید کا تو کہیں نام ونشان نہیں، بلکہ اس کے نظریے اور اس کے قائدین کو نہایت حقارت آمیز الفاظ میں کوسا گیا ہے۔ پاکستان کا قیام چند دنوں تقریباً سوا مہینے کے بعد یقینی طور پر عمل میں آنے والا تھا۔ مودودی صاحب شکست خوردہ ذہنیت کے ماتحت اب تک اس کے مضمرات اور نقصانات کا بھیانک نقشہ بنا بنا کر پیش کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھتے تھے۔ اس لیے انھوں نے مدراس کی تقریر میں پاکستان کے قائم ہونے پر اس کے تاریک پہلو خوب بڑھا چڑھا کر اور پورے مبالغے کے ساتھ عوام کے سامنے پیش کیے۔چناں چہ تقریر کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"آنے والے دور میں ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان کے حالات بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ سب سے پہلے مسلمانوں کے معاملے کو لیجیے۔ہندو اکثریت کے علاقے میں مسلمان عنقریب یہ محسوس کرلیں گے کہ جس قوم پرستی پر انھوں نے اپنے اجتماعی روّیے کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ

انھیں بیابانِ مرگ میں چھوڑ گئی ہے۔ اور ان کی قومی جنگ جسے وہ بڑے جوش وخروش سے بغیر سوچے سمجھے لڑ رہے تھے ایک ایسے نتیجے پر ختم ہوئی ہے، جو ان کے لیے تباہی کے سوا اپنے اندر کچھ نہیں رکھتا۔ جن جمہوری اصولوں پر ایک مدت سے ہندوستان کا سیاسی ارتقا ہو رہا تھا اور جنھیں خود مسلمانوں نے بھی قومی حیثیت سے تسلیم کرکے اپنے مطالبات کی فہرست مرتب کی تھی، انھیں دیکھ کر بہ یک نظر معلوم کیا جاسکتا تھا کہ ان اصولوں پر بنے ہوئے نظام حکومت میں جو کچھ ملتا ہے اکثریت کو ملتا ہے۔ اقلیت کو اگر ملتا بھی ہے تو خیرات کے طور پر دست نگر ہونے کی حیثیت سے، نہ کہ حق کے طور پر حریف اور مدمقابل اور شریک کی حیثیت سے۔ یہ ایک ظاہر و باہر حقیقت تھی۔ مگر مسلمانوں نے اس کی طرف سے جانتے بوجھتے آنکھیں بند کیں اور اس "دوہری حماقت" کا ارتکاب کیا کہ ایک طرف تو نظام حکومت کے لیے مغرب کے انھی جمہوری اصولوں پر راضی ہوگئے اور دوسری طرف خود اپنی طرف سے تقسیم ملک کا یہ اصول پیش کیا کہ جہاں ہم اکثریت میں ہیں، وہاں ہم حاکم اور تم محکوم ہو اور جہاں تم اکثریت میں ہو، وہاں تم حاکم اور ہم محکوم ہوں۔ کئی سال کی تلخ اور خونریز کشمکش کے بعد اب یہ "مرکب حماقت" کامیابی کے مرحلے میں پہنچ گئی ہے اور جس چیز کے لیے اقلیت کے مسلمان خود لڑ رہے تھے وہ حاصل ہوا چاہتی ہے۔ یعنی اکثریت کی آزاد و خود مختار حکومت جس میں وہ بحیثیت ایک قوم کے محکوم ہوں گے اور محکوم بھی اس اکثریت کے جس سے وہ قومی جنگ لڑ رہے ہیں۔"

(روئداد "جماعت اسلامی"، حصہ پنجم، اجتماع مدراس، ص ۱۱۵)

جماعت اسلامی کے افکار عالیہ

بانی پاکستان کے بارے میں

ماخوذ

اب تو جماعت اسلامی کا ہر شخص محمد علی جناح کو "قائد اعظم" کے لقب سے یاد کرتا ہے اور "رحمتہ اللہ علیہ" کہتے ہوئے اس کا منہ نہیں تھکتا۔ زبان پر جب کبھی ان کا نام آتا ہے تو نطق زبان کے بوسے لیتا ہے اور کاغذ پر یہ نام رقم ہوتا ہے تو "قائد اعظم" اور "علیہ الرحمتہ" کی گردان سے قلم جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ لیکن کبھی یہی بزرگ مولانا مودودی کے نزدیک "صرف مسلم لیگ کے قائد اعظم" تھے۔ لیکن یہ تعارف یا تنقید ملک کے اندر اور سیاسی اختلاف کی بنا پر تھی۔ اس اختلاف کے لیے جواز تھا۔

قیام پاکستان نے تاریخ کا ورق الٹ دیا۔ اب وہ کسی اختلاف کے بغیر بانی پاکستان کی حیثیت سے "قوم کے باپ" (Father of the Nation) تھے اور قوم کے وقار وعزت کی علامت بن گئے تھے۔ اب ان کی قیادت کو "مسلمانوں کی بدقسمتی" قرار دینا، انھیں "اسلام کی حقیقت سے قطعاً نابلد کہنا"، مسلمانوں سے بالکل الگ، "اسماعیلی مذہب" کا پیرو بتانا اور اسلام اور مسلمانوں سے ان کے اخلاص اور ہمدردی تک میں شبہ ظاہر کرنا اور زندگی کے لیے اسلام کے بہترین اصولوں سے ناواقف اور جاہل قرار دینا، ملک کی "سیاسی تاریخ" میں قوم کے ساتھ مذاق اور توہین کے مترادف ہے۔ اس کے باوجود جماعت اسلامی نے یہی کیا۔ مولانا مودودی کی "روح کے بازو" مولانا مسعود عالم ندوی (ف ۱۶۔ مارچ ۱۹۵۴ء) بانی پاکستان کا اسلامی دنیا سے

تعارف کراتے ہوئے "تاریخ الدعوۃ الاسلامیہ فی الہند والباکستان" میں فرماتے ہیں:

"یہ مسلمانوں کی بد قسمتی تھی کہ ان کا قائد محمد علی جناح دستوری وقانونی مسائل میں مہارت تامہ رکھنے اور انگریز اور ہندو سیاست کی ساری گہرائیوں اور باریکیوں سے واقف ہونے کے باوجود اسلام کی حقیقت اور اس کی خوبیوں سے قطعاً نابلد تھا۔ جناح مرحوم کو اسلام اور مسلمانوں سے ہمدردی سہی، لیکن فی الحقیقت وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اسلام نے انسانی زندگی کے لیے بہترین اصول بھی بتائے ہیں جو انسانیت کو برکتوں سے مالا مال کرنے کے ضامن ہیں۔

یہ کچھ ان کا اپنا قصور نہیں تھا، بلکہ جس ماحول میں انھوں نے آنکھیں کھولیں اور پروان چڑھے، یہ اس کا فطری لازمی نتیجہ تھا۔ ایک اسماعیلی گھرانے میں خالص فرنگی طرز پر انھوں نے نشوونما پائی۔ اسماعیلی گروہ اپنے افکار وعقائد کے اعتبار سے دراصل مسلمانوں سے بالکل الگ ہے اور سوائے اس کے کہ دونوں "اسلام" ہی کا نام لیتے ہیں، ان میں باہم اور کوئی ربط نہیں۔

(چراغ راہ، کراچی۔ مسعود عالم ندوی نمبر۔ مارچ ۱۹۵۵ء، ص ۱۶۰)

یہ ہے قائد اعظم کا تعارف جو جماعت اسلامی نے اسلامی دنیا میں کرایا۔ اور یہ ہیں اس کے افکار عالیہ بانی پاکستان کے بارے میں! اس کے نزدیک نہ وہ مسلمان تھے اور نہ مسلمانوں کی قیادت کے اہل۔ اسلام اور مسلمانوں سے ان کی ہمدردی بھی شبہے سے بالا نہ تھی۔ آج جو شخص بانی پاکستان کے نام کے ساتھ قائد اعظم، مرحوم، رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ الفاظ لکھے دیکھتا ہے، وہ یقین ہی نہیں کر سکتا کہ مودودی صاحب اور ان کے رفقا کے نزدیک وہ مسلمان ہی نہ تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جماعت اسلامی کے سیاسی افکار و عزائم

چند مزید خیالات

شیخ محمد اقبال

جماعت اسلامی اور اس کے عزائم:

دسمبر ۱۹۳۷ء کے ترجمان القرآن میں مولانا کا ایک مضمون "ادارہ دارالاسلام" کے متعلق شائع ہوا تھا۔ اس میں وہ اپنی پارٹی کے مقاصد کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> " یہ پارٹی اسلام کے اصولوں پر ایک نئے اجتماعی نظام (Social Order) اور ایک نئی تہذیب (Civilization) کی تعمیر کا پروگرام لے کر اٹھے اور عامہ خلائق کے سامنے اپنے پروگرام کو پیش کر کے زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت فراہم کرے اور بالآخر حکومت کی مشین پر قابض ہو جائے۔

حکومت پاکستان سے تصادم:

جب کسی پارٹی کے یہ ارادے ہوں تو اس کی حکومت سے آویزش ناگزیر ہے۔ جماعت نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلا حربہ یہ اختیار کیا کہ حکومت

وقت اور اراکین حکومت کے متعلق طرح طرح کے الزامات لگانے شروع کیے ۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے ...... ۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد دو امور جن پر حکومت اور مولانا مودودی کے درمیان بنیادی اختلافات رونما ہوئے اور جن کی بنا پر بالآخر مولانا نظر بند کر دیے گئے، "حلف وفاداری" اور "جنگ کشمیر" کے متعلق مولانا کا نقطہ نظر تھے۔

وفاداری سے باز رکھنے کی کوشش:

"حلف وفاداری کا قضیہ اس طرح پیش آیا کہ یوم آزادی کے بعد ہندوستان کی مرکزی اور صوبائی حکومتوں نے اپنے ملازمین سے کہا کہ وہ وفاداری کا حلف اٹھائیں ۔ ایسے حلف عام طور پر ذمہ دار عہدہ داروں اور وزرا سے لیے جاتے ہیں ۔ لیکن چوں کہ یہاں آزادی نئی نئی ملی تھی اور ہر سرکاری ملازم (بالخصوص اقلیتوں) کی نسبت نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ دل سے نظام حکومت کے وفادار ہیں ۔ اس لیے ہندوستان میں چھوٹے چھوٹے ملازمین سے بھی یہ حلف لیے گئے ۔ پاکستان میں عام طور پر یہ طریقہ اختیار نہیں کیا گیا ۔ لیکن (مغربی) پنجاب کی حکومت نے (غالباً ہندوستان کی مثال دیکھ کر) اپنے ملازمین کو حکم دیا کہ وہ حکومت پاکستان کی وفاداری کا حلف لیں ۔ بعض سرکاری ملازمین نے جو جماعت اسلامی سے وابستہ تھے، امیر جماعت سے استصواب کیا ۔ مولانا نے رائے دی کہ چوں کہ اس حلف سے اس نظام حکومت سے وفاداری کی قسم کھانی پڑتی ہے، "جو از روے قانون قائم ہے"، اس لیے یہ حلف اس وقت تک ناجائز ہے جب تک یہ نظام حکومت پورے طور پر اسلامی نہ ہو جائے ۔ چناں چہ ایک دو سرکاری ملازموں نے اس مشورے کی تعمیل میں حلف اٹھانے سے انکار کر دیا اور ان کے خلاف محکمانہ کارروائی ہوئی ۔ مثلاً "نوائے وقت" کی اشاعت ۲۔ ستمبر ۱۹۴۸ء میں لکھا ہے کہ

"سول سکریٹریٹ کے ایک اسسٹنٹ کو اس بنا پر معطل کر دیا گیا ہے

کہ اس نے پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھانے سے انکار کر دیا اور یہ کہا کہ میں اس صورت میں پاکستان کا وفادار رہ سکتا ہوں جس صورت میں اس کا نظام حکومت شرعی ہو۔"

جہادِ کشمیر کی مخالفت:

مسئلہ حلف وفاداری پر اسلامی جماعت نے جو روش اختیار کی اس نے گورنمنٹ کو چوکنا کر دیا تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ کشیدگی جہادِ کشمیر کے متعلق مولانا مودودی کے ایک بیان سے ہوئی۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا کہ مئی ۱۹۴۸ء کے دوسرے ہفتے میں مولانا جماعت اسلامی سرحد کے اجتماع کے موقع پر پشاور تشریف لے گئے۔ وہاں ان دنوں جہاد کشمیر کا بڑا چرچا تھا۔ قبائلی مجاہد پشاور سے گزر کر پونچھ اور کشمیر کے دوسرے مقامات کو جا رہے تھے۔ مولانا کے قیام کے دوران میں آزاد کشمیر گورنمنٹ کے ایک بہی خواہ (۱) نے اس زعم میں کہ "الجہاد فی الاسلام" کے مصنّف کو جہاد سے خاص دلچسپی ہوگی اور ان کی رائے سے آزاد کشمیر گورنمنٹ کو اپنے مقصد میں مدد ملے گی۔ مولانا سے جہاد کشمیر کے متعلق استفسار کیا۔ مولانا نے کچھ تامّل کے بعد جہادِ کشمیر کی نسبت فرمایا:

> "پاکستان کے باشندوں کے لیے اس میں حصّہ لینا اس وقت تک جائز نہیں۔ جب تک ان کی نمائندہ حکومت اور حکومت ہند کے درمیان معاہدانہ تعلقات ہیں۔" (۲)

مستفسر یہ جواب سن کر ششدر رہ گیا اور فریقین میں کچھ تلخ سی بحث ہوئی۔ پشاور کے ایک مقامی اخبار میں اس گفتگو کا کچھ حصّہ شائع ہوا اور چند روز بعد لاہور کے اخبار "سول اینڈ ملٹری گزٹ" نے .... مولانا کی اس رائے کو اچھالا۔ حتیٰ کہ مولانا کے اپنے بیان کے مطابق کشمیر کے متعلق ان کے بیانات کو جموں ریڈیو، آل انڈیا ریڈیو اور شیخ عبداللہ کی حکومت نے بہت غلط معنی پہنا کر نشر کیا ہے اور اس سے جموں و کشمیر

کی آزادی کے لیے لڑنے والوں کو نیز اہلِ کشمیر کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔" (۳)

جب مولانا کی رائے کی یوں اشاعت ہوئی تو اسلامی اخبارات میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ اکثر اخبارات نے اس پر کڑی نکتہ چینی کی، بلکہ جماعت اسلامی کے بعض افراد نے بھی مولانا سے زیادہ احتیاط اور معاملہ فہمی کا مطالبہ کیا۔ چناں چہ مولانا نے اس مسئلے پر "جنگِ کشمیر" کے عنوان سے ("جہادِ کشمیر نہیں) جون ۱۹۴۸ء کے ترجمان القرآن میں ایک طویل مقالہ لکھا، جس کا قوم اور ملک کے تمام بہی خواہوں کو بہ غور اور نہایت ٹھنڈے دل سے مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ وہ اندازہ لگا سکیں کہ مولانا مودودی کے خیالات کی پیروی سے قوم اور ملک کیسی کیسی الجھنوں سے دوچار ہوں گے۔

جماعت اسلامی کے شعبہ نشر و اشاعت نے مولانا کی نظر بندی پر ایک پمفلٹ بھی شائع کیا تھا۔ اس میں لکھا ہے:

"اکابرِ حکومت نے ایک طرف تو یہ کیا کہ جماعت اسلامی کو انگریز کے قانون کے تحت سیاسی جماعت قرار دے کر سی آئی ڈی کی نگرانی اور خطوط کے سنسر کا سلسلہ شروع کر دیا اور دوسری طرف یہ سازش شروع کی کہ ایسا کوئی شوشہ چھوڑا جائے جس سے مولانا موصوف اور جماعت اسلامی کو پہلے بدنام کیا جا سکے اور پھر انھیں اور ان کے خاص خاص ساتھیوں کو گرفتار کر کے نظام اسلامی کی اس تحریک کا سارا جھگڑا ہی ختم کر دیا جائے۔ کشمیر کا مشہور قضیہ دراصل اسی سازش کا نتیجہ تھا۔ یہ قضیہ کس طرح اٹھایا گیا۔ اس کی اصلیت کیا تھی اور اس سے کیا کام لیا گیا۔"

آگے چل کر پشاور کی گفتگو اور اس کی اشاعت کا اجمالاً ذکر کرنے کے بعد اس رسالے میں لکھا ہے:

"دنیا یہ سن کر حیران ہوگی اور مولانا اور جماعت کے دوسرے لوگ بھی اس انکشاف پر سخت حیران ہوئے تھے کہ یہ صاحب جنھوں نے اس طرح پرائیویٹ مجلس میں مولانا سے ایک بات پوچھی اور پھر ان کے جواب کو کسی

قدر تحریف کے ساتھ دنیا بھر میں پھیلایا ۔ یہ کوئی ہندوستانی حکومت یا مہاراجہ ہری سنگھ کے ایجنٹ نہیں تھے بلکہ آزاد کشمیر گورنمنٹ کے نشر واشاعت کے انچارج جناب نبی بخش نظامی تھے ۔ ان صاحب کا نام اور منصب معلوم کرنے کے بعد شاید کسی ہوش مند آدمی کو بھی اس امر میں شک نہ رہے گا کہ یہ صاحب مولانا کے پاس خود نہیں آئے تھے بلکہ بھیجے گئے تھے اور ان کا اس بات کو شائع کرنا کسی نادان بچے کی حماقت نہیں بلکہ خوب سوچی سمجھی اسکیم کا نتیجہ تھا۔"

شعبہ ۔ نشر واشاعت کے رسالے میں جس بھونڈے طریقے سے آزاد کشمیر گورنمنٹ پر بہتان باندھنے کی کوشش کی گئی ہے، اسے محض پروپیگنڈے کی ایک چال سمجھ کر نظر انداز کرنا پڑتا ہے ۔ کیوں کہ قطع نظر اس امر کے کہ سازش کا ذرا ثبوت نہیں دیا گیا ۔ شواہد تمام تر اس کے خلاف ہیں ۔ ظاہر ہے کہ اگر حکومت کا مقصد "جماعت اسلامی" کو بدنام کرنا تھا تو اس کے لیے آزاد کشمیر گورنمنٹ کے کسی ملازم کو بیچ میں لانے کی کیا ضرورت اور کیا مصلحت تھی ؟ یہ کام تو زیادہ آسانی سے حکومت کے کسی اپنے کارندے یا لیگ کے کسی راہنما کی معرفت ہو سکتا تھا۔

اس کے علاوہ اصل چیز تو مولانا کی رائے اور ان کے خیالات ہیں ۔ کیا حکومت پاکستان یا آزاد کشمیر نے کوئی سازش کر کے مولانا کے دماغ میں یہ خیالات ڈال دیے تھے ؟

اور اگر یہ کہا جائے کہ پشاور میں کوئی سازش تھی تو ترجمان القرآن کا مضمون لکھتے وقت مولانا کس سازش کا شکار ہوئے تھے کیوں کہ جو رائے مولانا سے پشاور میں منسوب کی گئی تھی "ترجمان القرآن" میں بھی عین اسی رائے کا اظہار ہے ۔

اور پھر مولانا کی فہم وفراست کے متعلق کیا کہا جائے جو معمولی سرکاری ملازموں کی "سازشوں" کا شکار ہو جاتے ہیں ۔

شعبہ ۔ نشر واشاعت کا رسالہ مولانا مودودی کی رہائی کے لیے پروپیگنڈا کرنے کا

ایک ذریعہ تھا۔ مقصد نیک تھا، مرتب نے سوچا کہ اس کے لیے جو حربہ ہاتھ لگے استعمال کر لیا جائے۔ چناں چہ سازش کا افسانہ تراشا گیا۔ ہمارا ذاتی خیال ہے کہ اگر مولانا مودودی کی نظر سے یہ رسالہ گزرتا تو وہ سازش کا قصّہ درج کتاب نہ ہونے دیتے۔ مولانا مودودی نے جہاد کشمیر کی نسبت جو کچھ کہا تھا وہ اصول کی رو سے تھا۔ ہمارے خیال میں ان کی رائے نہ صرف غلط بلکہ حالات اور زمانے کے اعتبار سے شدید طور پر مفسدانہ تھی۔ لیکن یہ رائے ان کے نظریات اور افتادِ طبع کا قدرتی نتیجہ اور ایک آیت قرآنی پر مبنی تھی۔ ان کا فرمانا تھا:

"آخر اسلامی نظام حکومت کے معنی ہی کیا ہیں۔ اگر اس کا بنیادی اصول یہ نہ ہو کہ ملک کی داخلی سیاست اور خارجی پالیسی کے معاملے میں اتباع صرف کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کا ہوگا، نہ کہ قومی خواہشات اور دنیوی مصلحتوں کا۔" (۴)

مولانا نے اس رائے کے اظہار، بلکہ اس کی صحت سے کبھی رجوع نہیں فرمایا۔ ایسی رائے کے اظہار کو جسے خود مولانا نے اس وضاحت اور وثوق سے جماعت اسلامی کے رسالے ترجمان القرآن میں شائع کیا ہو، ایک سازش کا نتیجہ بتانا عقیدت نہیں، غلط وکالت کا کرشمہ ہے۔

ترجمان القرآن میں مولانا نے مسئلے پر شرعی حیثیت سے بحث کی تھی۔ ان کا فرمانا تھا کہ ان کی رائے دراصل قرآن مجید کے ایک صریح حکم پر مبنی ہے:

والذین آمنوا ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شیء حتی یھاجروا وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر الا علی قوم بینکم وبینھم میثاق واللہ بما تعملون بصیر۔ (۸:۷۲)

اور جو لوگ ایمان تو لائے مگر ہجرت کر کے تمھارے پاس نہیں آئے، ان کی ولایت کا کوئی تعلق تم سے نہیں ہے، جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں۔ البتہ اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو مدد کرنا تم پر واجب ہے،

مگر کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں، جس کے اور تمہارے درمیان معاہدہ ہو اور
اللہ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

مولانا کی رائے سے جن لوگوں نے اختلاف کیا۔ ان میں سے بعض کے پیش نظر تو فقط قوم کی "دنیوی مصلحتیں" تھیں۔ لیکن علما نے بھی بالعموم ان سے اختلاف کیا اور کہا کہ مولانا اس آیت سے استدلال کرتے وقت اس دقّت نظر کو کام میں نہیں لائے جو مختلف اور زیادہ پیچیدہ حالات میں ایک حکم کے صحیح اطلاق کے لیے ضروری ہے۔ مولانا کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ وہ ان معاہدات کی بنا پر جو حکومت ہندوستان سے دوسرے شعبوں میں ہوئے، پاکستان کو پابند سمجھتے تھے کہ وہ اس مسئلے میں بھی جس کے متعلق کوئی معاہدہ نہیں بلکہ علانیہ اختلاف ہے، مخالفانہ کارروائی نہ کرے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ "دو قوموں کے درمیان چند معاملات میں معاہدانہ تعلق اور ایک یا دو معاملوں میں جنگ کا قیام ایک ایسی متناقض بات ہے جس کا کوئی معقول آدمی تصور نہیں کر سکتا۔" واقعہ یہ ہے کہ عہد نبوی میں یہی حالت تھی۔ حکومتوں کے درمیان "معاہدانہ تعلقات" کی صورت میں دشمنی کی گنجائش نہ ہوتی تھی۔ لیکن اب بین الاقوامی تعلقات اس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ شاید اس زمانے میں جب حکومت برطانیہ اور جرمنی میں باقاعدہ جنگ ہو رہی تھی اور فریقین کے ہوائی جہاز بم باری سے ایک دوسرے کے وجود کو صفحہ، ہستی سے نابود کرنے کی کوشش کر رہے تھے، اس وقت بھی کئی معاملات ایسے تھے جن میں ان کے آپس میں معاہدے تھے اور بالخصوص کئی بین الملی معاہدات (International Conventions) ایسے ہوں گے مثلاً کاپی رائٹ، زہریلی گیس کے متعلق معاہدہ، Red - Cross Conventions وغیرہ جن پر دونوں کے دستخط تھے اور دونوں حکومتیں عامل تھیں اہل پاکستان نے بھی دیکھا ہو گا کہ مغربی جرمنی سے پاکستان کی تجارت ۱۹۴۹ء کے آخر سے باقاعدہ ہو رہی تھی، لیکن جرمنی سے اختتام جنگ کا اعلان جنوری ۱۹۵۱ء میں ہوا اور

جرمنی اور امریکہ کے درمیان تو اس کے بعد قانونی طور پر جنگ کی حالت رہی، لیکن تجارت جاری تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر واقعات کو فقط اہلِ معقولات کی منطق اور ملّایانِ مکتب کی عینک سے دیکھیں تو یہ صورتِ حالات ضرور عجیب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن عملی زندگی ایک بڑی پرپیچ وادی ہے۔ اس میں عجیب وغریب حالات اور پیچ در پیچ مشکلات سے سابقہ پڑتا ہے۔ ہاں اگر حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں اور زندگی کو فقط مدرّسانہ منطق کی روشنی میں دیکھیں تو واقعات کا اندازہ کچھ سے کچھ ہوتا ہے۔

مولانا کی رائے سے جن علما نے اختلاف کیا۔ ان میں مولانا شبیر احمد عثمانی کی شخصیت بلحاظ علم وفضل وتقویٰ سب سے بلند تھی۔ ان کے علاوہ مولانا محمد نورالحق علوی اور متعدد بزرگوں نے بھی مولانا کے فتوے سے شرعی دلائل کی بنا پر اختلاف کیا بلکہ "بعض خطیب صاحبان نے تو مسجدوں کے منبروں پر چڑھ کر لوگوں کو مولانا کے قتل پر ابھارا" (۵)۔ اخبارات نے بھی عام طور مولانا کی رائے پر شدید نکتہ چینی کی اور حکومت کو مشورہ دیا کہ ان کے خلاف کارروائی کی جائے۔

جمہور کی مخالفت سے مولانا متاثر نہ ہوئے۔ ان کا فرمانا تھا:

> "ایسی رائے عام کی تائید میرے لیے ذرہ برابر بھی مفید نہیں جو نعرہ تو اسلامی حکومت کا لگائے مگر جب اس کی خواہش کے خلاف کوئی حکم شرعی اسے سنایا جائے تو وہ اس پر چیں بہ جبیں ہی نہ ہو بلکہ کہنے والے پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ شروع کردے۔" (۶)

لیکن جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ جمہور کے تاثرات سے اس درجے بے پروا نہ تھی اور مولانا پر برابر زور ڈالا جا رہا تھا کہ اپنی رائے میں ترمیم کریں سہجتاں چہ ۱۵ تا ۱۷ ستمبر کو جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ کا جو جلسہ ہوا، اس میں حسبِ ذیل قرارداد منظور ہوئی:

"امیرِ جماعت نے اپنے پچھلے بیانات میں جو شرعی مسئلہ بیان کیا تھا وہ اس حالت سے متعلق تھا جب کہ سرکاری طور پر اس امر کا کوئی اقرار و اظہار نہیں ہوا تھا کہ پاکستان کی فوجیں حدودِ کشمیر میں موجود ہیں۔ اب ۷۔ ستمبر کو مجلس اقوام متحدہ کے کشمیر کمیشن سے حکومتِ پاکستان کی جو مراسلت شائع ہوئی ہے اور وزیرِ خارجہ پاکستان نے ۸۔ ستمبر کو جو بیان دیا ہے، اس میں اس امر کا واضح اقرار و اظہار موجود ہے اور حکومتِ ہند بھی اس پر مطلع ہو چکی ہے۔ اس بنا پر اس کا شرعی حکم بھی وہ نہیں ہوگا جو پہلے تھا .... اس انکشاف کے بعد امیرِ جماعت اور مجلس شوریٰ کی متفقہ رائے یہ ہے کہ اب معاہدانہ تعلقات کے باوجود پاکستان کے لیے جہادِ کشمیر میں جنگی حصّہ لینا بالکل جائز ہے۔" (۷)

معلوم ہوتا ہے کہ مجلس شوریٰ کے اراکین نے مولانا کو اپنی رائے بدلنے پر مجبور کیا، ورنہ کمیشن کی مراسلت کی اشاعت سے وہ شرائط پوری نہیں ہوئی تھیں جن پر مولانا کو اصرار تھا۔ مجلس شوریٰ کے اجلاس سے بارہ تیرہ روز پہلے مولانا نے توضیحی مضمون میں کہا تھا:

"..... لیکن جب تک حکومت ہند اور حکومت پاکستان کے درمیان معاہدانہ تعلقات قائم ہیں، میں بہ راہ راست جنگی کارروائی میں ان کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا۔ شریعت کے احکام میری دانست میں یہی ہیں اور اس کے خلاف جو دلائل پیش کیے گیے ہیں، ان سے میرا اطمینان نہیں ہو سکا۔" (۸)

ترجمان القرآن میں بھی انھوں نے لکھا تھا:

"دو قوموں کے درمیان چند معاملات میں معاہدانہ تعلق اور ایک یا دو معاملوں میں حالت جنگ کا قیام ایک ایسی متناقض بات ہے جس کا کوئی معقول آدمی تصور نہیں کر سکتا۔ معاہدانہ تعلقات خواہ کسی نوعیت کے ہوں، بہ ہر حال اس امر کو مستلزم ہیں کہ دونوں قومیں ایک دوسرے کے خلاف جنگی کارروائی نہیں کریں گی۔ کسی امر میں اگر ان کے باہم نزاع ہو تو جب تک معاہدانہ تعلقات قائم ہیں، اس نزاع کو پر امن طریقے ہی سے سلجھانے کی کوشش

کی جائے گی۔ اور اگر وہ کسی طرح نہ سلجھ سکے تو جنگ کا فیصلہ کرنے سے پہلے ان تمام دوستانہ تعلقات کو ختم کرنا ہو گا، جو ان کے درمیان قائم تھے۔" (۹)

ظاہر ہے کہ اس امر کے تسلیم کر لینے سے کہ کشمیر میں پاکستان کی فوجیں ہیں، دوسرے معاملات میں حکومت ہند اور حکومت پاکستان کے درمیان "معاہدانہ تعلقات" ختم نہیں ہو گئے تھے بلکہ وزیر خارجہ کے اعلان سے "چند معاملات میں معاہدانہ تعلق اور ایک یا دو معاملوں میں حالت جنگ کا قیام" سے وہ "متناقض بات" پیدا ہو گئی تھی جس کا بہ قول مولانا "کوئی معقول آدمی تصور نہیں کر سکتا۔"

حقیقت یہ ہے کہ مجلس شوریٰ کی رائے کے زیر اثر مولانا کو اپنی رائے بدلنی پڑی۔ علانیہ ایک بڑی غلطی کو تسلیم کرنا مولانا اور جماعت اسلامی دونوں کی شہرت کو ٹھیس لگاتا۔ اس لیے یہ شرعی حیلہ ڈھونڈا گیا کہ مراسلت کی اشاعت کے بعد صورت حالات بدل گئی ہے، اب شرعی حکم بھی مختلف ہے۔ غالباً مجلس شوریٰ کو امید تھی کہ اس فیصلے کے بعد حکومت اور عوام کی شکایات دونوں کے دل سے دھل جائیں گی۔ مگر جس انداز سے کئی مہینوں تک مولانا ایک نہایت نازک مسئلے میں اپنی مفسدانہ رائے پر جمے رہے اور پھر اس کے علاوہ جس طریقے سے سرکاری ملازموں کو حلف وفاداری سے باز رکھ رہے تھے۔ اس کے پیش نظر حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کی کوششیں ملک کی سلامتی کے لیے مضر ہیں اور ۴۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو انھیں اور ان کے دو رفقائے کار کو نظر بند کر لیا گیا۔

فوجی خدمت سے انکار:

" حلف وفاداری اور جہاد کشمیر کے علاوہ حکومت اور جماعت کے درمیان کشیدگی کا تیسرا سبب فوجی بھرتی کے متعلق جماعت کا نقطہ نظر تھا۔

جماعت اسلامی سے عام مسلمانوں کو بڑی شکایت یہ تھی کہ (۱۰) "جب تک

انگریزوں کی حکومت تھی تو مودودی صاحب کے ہمدرد معاون اور معتقد سرکاری افسر اور اہل کار انگریزی حکومت کی وفادارانہ خدمت کرتے رہے اور مودودی صاحب نے انھیں اس سے نہ روکا۔ نمائشی پروپیگنڈا دوسری چیز ہے۔ مگر کوئی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کے بعض اعلیٰ افسر مودودی صاحب کے معاون وسرپرست تھے اور مودودی صاحب کو ان سے مالی اعانت بھی ملتی رہی۔ حیرت ہے کہ جب تک انگریزی راج تھا مودودی صاحب نے نہ تو یہ فتویٰ دیا کہ لڑائی کے لیے فوج میں بھرتی حرام ہے اور نہ یہ اعلان کیا کہ میرے معاونوں اور مریدوں کو انگریزی حکومت سے بغاوت کا اعلان کردینا چاہیے۔" لیکن پاکستان میں آکر انھوں نے اپنا معیار کچھ اس ڈھنگ کا بنایا کہ پاکستان کے انتہائی مشکلات کے دور میں بھی قدم قدم پر ان کا حکومت سے تصادم ناگزیر ہو گیا۔ اب وہ اس امر پر مصر تھے کہ جب تک حکومت اسلامی نہ ہو جائے اس کے ساتھ پوری وفاداری بلکہ اس کی فوجی ملازمت بھی ممنوع ہے۔ "حلف وفاداری" کے مسئلے پر حکومت پنجاب سے ان کی چپقلش اسی بنا پر ہوئی اور فوجی بھرتی کا قضیہ بھی اسی وجہ سے پیش آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فوج میں جماعت اسلامی کے ارکان کی شمولیت پر مجلس شوریٰ نے ۱۰۔اپریل ۱۹۴۸ء کے اجلاس میں کوئی فیصلہ کیا تھا۔ جس کی روشنی میں قیّم جماعت نے چند ماہ بعد ایک خط کے جواب میں لکھا کہ:

> "موجودہ حکومتِ پاکستان غیر اسلامی ہے۔ اس لیے ہم مسلمانوں کو اس کی فوج یا ریزرو دستوں میں بھرتی ہونے کا مشورہ نہیں دے سکتے۔" (۱۱)

جب اس پر اخبارات میں لے دے ہوئی تو قائم مقام امیر جماعت (مولانا عبدالجبار غازی) نے کہا کہ یہ احکام ارکانِ جماعت کے لیے ہیں، عوام کا مسئلہ ان کی اپنی صواب دید پر ہے۔

> "ارکانِ جماعت کے لیے، ہماری یہ ہدایت ہے کہ وہ اپنی توجہات کو

اصلاً اقامت دین کی جدوجہد پر مرتکز رکھتے ہوئے دفاع کے مختلف کاموں کی تربیت حاصل کرنے میں پورا پورا حصّہ لیں۔

عملاً دفاع کی ضرورت پیش آجانے پر ارکان کو بھی بہ ہر حال فوج کے اندر شامل ہو کر ہی فرض ادا کرنا ہو گا۔

لیکن فوج میں تنخواہ دار ملازم کی حیثیت سے ان کو شمولیت کا مشورہ ہم صرف اس صورت میں دے سکتے ہیں، جب کہ حکومت ریاست اور فوج کے اسلامی ہونے کا دستوری اعلان کر کے گومگو کی موجودہ حالت کو ختم کر دے۔"

(۱۲)

چوں کہ اس خط ہیں ارکانِ جماعت کو بعض شرائط پورے ہونے تک فوجی ملازمت سے باز رہنے کی ہدایت تھی۔اس لیے حکومت نے جماعتِ اسلامی کے رسالے "جماعت اسلامی اور دفاع پاکستان" کو جس میں اس طرح کا اظہار تھا، ضبط کر لیا۔ قومی اخبارات نے بھی اس پر کڑی نکتہ چینی کی۔ بالخصوص "نوائے وقت" نے متعدد مقالے لکھے اور بتایا کہ جماعت اسلامی پاکستان کی بنیادیں کھوکھلی کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ ایک مقالے کا عنوان تھا۔"فوج کے بغیر دفاع" اس میں لکھا تھا:

"جماعت کے ارکان یہ کہتے ہیں کہ جہاں تک دفاعی سرگرمیوں کا تعلق ہے۔ وہ حکومت کے ساتھ تعاون کے لیے آمادہ ہیں۔ مگر حکومت کی فوج اور ریزرو آرمی میں بھرتی کا مشورہ دینے سے وہ معذور ہیں۔ یہ پوزیشن بے حد احمقانہ اور خطرناک ہے۔ سوال یہ ہے کہ فوج کے بغیر ملک کے دفاع کی کیا تدبیر ممکن ہے اور وہ کون سی حکومت ہے جو فوج یا ریزرو آرمی کے بغیر ملک کو دشمن سے بچا سکتی ہے۔"

ایک اور مقالہ کا عنوان تھا "مسئلہ دفاع اور فوجی بھرتی" اس میں بھی انہی خیالات کا اظہار تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تفصیلی بحث ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء کے ایک ایڈیٹوریل میں کی گئی۔ جس کے اختتام پر ایڈیٹر نے لکھا:

"افسوس صد افسوس کہ ہندوستان میں تو مولانا حسین احمد مدنی،

مولانا ابو الکلام آزاد ، مولانا حفظ الرحمان اور مولانا احمد سعید مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ وہ حکومت ہند سے دل و جان کے ساتھ تعاون کریں ، مگر پاکستان میں اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کے داعیوں کا یہ طائفہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دے رہا ہے کہ موجودہ حکومت غیر اسلامی اور موجودہ نظام کافرانہ ہے - لہذا دین میں تحریف کیے بغیر اس سے تعاون ناممکن ہے - گویا اگر اس عدم تعاون کے طور پر خدانہ خواستہ پاکستان ختم ہو جائے تو پھر یہاں اسلامی نظام رائج ہو جائے گا -

جماعت اسلامی ہندوستان میں بھی ہے اور اس کے امیر بھی مودودی صاحب ہی ہیں - یہ کیا بات ہے کہ ان کے سارے فتوے پاکستان کے لیے ہی وقف ہیں ؟

بندہ پرور! آپ غدّار اور دشمن کے ایجنٹ نہیں ہوں گے - مگر خود ہی انصاف فرمائیے - غدّار اور دشمن کے ایجنٹ پاکستان کو اس سے زیادہ کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں ؟ "

("جماعت اسلامی پر ایک نظر" از شیخ محمد اقبال ، ص: ۴۶ تا ۵۶)

حواشی:

(۱) " ترجمان القرآن " میں تو مستفسر کو فقط ایک " کشمیری بزرگ " کہا گیا ہے ، لیکن " مولانا مودودی کی نظر بندی کیوں ؟ " کے نام سے جماعت اسلامی کے شعبہ نشر و اشاعت نے جو پمفلٹ شائع کیا ہے - اس میں لکھا ہے کہ مستفسر آزاد کشمیر گورنمنٹ کے نشر و اشاعت کے انچارج جناب نبی بخش نظامی تھے - "

(۲) ترجمان القرآن ، جون ۱۹۴۸ء ، ص ۱۱۹ (۳) ملاحظہ ہو رسالہ " مولانا مودودی کی نظر بندی کیوں ؟ " شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی ، ص ۹ (۴) ترجمان القرآن - جون ۱۹۴۸ء (۵) " مولانا مودودی کی نظر بندی کیوں ؟ " ، شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی ، ص ۱۱ (۶) ترجمان القرآن ، جون ۱۹۴۸ء (۷) ملاحظہ ہو رسالہ " مولانا مودودی کی نظر بندی کیوں ؟ " ، ص ۱۲ (۸) رسالہ " مولانا

مودودی کی نظر بندی کیوں ؟"، ص ۱۰ (۹) ترجمان القرآن، جون ۱۹۴۸ء (۱۰) نوائے وقت، ۲۔ ستمبر ۱۹۴۸ء (۱۱) نوائے وقت، ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء (۱۲) ملاحظہ ہو رسالہ "مولانا مودودی کی نظر بندی کیوں ؟"، ص ۱۵

تعلیقہ از ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

اس مضمون میں ایک جگہ علامہ شبیر احمد عثمانی اور مولانا نور الحق علوی کا نام آیا ہے۔ جہاں تک حضرت علامہ عثمانی کا تعلق ہے، وہ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ لیکن اس کے باوجود کہ مولانا نور الحق علوی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کے تلامذہ کے سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی تھی اور بلند پایہ علمی شخصیت تھے، ان کے حصے میں وہ شہرت نہیں آئی جو حضرت کے بعض دیگر تلامذہ کو حاصل ہوئی۔ یہاں ان دونوں بزرگوں کا خصوصاً مولانا علوی کا تعارف کرایا جارہا ہے، تاکہ اندازہ ہو سکے کہ مولانا مودودی کے افکار سے جن حضرات نے اختلاف کیا تھا، وہ علم اور فکر و نظر کی کوئی معمولی اشخاص نہ تھے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی:

حضرت علامہ شبیر احمد (۱۸۸۸-۱۹۴۹ء) دیوبند کے مشہور عثمانی خاندان کے فرد تھے۔ وہ مولانا فضل الرحمان کے بیٹے اور مفتی عزیز الرحمان، حبیب الرحمان اور مطلوب الرحمان کے بھائی تھے۔ اس عہد کے اکابر علما میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ متعدد علمی، دینی، تحقیقی اور نہایت فکر انگیز اور ایمان پرور تصانیف ان کی یادگار ہیں۔ شیخ الہند کے ترجمہ قرآن حکیم کے حواشی کی تکمیل قرآنی خدمت میں ان کا عظیم الشان کارنامہ اور فتح الملہم فی شرح المسلم (۳ جلد، نامکمل) ان کی بہت بڑی، یادگار علمی دینی اور حدیث کی خدمت ہے۔ حضرت کی سیاسی خدمات کا ذکر تحریک پاکستان اور قرارداد مقاصد کے ضمن میں حضرت مولانا احتشام الحق تھانوی کے بیان میں آچکا ہے۔ قیام پاکستان کے وقت ہی پاکستان تشریف لے آئے تھے۔ ۱۳۔ دسمبر ۱۹۴۹ء کو بہاول پور کے سفر میں انتقال فرمایا۔ میت کو کراچی لایا گیا۔ ۱۴۔ دسمبر کو تدفین عمل میں آئی۔ اسلامیہ کالج، کراچی کے ایک گوشے میں آسودہ خواب ابدی ہیں۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ واسعۃ وکثیرا کثیرا۔

مولانا نور الحق علوی:

مولانا نور الحق علوی بلند پایہ علمی شخصیت تھے۔ علوم وفنون اسلامی کے مشہور عالم اور

کامیاب مدرس تھے۔ دار العلوم دیوبند کے قابل فخر فرزند اور حکیم الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے افکار و معارف میں بہت گہری نظر رکھتے تھے۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن سے نسبت تلمذ سے مشرف تھے۔ ادب و تفسیر میں متعدد کتب و رسائل کے مصنّف و مفسّر اور شارح تھے اور فلسفیانہ ذوق کے مالک تھے۔ علامہ اقبال مرحوم نے شاہ ولی اللہ دہلوی کی بعض کتب اور بعض عربی کتب و رسائل کے مطالعے میں ان سے استفادے کا اعتراف کیا ہے۔

مولانا نور الحق علوی موضع بسال ضلع اٹک (صوبہ سرحد) میں ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام محمد قاسم تھا۔ ابتدائی تعلیم وطن کے مختلف مدارس میں ہوئی۔ تکمیل کے لیے دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے۔ حضرت شیخ الہند کے تلمّذ کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۰ء میں فراغت پائی۔ ایک سال کے قریب دار العلوم دیوبند ہی میں تدریس کی خدمات انجام دیں۔ پنجاب یونی ورسٹی سے عربی اور فارسی میں اعلیٰ قابلیت کے امتحانات پاس کیے۔ پنجاب کے بعض عربی مدارس میں مدرس رہے۔ مدرسہ دار الرشاد (پیر جھنڈا، ضلع حیدر آباد۔ سندھ) میں صدر مدرس کی حیثیت سے تقریباً چار سل تک خدمات انجام دیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی کی صحبت سے فیض یاب ہونے کا موقع بھی ملا تھا اور انھیں کی صحبت نے ان میں ولی اللّٰہی علوم و معارف کا خاص ذوق پیدا کر دیا تھا۔ دسمبر ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۲ء تک اورینٹل کالج، لاہور میں عربی کے پروفیسر رہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا رسالہ "ہمعات" ۱۳۴۵ھ ان کی تصحیح و تحشیہ کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ ادب و تفسیر میں ان کی تصانیف الکامل للمبرد کی شرح عذب المناہل، منشور حکم خلاصہ دبیر عجم، سورہ علق، المزمل اور المدثر کی تفاسیر وغیرہ یادگار ہیں۔ ۱۰۔ مارچ ۱۹۵۱ء کو ان کے انتقال کا حادثہ پیش آیا اور حضرت شیخ الہند کے ایک تلمیذ رشید کے فیضان علمی سے دنیا محروم ہو گئی۔ اللھم اغفرلہ وارفع درجاتہ۔

مسلم لیگ کی منافقانہ کوششیں

مولانا مودودی کا ایک خط

ماخوذ



دار السلام، جمال پور۔ پٹھان کوٹ　　　　مورخہ: ۲۰۔ رمضان ۱۳۶۳ھ (۱)

ریلوے اسٹیشن سرنا　　　　نشان: ۷۶۹

مکرمی و محترمی! السلام علیکم ورحمتہ اللہ

عنایت نامہ ملا۔ سید غلام مرتضیٰ صاحب کی طرف سے جو سوال نامہ آیا تھا۔ اس کا جواب میں دے چکا ہوں۔ نیز وہاں سے بعض اصحاب نے جو تحریر اس سلسلے میں بھیجی تھی، ان کے سامنے بھی میں نے اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا تھا۔ اگر آپ میرے ان جوابات کو ملاحظہ فرمائیں تو آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ دہلی حاضر ہو کر میں کوئی خاص خدمت انجام نہ دے سکوں گا۔ علاوہ بریں میں ایک بات اور بھی صاف صاف

کہہ دینا چاہوں ۔ مسلم لیگ کی قیادت اس وقت جن اصحاب کے ہاتھ میں ہے ۔ ان کے طرز عمل میں صریح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اندر اسلام کی پیروی کا قطعاً کوئی ارادہ موجودہ نہیں ہے ، بلکہ مسلمانوں میں زیادہ سے زیادہ جو لوگ اسلام سے منحرف ہیں وہ مسلم لیگ کے موجودہ لیڈروں (۲) کی آزاد روی پر رشک کر سکتے ہیں ۔ اس کے بعد جب ہم لیگ کی طرف سے اس قسم کی آوازیں سنتے ہیں کہ مسلمانوں میں صحیح اسلامی روح پیدا کی جائے اور ان تمام غیر اسلامی رسوم وافکار کا استیصال کرنے کے لیے جو مسلمانوں میں رائج ہو گئیں ہیں ، موثر ذرائع اور طریق کار تجویز کیے جائیں اور ان مقاصد کے لیے کمیٹیاں مقرر کی جاتی ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ مسلمانوں میں اس قیادت کا اعتبار جمانے کی ایک منافقانہ کوشش ہے اور یہ محسوس ہونے کے بعد پھر اس کوشش میں حصّہ لینے کو کسی طرح ضمیر گوارا نہیں کرتا گو یہ میری دلی خواہش ہے کہ مسلمانوں میں جو کام بھی کسی صحیح مقصد کے لیے صحیح طرز پر ہو رہا ہو ، اس میں حصّہ لوں اور جو کچھ بھی بھلی یا بری خدمت مجھ سے بن آئے ، سرانجام دوں ۔ لیکن مسلمانوں کو فریب میں مبتلا کرنے کی کسی کوشش میں ، یہ صاف جانتے ہوئے تعاون کرنا ممکن نہیں ہے ۔ (باالفاظ سید ابوالاعلیٰ مودودی)

خاکسار طفیل محمد

قیم جماعت اسلامی برائے سید ابوالاعلیٰ مودودی

ہفت روزہ لیل ونہار ، کراچی ۔ ۷ تا ۱۳ ۔ دسمبر ۱۹۷۰ء

حواشی:

۱۔ مطابق ۸ ۔ ستمبر ۱۹۴۴ء

۲۔ اشارہ قائداعظم محمد علی جناح ، قائد ملت لیاقت علی خاں اور دوسرے مرکزی رہنماؤں کی طرف ہے ۔

مسلمان عوام، رہنماؤں اور انکی جماعتوں کا تجزیہ

مولانا مودودی کے قلم سے

ترتیب: ابو سلمان شاہجہان پوری

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے مسلمان عوام، رہنماؤں اور ان جماعتوں کا تفصیل کے ساتھ تجزیہ کیا ہے۔ ان کی خرابیوں، بدکاریوں، گمراہیوں کی نشان دہی کی ہے، پھر اپنی جماعت اور اپنی ذات کا نقش اجاگر کیا ہے۔ ہم یہاں ترتیب وار مولانا کے افادات بیان کیے دیتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی تنقید کس مقام سے شروع ہوتی ہے، کہاں ختم کرتے ہیں اور اس سے کیا نتیجہ نکالتے ہیں۔

(الف)

مسلمان، عوام اور ان کی حالت

۱۔ تہذیب سے ناآشنا اور اسلامی شعور سے عاری قوم:

"مسلمانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ ان کا سواد اعظم اپنی قومی تہذیب اور اس کی امتیازی خصوصیات سے ناواقف ہے۔ حتیٰ کہ ان میں ان

حدود کا شعور تک باقی نہیں رہا ہے، جو اسلام کو غیر اسلام سے ممیز کرتی ہیں۔"
(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ اول، ص ۳۴۰)

۲۔ اخلاقی اوصاف سے محروم قوم:

"(مسلمانوں میں) .... وہ اخلاقی اوصاف باقی نہیں جن کی بدولت یہ قومی مفاد کی حفاظت کے لیے اجتماعی کوشش کر سکیں۔ ان میں اتنی تمیز نہیں کہ صحیح راہنما کا انتخاب کر سکیں، ان میں اطاعت کا مادہ نہیں کہ کسی کو راہنما تسلیم کرنے کے بعد اس کی بات کو مانیں اور اس کی ہدایت پر چلیں، ان میں اتنا ایثار نہیں کہ کسی بڑے مقصد کے لیے اپنے ذاتی مفاد، اپنی ذاتی رائے، اپنی آسائش اپنے مال اور اپنی جان کی قربانی کسی حد تک بھی گوارا کر سکیں۔"

(ایضاً، ص ۳۴۲)

۳۔ مسلمانوں کو کتوں سے تشبیہ:

"ان کا حال یہ ہو گیا ہے کہ جہاں کسی نے روٹی کے چند ٹکڑے اور نام نمود کے چند کھلونے پھینکے، یہ کتوں کی طرح ان کی طرف لپکتے ہیں اور ان کے معاوضے میں اپنے دین و ایمان، اپنے ضمیر، اپنی غیرت و شرافت اپنی قوم و ملت کے خلاف کوئی خدمت بجا لانے میں ان کو باک نہیں ہوتا۔"

(ایضاً، ص ۳۴۲)

۴۔ مسلمانوں میں منافقین کی کثرت:

"ہماری قوم میں منافقین کی ایک بڑی جماعت شامل ہے اور اس کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بہ کثرت اشخاص تعلیم یافتہ، صاحب قلم، صاحب زبان، صاحب مال و زر، صاحب اثر ایسے ہیں جو دل سے اسلام اور اس کی تعلیمات پر یقین نہیں رکھتے، مگر نفاق اور قطعی بے ایمانی کی راہ سے

مسلمانوں کی جماعت میں شریک ہیں۔ یہ اسلام سے عقیدۃً اور عملاً نکل چکے ہیں۔"

(ایضاً، ص ۳۴۳)

۵۔ ۹۹۹ فی ہزار تمیزِ حق و باطل سے ناآشنا مسلمان:

"ایک قوم کے تمام افراد کو محض اس وجہ سے کہ وہ نسلاً مسلمان ہیں، حقیقی معنی میں مسلمان فرض کر لینا اور یہ امید رکھنا کہ ان کے اجتماع سے جو کام بھی ہو گا اسلامی اصول ہی پر ہو گا، پہلی اور بنیادی غلطی ہے۔ یہ انبوہ عظیم جس کو مسلمان قوم کہا جاتا ہے۔ اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار افراد نہ اسلام کا علم رکھتے ہیں نہ حق و باطل کی تمیز سے آشنا ہیں، نہ ان کا اخلاقی نقطہ نظر اور ذہنی رویہ اسلام کے مطابق تبدیل ہوا ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام ملتا چلا آرہا ہے، اس لیے یہ مسلمان ہیں۔ نہ انھوں نے حق کو حق جان کر اسے قبول کیا ہے۔ نہ باطل کو باطل جان کر اسے ترک کیا ہے۔ ان کی کثرت رائے کے ہاتھ میں باگیں دے کر اگر کوئی شخص یہ امید رکھتا ہے کہ گاڑی اسلام کے راستے پر چلے گی تو اس کی خوش فہمی قابل داد ہے۔

(ب)

مسلمان رہنما اور ان کی سیرت

سب قابل رد ہیں:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے مسلم لیگ، احرار اسلام، خاکسار پارٹی، جمعیت علمائے ہند، آزاد حریت نواز، عام رہنما، علمائے دین کسی کو نہیں بخشا ان کے اسلامی نظریہ۔ سیاست کی کسوٹی پر کوئی پورا نہیں اترا۔

۱۔ اس اقتباس پر مسلم لیگیوں، نیشنلسٹوں اور علما کے لیے جو الفاظ استعمال کیے ہیں۔

ان پر بھی غور فرمائیے:

"جو لوگ مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے اٹھتے ہیں ان کی زندگی میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ادنیٰ جھلک تک نظر نہیں آتی۔ کہیں مکمل فرنگیت ہے۔ کہیں نہرو اور گاندھی کا اتباع ہے۔ کہیں جبوں اور عماموں میں سیاہ دل اور گندے اخلاق لیے ہوئے ہیں۔ زبان سے وعظ اور عمل میں بدکاریاں، ظاہر میں خدمت دین اور باطن میں خیانتیں، غداریاں اور اغراض نفسانی کی بندگیاں۔"

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ اول، ص ۲۸۳)

۲۔ اس اقتباس میں مندرجہ بالا تینوں جماعتوں کو قرآن حکیم میں بنی اسرائیل کے لیے بیان کردہ ایک لعنتی خطاب سے نوازا ہے:

"مسلمانوں میں سے جو لوگ اس انقلاب کے دامن سے وابستہ ہیں ان کی زندگیاں ہمارے سامنے ہیں۔ ان کی صورتیں، ان کے لباس، ان کی بات چیت، ان کی چال ڈھال، ان کے آداب واطوار، ان کے خیالات سب کچھ ہمارے سامنے اس مسلمان کا نمونہ پیش کر رہے ہیں جو اس آنے والے انقلاب میں پیدا ہو گا۔ ہم ابھی سے دیکھ رہے ہیں کہ مسٹروں کی بجائے شری یت اور مسوں کی بجائے شریمتیاں ہمارے ہاں پیدا ہونے لگی ہیں۔ گڈ مارننگ کی جگہ ہاتھ جوڑ کر نمستے کیا جانے لگا ہے۔ ہیٹ کی جگہ گاندھی کیپ لے رہی ہے اور بعض علمائے دین فتویٰ دے رہے ہیں کہ یہ تشبہ کی تعریف سے خارج ہے اور کونوا قردۃ خاسئین (ہو جاؤ ذلیل بندر) کی لعنت ...... اب ایک دوسری شکل اختیار کر رہی ہے۔"

(ایضاً، ص ۳۳۸، ۳۳۹)

۳۔ ایک اور جگہ مسلمان رہنماؤں کو تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ یہ گویا نمبر ا کی مزید تشریح ہے اور ان کے یہ خصائص بتائے ہیں۔ ان میں دوسرا گروہ مسلم لیگی رہنما ہیں:

"مسلمانوں میں زیادہ تر تین گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ آزادیِ وطن کے لیے بے چین ہے اور کانگریس کی طرف کھنچ رہا ہے یا کھنچ گیا ہے۔ دوسرا گروہ اپنی قومی تہذیب اور اپنے قومی حقوق کی حفاظت کے لیے انگریز کی گود میں جانا چاہتا ہے اور آئندہ انقلاب کے خطرات سے بچنے کی یہی صورت مناسب سمجھتا ہے کہ سرکار برطانیہ کا معاون بن کر آزادی کی تحریک کو روکے۔ تیسرا گروہ عالم حیرت میں کھڑا ہے اور خاموشی کے ساتھ واقعات کی رفتار کو دیکھ رہا ہے۔"

(ایضاً، ص ۳۵۰)

۴۔ اور اس اقتباس میں مسلمانوں کی تمام ہی جماعتوں کو رد کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"مسلم لیگ، احرار، خاکسار، جمعیۃ العلماء اور آزاد کانفرنس سب کی اس وقت تک کی تمام کارروائیاں حرف باطل کی طرح محو کر دینے کے لائق ٹھہرتی ہیں۔"

(ایضاً، حصہ سوم، ص ۹۰)

۵۔ مسلمانوں میں جو مختلف جماعتیں کام کر رہی تھیں۔ ان میں بعض شخصیات نہایت قابل احترام تھیں۔ ان کے علم و تقویٰ کا شہرہ تھا۔ ان کی ملی خدمات کی عظیم الشان تاریخ تھی اور وہ ایثار و قربانی کا سرمایہ اپنے دامنوں میں رکھتی تھیں۔ بعض شخصیات نے دنیاوی یا کسی اور خصوصیت کی بنا پر مسلم معاشرے میں اپنا مقام اور مسلمانوں میں اپنا نام اور احترام پیدا کیا تھا۔ بعض جماعتوں کی ملی خدمات کی تاریخ کے صفحات اگر زریں نہ تھے تو ان کے نعروں اور دعاوی میں عام مسلمانوں کے لیے بڑی کشش تھی۔ یہ تمام باتیں مولانا مودودی اور ان کی "جماعت اسلامی" کی طرف مسلمانوں کے رجوع میں بڑی رکاوٹ تھیں اور مولانا کے لیے ضروری تھا کہ وہ ان تمام رکاوٹوں کو دور فرمائیں۔ اس کے لیے تنقید اور تنقیص لازمی امر تھا۔ مولانا نے اس ذمے داری کو محسوس فرمایا اور تنقید و تنقیص ہی نہیں فرمائی بلکہ علمائے دین اور دیگر رہنماؤں کو جن خطابات سے نوازا ہے۔ اس میں وہ شاید جوشِ تنقید میں حد سے بھی گزر گئے۔ اس

کا فیصلہ مولانا کے ان افکار کی روشنی میں، خود فرمالیں ۔مولانا فرماتے ہیں:

"ان میں کچھ مخلص ملاحدہ ہیں ....، کچھ دوسرے لوگ مکار ملاحدہ ہیں ....، کچھ اور لوگ نیم الحاد اور نیم اسلام کے مقام پر ہیں ....، کچھ اور لوگ ہیں جن کی اسلام سے بغاوت فکری و نظری بنیادوں پر نہیں، بلکہ یا تو اخلاقی بنیادوں پر ہے یا معاشی بنیادوں پر۔ ....

ایک اور گروہ مذہبی سوداگروں کا ہے، جس کا سارا کاروبار ہی اس پر منحصر ہے کہ عام مسلمان اپنے دین سے جاہل رہیں۔ مشرکانہ اوہام میں مبتلا رہیں ان سے بہت مختلف کچھ دوسرے مذہبی سوداگر بھی موجود ہیں۔ .... جن کے لیے سب سے بڑا مسئلہ اپنی گدیوں اور چھوٹی چھوٹی مذہبی ریاستوں کی حفاظت کا ہے ان میں سے ہر ایک نے جن اسامیوں اور گاہکوں کو اگلوں سے میراث میں پایا ہے یا خود اپنی محنت سے فراہم کیا ہے۔ ان کو وہ ہر قیمت پر اپنے کاروبار سے وابستہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے اقامت دین کی کسی ہمہ گیر تحریک کو، خواہ وہ کیسی ہی صحیح بنیادوں پر اٹھی ہو اور کتنی ہی سلامت روی کے ساتھ چلائی جارہی ہو اور خود ان کا اپنا علم اور ضمیر اس کے برحق ہونے کی شہادت دے رہا ہو، برداشت کرنا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ .... وغیرہ وغیرہ۔

(جماعت اسلامی، اس کا مقصد تاریخ، اور لائحہ عمل از سید ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۸۲ تا ۸۴)

۶۔ دنیاوی لیڈروں کے مقابلے میں علمائے دین کو مولانا مودودی اپنے راستے کی بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے ۔اس لیے سب سے زیادہ زور بیان انھوں نے انھی کی مخالفت میں صرف کیا ہے اور انھیں ہر طرح رد کرنے اور عام مسلمانوں کی نظروں سے گرانے کی کوشش کی ہے ۔چند اقتباس ملاحظہ ہوں۔

(الف) "اپنے آپ کو مسلم (یعنی متبعین انبیاء) کہنے کے باوجود انھوں نے اس نصب العین اور اس راہ عمل کو چھوڑ کر ایسے مقاصد اور طریقے اختیار کرلیے ہیں، جن کو اسلام سے کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔"

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش، حصہ سوم، ص ۸۲)

(ب) "یہ قرآن کو کس نظر سے پڑھتے ہیں کہ ہزار بار پڑھنے کے بعد بھی انھیں اس قطعی اور دائمی پالیسی کی طرف ہدایت نہیں ملتی جو مسلمانوں کے لیے اصولی طور پر مقرر کر دی گئی ہے۔"

(ج) یہاں تک کہ مولانا مودودی صاحب نے علمائے دین کو اسلام کا چھپا دشمن قرار دیا اور ان کے مساعی کو "سب سے زیادہ خطرناک گمراہی" قرار دیا۔ فرماتے ہیں:

"گمراہیوں میں سب سے زیادہ خطرناک وہ گمراہی ہے جو ہدایت کے لباس میں جلوہ گر ہو، آپ کھلے دشمن سے زک اٹھا سکتے ہیں مگر دھوکا نہیں کھا سکتے ہیں، اسی طرح آپ کھلی کھلی گمراہی کی طرف بلانے والے سے متاثر ہو کر مرتد تو بن سکتے ہیں مگر اس غلط فہمی میں نہیں پڑ سکتے کہ اصل اسلام وہی ہے جس میں اب آپ ہوئے ہیں۔ ایک شخص علانیہ آکر اسلام کی مخالفت کرے، قرآن پر حملہ کرے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر اعتراضات کرے اور اسلام کے عقائد، اصول، احکام، سب کو غلط ٹھہرائے تو مسلمان یا تو اس کی بات کو رد کر دے گا اور اسلام پر قائم رہے گا یا پھر اسلام کو چھوڑ کر اس کے مذہب میں چلا جائے گا اور اپنے آپ کو مسلمان کہنا چھوڑ دے گا۔ لیکن اس شخص کا معاملہ کتنا پر فریب ہے جو آکر مسند ارشاد پر بیٹھے، قرآن کھول کر وعظ شروع کرے، آیات الٰہی کی تفسیر بیان کرے، ایمان و عمل صالح کی طرف دعوت دے، عبادات میں خلوص کی تلقین کرے اور جب اس طرح آپ کے دل پر اس کا ہادی برحق اور داعی خیر ہونے کا سکہ بیٹھ جائے تو وہ آپ کو یہ سمجھانا شروع کر دے کہ نماز پانچ کی نہیں، صرف تین وقت کی فرض ہے۔ روزے پورے رمضان کے نہیں، صرف تین یا حد سے حد دس دن کے فرض ہیں، زکوٰۃ کے لیے کوئی نصاب مقرر نہیں، جس قدر دل چاہے خیرات کر دیا کرو اور اس طرح اسلامی احکام میں سے ایک ایک کی قطع برید کرتے ہوئے ہر قدم پر وہ ساتھ ساتھ آپ کو یہ بھی یقین دلاتا جائے کہ یہی قرآن کی تعلیم ہے اور یہی رسولؐ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ بیچارے عام ناواقف مسلمانوں کا ایسے زہر سے بچنا کس قدر مشکل ہے جو یوں مٹھائی میں ان کو دیا جا رہا ہے۔" (تفہیمات، حصہ دوم، ص ۱۶۲)

۷۔ اسلامی تحریک کے مزاج سے ناواقف:

اس دور میں جو حضرات اسلام کے نمائندے اور مسلمانوں کے قائد ورہنما بنے ہوئے ہیں، وہ جزئیات شرع پر کتنا ہی عبور رکھتے ہوں، بہر حال اسلامی تحریک کے مزاج کو وہ نہیں سمجھتے اور نہیں جانتے کہ اس تحریک کو چلانے اور آگے بڑھانے کا طریقہ کیا ہے؟

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ سوم، ص ۸۲)

۸۔ ایک مظلمہ عظیم کے مرتکب علما:

"اللہ اس کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے ورنہ ڈر ہے کہ جس راہ پر وہ اس جذبے کے ساتھ چل رہا ہے اس میں اپنی عمر بھر کی کمائی ضائع کردے گا اور قیامت کے دن اس حال میں خدا کے سامنے حاضر ہوگا کہ ساری عبادتیں اور نیکیاں اس کے نامہ اعمال سے غائب ہوں گی اور ایک قوم کی قوم کو گمراہی اور ارتداد میں مبتلا کرنے کا مظلمہ عظیم اس کی گردن پر ہوگا۔"

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش، حصہ دوم، ص ۱۹۲)

۹۔ تمام رہنما، مذہبی وسیاسی گم کردہ راہ:

"سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین ومفتیان شرع مبین، دونوں قسم کے رہنما اپنے نظریے اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں دونوں راہ حق سے ہٹ کر، تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔" (ایضاً، حصہ سوم، ص ۷۷)

۱۰۔ توفیق حق سے محروم:

"لیکن جہاں تک ان کے ایک ایسا عنصر ہونے کا تعلق ہے جو تحریک اقامت دین کی راہ روکنے والا ہے۔ ہماری ان سے جنگ ہے، ہم جانتے ہیں کہ اس عنصر کے بہت کم افراد کو بے لاگ حق پرستی کی توفیق نصیب ہوا کرتی ہے۔"

(جماعت اسلامی ....، ص ۸۶)

۱۱۔ مکار ملاحدہ، مذہبی سوداگر اور راہ خدا کے رہزن:

"یہ غریب تعلیم کے لیے جدید درس گاہوں میں جاتے ہیں تو وہاں زیادہ تر مخلص اور مکار ملاحدہ یا نیم مسلم و نیم ملحد حضرات سے ان کو پالا پڑتا ہے۔ قدیم مدارس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اکثر مذہبی سوداگروں کے ہتے چڑھ جاتے ہیں۔ دینی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو خطیبوں اور واعظوں کی عظیم اکثریت انھیں گمراہ کرتی ہے۔ روحانی تربیت کے طالب ہوتے ہیں تو پیروں کی غالب اکثریت ان کے لیے راہ خدا کی رہزن ثابت ہوتی ہے۔"

(ایضاً، ص ۸۹، ۹۰)

۱۲۔ حقیقت و روح اسلام سے ناآشنا:

ان پڑھ عوام ہوں، یا دستار بند علما، یا خرقہ پوش مشائخ یا کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ حضرات ان سب کے خیالات اور طور طریقے ایک دوسرے سے بدرجہا مختلف ہیں۔ مگر اسلام کی حقیقت اور اس کی روح سے ناواقف ہونے میں یہ سب یکساں ہیں۔"

(تفہیمات، جلد اول، ص ۳۶)

۱۳۔ حقیقت قواعد شرعیہ سے ناواقف:

"مگر یہ مسلمانوں کی سخت بد قسمتی ہے کہ جو لوگ ان کے مقتدا بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بعض تو حقیقتہً قواعد شرعیہ سے ناواقف ہیں اور صرف حمل اسفار کی حد تک علم رکھتے ہیں۔ اور بعض ذی علم تو ہیں مگر خدا کے سامنے اپنی ذمے داری کا احساس نہیں رکھتے۔ اس لیے انھوں نے اپنا شیوہ بنا لیا ہے کہ جہاں کسی سے ناراض ہوئے بلا تامل اس کے خلاف کفر کا حکم صادر کر دیا۔ یہ لوگ بے تکلف کفر و الحاد کے الفاظ کو غلط کے معنے میں بولتے ہیں ہر وہ چیز جو ان کی راے میں غلط ہے وہ یا تو کفر ہے یا الحاد یا دہریت۔ بہت رعایت کریں گے تو فسق اور گم راہی کا حکم لگا دیں گے۔ اس سے کم وزن کا کوئی لفظ ان کی لغت میں ہے ہی نہیں۔" (تفہیمات، جلد دوم، ص ۱۳۹)

۱۴۔ علما کی قدامت پرستی:

"افسوس ہے کہ مدتوں کی چلی ہوئی اس روش کو چھوڑنے پر ہمارے علمائے کرام کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔ انھوں نے اصل، فرع نص اور تاویل کے فرق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وہ ان فروع کو بھی اصول بنائے بیٹھے ہیں جن کو انھوں نے خود یا ان کے اسلاف نے اپنے مخصوص فہم کی بنا پر اصول سے اخذ کیا ہے۔ وہ ان تاویلات کو بھی نصوص کے درجے میں رکھتے ہیں جو نصوص سے معانی اخذ کرنے میں ان کے گروہ نے اختیار کی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنے فروع اور اپنی تاویلات کے منکر کو بھی اسی طرح کافر قرار دیتے ہیں، جس طرح اصول اور نصوص کے منکر کو قرار دیا جاتا ہے۔"

(ایضاً، ص ۱۵۲)

۱۵۔ جزئیات کے شیدائی:

"ان مسائل کو ہدایہ و بدائع کی روشنی میں حل کرنے کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں۔ جس کا خطرہ نوجوان سائل نے اپنے استفسار میں ظاہر کیا ہے (الی ان قال) قدم قدم پر عالمگیری اور تاتار خانی کو لا کر سند راہ بنانے کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ نئے زمانے کے مسلمان قرآن اور حدیث کو بھی پیچھے چھوڑ کر جدھر منہ اٹھے گا چل نکلیں گے۔"

"ہر نئی چیز سے پرانے تمدن کی ترقی کے راستے میں ہر ہر قدم پر ٹھٹک کر کھڑے ہو جانے کی کیفیت جو آج کل پیش آرہی ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ شرع کے اصول و کلیات کو سمجھنے کے بجائے، ہمارے علما زیادہ تر فقہی جزئیات کے استقصاء میں منہمک رہتے ہیں۔"

(ایضاً، ص ۳۸۶ و ۳۸۸)

(ج)

شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی

۱۔ خاص اہداف تنقید:

گزشتہ صفحات میں علمائے دین کے بارے میں مولانا مودودی کے جو خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ ان میں کسی خاص مکتبہ فکر کی تخصیص معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا عبید اللہ سندھی اور حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمہم اللہ تعالیٰ پر انھوں نے خاص نظر التفات فرمائی ہے۔ مولانا ابو الکلام آزاد کے بارے میں انھوں نے فیصلہ فرما دیا تھا کہ ان کی جگہ اسلام کے دائرے کے اندر نہیں۔ مولانا سندھی کے بارے میں مولانا مسعود عالم ندوی کا سلسلہ مضامین مطبوعہ معارف کتابی شکل میں بھی چھپ چکا ہے۔ اس سے اندازہ کر لیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے افکار وفلاسفی کے نام پر اشتراکیت کی تبلیغ کی ہے اور یہ کہ اگر وہ سکھ سے مسلمان نہ ہوتے تو شاید اسلام کے لیے اتنے خطرناک نہ ہوتے اور مسلمان ہو کر انھوں نے اسلام کو جو نقصان پہنچایا، وہ سکھ رہتے ہوئے نہ پہنچا سکتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مدنی کے بارے میں "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" حصہ دوم وسوم رسالہ "مسئلہ قومیت" کی تحریرات میں جو کچھ نام لیے بغیر لکھا ہے۔ وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ انھیں غیرت ایمانی سے محروم اور متحدہ قومیت کے بھوت کا مرکب قرار دیا ہے۔ ذیل کی عبارت مودودی صاحب کے قلم سے ہے اور "مولوی صاحب" سے مراد شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی ہیں:

> "اس آزادی کے پروانے کو لے کر جو "مولوی صاحب" پشاور سے مدراس تک ماس کنٹیکٹ کی تبلیغ کرتے پھر رہے ہیں، انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ پروانہ آپ کو اتنی آزادی ضرور دیتا ہے کہ قال اللہ وقال الرسول

میں مشغول رہیں۔ آپ کی داڑھی یقیناً بزور دستی نہیں مونڈی جائے گی، نہ آپ کی عبا ضبط کی جائے گی، نہ آپ کی تسبیح چھینی جائے گی۔ البتہ اس امر کی ضمانت نہیں کہ آپ کی نسل سے دوسری پشت میں کوئی اودے شنکر اور تیسری پشت میں کوئی دیوکارانی برآمد نہ ہوگی۔"

(ترجمان القرآن، جمادی الاولی ۱۳۵۷ھ)

ہم تو خیر حضرت کے عقیدت کیش اور ارادت مند ہیں۔ اس لیے اس تحریر کی شدت کو زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ لیکن کیا کسی مسلک کے کسی بھی عالم دین کے لیے اس سے زیادہ تحقیر و توہین آمیز تحریر کا تصور کیا جا سکتا ہے؟

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"اسلام کا علم رکھنے والے عبا پوشوں پر متحدہ قومیت کا بھوت سوار ہے۔ ان کی غیرت ایمانی سرد ہو چکی ہے۔"

(ترجمان القرآن، ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ)

۲۔ خاندان شیخ الاسلام اور ان کی تین پشتوں کا امتیاز:

اب اس دنیا میں نہ حسین احمد مدنی ہیں نہ مودودی جن کی پیشین گوئی پر نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ لیکن یہ حقیقت دنیا کے سامنے ہے کہ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کی دوسری ہی نہیں، تیسری پشت یعنی اولاد کی اولاد میں بھی تمام افراد مرد و زن علمائے دین، حفاظ، قراء، محدث، مفسر، دینیات کے مدرس، خطبائے اسلام، مبلغین دین، مصنفین اسلام، مسند نشین شریعت اور اصحاب طریقت میں سے کسی نہ کسی بلکہ کئی کئی صفات سے بہ یک وقت متصف ہیں اور ان میں سے ہر کوئی اپنے دائرے میں اپنی بساط علم و توفیق کے مطابق علوم و فنون اسلامی کے درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تبلیغ و اشاعت دین، ارشاد و ہدایت، غرضے کہ علم و عمل کے کسی نہ کسی میدان میں امت مسلمہ اور ملک و قوم کی

خدمت انجام دے رہا ہے۔ ابھی تک تو اس خاندان میں نہ کوئی اودے شکر پیدا ہوا نہ دیو کارانی! اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ آئندہ بھی اس خاندان رفیع الارکان کو اپنی خاص عنایات سے نوازے گا اور اپنی حفاظت میں رکھے گا۔

خاکسار کے علم کے مطابق اس خاندان کی تیسری پشت میں ایک درجن سے زیادہ لڑکیاں حفاظ وقراء موجود ہیں اور متعدد علوم اسلامی میں منتہی بعض خواتین موجود ہیں۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ۔ یہ حضرت مدنیؒ کی تعلیم وتربیت کے برگ وبار ہیں۔ لیکن کیا مودودی صاحب کی اولین پشت یعنی اولاد میں بھی کوئی عالم دین، حافظ، قاری، علوم اسلامی کا منتہی نہ سہی مبتدی اور عالم نہ سہی صورتاً ہی حضرت شیخ الاسلام کی تیسری پشت کے کسی خرد کی مثال پیش کر سکتا ہے؟ پھر اگر حضرت شیخ الاسلام کی تعلیم وتربیت کے ثمرات میں آپ کے تلامذہ، مریدین، مسترشدین کو جو بلاشبہ حضرت کی مثل اولاد کے تھے اور پھر ان کے سلسلہ ہائے درس ورشد وہدایت کو بھی شامل کر لیا جائے تو ہندوستان پاکستان کے ایک ایک شہر میں اتنی تعداد میں وابستگان دامن نکل آئیں گے کہ پورے پاکستان یا کل ہندوستان میں بھی جماعت اسلامی کے اتنے اراکین ومتفقین نہ ہوں گے۔ بہرحال حضرت شیخ الاسلام کے خاندان کے بارے میں تو مودودی صاحب کی پیشین گوئی یا آرزو پوری نہ ہوئی۔ لیکن جہاں تک مولانا مودودی صاحب کی اولاد کا تعلق ہے، اگر کوئی صاحب تحقیق کی ضرورت محسوس فرمائیں تو جماعت اسلامی کے مرکز "منصورہ" (لاہور) جاکر کسی جماعت اسلامی کے بزرگ یا خرد سے تعریف پوچھ آئیں۔ "اودے شکر" اور "دیو کارانی" بھی ان صفات سے متصف نظر نہ آئیں گے۔ لیکن میرے علم کے مطابق وہ اپنے والد کے ان عقائد سے دور، جماعت اسلامی کے سحر سے آزاد اور سیدھے سادے مسلمان ہیں۔ جماعت اسلامی کے بارے میں ان کے وہی خیالات ہیں جو عام طور پر اہل سنت وجماعت کے دیو بندی یا اہل حدیث مکاتب فکر کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انھیں مزید خیر کی توفیق عطا فرمائے۔ اور عقیدہ وعمل، ہر لحاظ سے سچا مسلمان بنائے۔ آمین۔

مولانا مودودی کی مزاج نبوی سے مناسبت اور مقام تفرد:

یہ تو مسلمان عوام، رہنماؤں اور علماے دین پر تنقید تھی۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مولانا مودودی صاحب نے وقت کے رہنماؤں اور علماے دین کو ہر وہ گالی دی اور ہر وہ الزام لگایا، جس کی تہذیب اجازت دیتی تھی اور زبان قلم سے بیان کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ابھی اس تنقید کے لیے تاریخی جواز کی ضرورت تھی۔ تاکہ ان پر نکتہ چینی اور تنقید کا الزام نہ آئے۔ یہ ضرورت انھوں نے ائمہ فقہ میں اختلاف بیان کرکے پوری کر لی۔ گویا کہ یہ گناہ جس کا الزام ان پر آسکتا ہے ایسا نہیں جس میں وہ تنہا ہوں، بلکہ ائمہ کرام کا دامن علم و تقویٰ پہلے ہی اس سے داغ دار ہو چکا ہے۔ چناں چہ اپنے مسلک تنقید کے جواز میں فرماتے ہیں:

"اور یہ وہی مسلک ہے جو ائمہ مجتہدین نے اختیار کیا۔ امام ابو حنیفہ کے فقہ میں آپ بہ کثرت ایسے مسائل دیکھتے ہیں۔ جو مرسل اور معضل اور منقطع احادیث پر مبنی ہیں یا جن میں ایک قوی الاسناد حدیث کو چھوڑ کر ایک ضعیف الاسناد حدیث کو قبول کیا گیا ہے یا جن میں احادیث کچھ کہتی ہیں اور امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کچھ کہتے ہیں۔"

(تفہیمات، حصہ اول، ص ۲۹۶)

مولانا مودودی کے نزدیک حق و باطل اور غلط و صواب کے لیے یہ کافی ہے کہ ان کا ذوق اس طرف رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے لیے کسی اصول اور ضابطے کی ضرورت نہیں۔ چناں چہ مودودی صاحب لکھتے ہیں:

"یہ چیز چوں کہ سراسر ذوقی ہے اور کسی ضابطے کے تحت میں نہیں آتی نہ آسکتی ہے۔ اس لیے اس میں اختلاف کی گنجائش پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ چناں چہ اسی وجہ سے ائمہ مجتہدین کے درمیان جزئیات میں بہ کثرت اختلافات ہوئے ہیں پھر یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ ایک شخص کا ذوق لامحالہ دوسرے شخص کے ذوق سے کلیتاً مطابق ہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ

ایک ہی مسلک کے ائمہ نے بہت سے مسائل میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے۔"

(ایضاً، ص ۲۹۷)

اس کے بعد اپنے تئیں مزاج نبوی سے آشنا اور تنقید سے بالا ہونے کے لیے ان الفاظ میں روشنی ڈالتے ہیں:

"اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا بہت زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے۔ مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لے لیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی نظر اس افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند، مقبول حدیث سے بھی اعراض کر جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس جام زریں میں جو بادۂ معنی بھری ہوئی ہے وہ اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوی کے مناسب نظر نہیں آتی۔"

(ایضاً، ص ۲۹۷)

اب مزاج نبوی اور اسلام سے مناسبت کی بنا پر آن کی رائے گرفت سے، فیصلہ اختلاف سے اور شخصیت تنقید سے بالا ہو گئی ہے اور انھیں یہ حق حاصل ہو گیا کہ اب وہ فقہ و حدیث و تفسیر کے کسی مسئلے میں جو فیصلہ چاہیں کر دیں۔ ان کا مقام "امیر" کا ہے۔ وہ اپنے تشخص کا جواز ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

"امیر کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اکثریت کے ساتھ اتفاق کرے۔ اسے یہ حق حاصل ہے کہ پوری مجلس سے اختلاف کر کے اپنی رائے پر فیصلہ کرے۔"

(جماعت اسلامی کا سیاسی کردار، ص ۸)

مولانا مودودی صاحب نے صرف اصول تک ہی بات نہ رکھی بلکہ جہاد کشمیر، حکومت کی وفاداری کے حلف اور فوج میں بھرتی وغیرہ، بہت سے مسائل میں اپنے تفرذات کی مثالیں قائم کر دیں۔ جن کا ذکر اس کتاب میں کسی جگہ آئے گا۔یہاں ان کے تفرد کی صرف ایک مثال پیش خدمت ہے۔ان کے ذوق تفقہ نے اسلامی شریعت کی یہ حقیقت ان پر واضح کی ہندیونین اور پاکستان کے مسلمانوں میں باہم رشتہ۔ مناکحت قائم نہیں ہونا چاہیے۔ حضرت مولانا کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"آئندہ شادی بیاہ کا تعلق پاکستانی اور ہندوستانی مسلمانوں کے درمیان نہ ہونا چاہیے۔"

(ترجمان القرآن، شعبان ۱۳۷۰ھ۔ جون ۱۹۵۱ء)

صرف جماعت اسلامی ایک اصولی اور لائق اتباع جماعت ہے:

مسلمانوں میں کام کرنے والی تمام جماعتیں قابل رد، اسلام کی حقیقی راہ سے منحرف، گم کردہ راہ اور سب رہنما باطل کے پیرو ہیں تو اب صرف ایک جماعت اور صرف ایک شخصیت حقیقی اسلام کی داعی اور لائق اتباع رہ جاتی ہے۔وہ شخصیت مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت "جماعت اسلامی" ہے۔جماعت اسلامی کی دعوت کے بارے میں ان کے خیالات کتنے بلند ہیں۔اس کا اندازہ مندرجہ۔ ذیل خیالات سے کیا جاسکتا ہے۔اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

۱۔ "ہمارا راستہ ان سب گروہوں سے الگ ہے اور ہم مجبور ہیں کہ ان کے علی الرغم اپنے مسلک کی تبلیغ بھی کریں۔"

(جماعت اسلامی، اس کا مقصد، تاریخ اور لائحہ عمل، ص ۱۵، ۱۶)

۲۔ "اسلام کے پورے نظام زندگی کو جیسا کہ وہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں بیان ہوا ہے۔ معقول اور مدلل اور مفصل طریقے سے پیش کیا گیا۔اس کے عقائد اور ایمانیات کیا ہیں، اس کا

نظریہ، کائنات و انسان کیا ہے، اس کا فلسفہ، اخلاق کیا ہے، اس کی عبادات کس غرض کے لیے ہیں، وہ انسانی سیرت و کردار کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہتا ہے۔ اس کی تہذیب کے بنیادی اصول کیا ہیں وہ تمدن، معیشت، معاشرت اور سیاست کے لیے کیا قاعدے تجویز کرتا ہے، اس کے مزاج سے کس قسم کا نظام تعلیم مناسبت رکھتا ہے، وہ انسانی زندگی کے مسائل کو پہلے کس طرح حل کرتا رہا ہے اور آج کس طرح کر سکتا ہے، اس کے نظام زندگی کو برپا کرنے کے لیے پہلے کیا کچھ کیا گیا ہے اور آج کیا کچھ کیا جا سکتا ہے؟ ان تمام امور کو جہاں تک ہمارے بس میں تھا ہم نے ایسے طریقوں سے پیش کرنے کی کوشش کی جو موجودہ دور کے ایک تعلیم یافتہ آدمی کو مطمئن کر سکیں۔"

(جماعت اسلامی، محولہ بالا، ص ۲۱)

۳۔ "اول روز سے ہمارے پیش نظر ایک ایسی اجتماعی جدوجہد برپا کرنا تھا، جو خالص اصولی حیثیت سے اسلام کی دعوت لے کر اٹھے۔"

(ایضاً، ص ۳۰)

۴۔ "اس کی دعوت، طریق کار اور اصول تنظیم وہی ہیں، جو قرآن و سنت کے مطابق اقامت دین کی سعی کرنے والی ایک جماعت کے ہونے چاہییں۔"

(ایضاً، ص ۵۳)

۵۔ "اول روز سے ہمارا اعتماد تربیت کے اس فطری طریقے پر رہا، جس سے مکے کے ابتدائی مسلمان تیار کیے گئے تھے۔"

(ایضاً، ص ۴۹)

۶۔ "جماعت اسلامی خالی خولی تقریریں اور تحریریں اور اجتماعی سرگرمیاں لیے ہوئے سامنے نہیں آگئی ہے، بلکہ وہ انفرادی سیرت، جماعتی اخلاق بھی ساتھ لائی ہے جو اسلام کی اگر مکمل نہیں تو کم از کم صحیح نمائندگی ضرور کرتا ہے۔" (ایضاً، ص ۸۰)

۷۔ "جس چیز کو ہم لے کر اٹھ رہے ہیں وہ عین اسلام اور اصل اسلام ہے۔"
(روزنامہ تسنیم۔لاہور، ۱۸۔جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۱)

۸۔ "ہم دراصل ایک گروہ تیار کرنا چاہتے ہیں جو ایک طرف زہد وتقویٰ میں اصطلاحی زاہدوں اور متقیوں سے بڑھ کر ہو اور دوسری طرف دنیا کے انتظام کو چلانے کی قابلیت وصلاحیت بھی عام دنیا داروں سے زیادہ اور بہتر رکھتا ہو۔"

(دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات، ص ۸)

۹۔ مولانا نے اپنی جماعت کی اصولی، اسلامی و شرعی حیثیت ہی کو ثابت نہیں کیا ہے، بلکہ یہ دعوا بھی کیا ہے کہ نہ صرف ان کی دعوت بلکہ ان کا طریق کار بھی قرآن حکیم اور انبیاے کرامؑ کے طریقے سے ماخوذ ہے۔فرماتے ہیں:

"ہماری دعوت کی طرح ہمارا یہ طریق کار بھی دراصل قرآن اور انبیاء علیہم السلام کے طریقے سے ماخوذ ہے۔"

(دعوت اسلامی اور اس کے مطالبات، ص ۲۴)

اوپر مولانا مودودی کا قول گزر چکا ہے کہ جس چیز کو ہم لے کر اٹھ رہے ہیں وہ "عین اسلام" اور "اصل اسلام" ہے۔ جوں کہ وہ جماعت اسلامی اور اس تحریک کو نہ صرف اسلام کا مترادف سمجھتے ہیں بلکہ اس کے "عین اسلام اور اصل اسلام" ہونے کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں۔اب انھوں نے یہ تو نہیں کہا کہ جو جماعت اسلامی سے باہر ہے وہ کافر ہے۔لیکن بہ انداز دگر انھوں نے یہی بات کہی ہے یعنی یہ کہ اس میں داخل ہو کر نکل جانا، عام جماعتوں میں شمولیت اور ان سے اخراج کی طرح نہیں بلکہ شمولیت اختیار کر کے نکلنا "ارتداد" کے حکم میں داخل ہے۔مولانا ابواللیث اصلاحی امیر جماعت اسلامی (ہند) فرماتے ہیں:

"یہ وہ راستہ نہیں جس میں آگے بڑھنا اور پیچھے ہٹنا یکساں ہیں۔یہاں پیچھے ہٹنے کے معنے ارتداد کے ہیں اور خدا کی طرف سے پیٹھ موڑنے کے ہیں۔"

(جماعت اسلامی کا پہلا اجتماع، شعبان ۱۳۶۰ھ، ص ۹)

ظاہر ہے کہ جس جماعت میں شامل ہو کر پیچھے ہٹنا "ارتداد" ہو، وہاں پیچھے رہنا یا اس کی دعوت سے اعراض وانکار "کفر" ہو گا۔

جماعت اسلامی

آپ کی تحریک اسلامی خلافِ سلفِ صالحین، مثل معتزلہ، خوارج، روافض، جہمیہ، وغیرہ فرق قدیم اور مثل قادیانی، چکڑالوی، مشرقی، نیچری، مہدوی، بہائی وغیرہ فرق جدیدہ، ایک نیا اسلام لانا چاہتی ہے اور اسی کی طرف لوگوں کو کھینچ رہی ہے۔ وہ ان اصول وعقائد واعمال پر مشتمل ہے جو کہ اہل سنت والجماعت اور اسلاف کرام کے خلاف ہے۔

(شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی مکتوب بنام امیر جماعت اسلامی ہند (ابو اللیث اصلاحی) مکتوب ہدایت، صفحہ ۸، ادارہ نشر واشاعت دار العلوم دیو بند)

قومیت اور جمہوریت سے انکار سے اقرار تک

محمد سرور جامعی

جماعت اسلامی کی بے اصولی و موقع پرستی

۱۹۴۷ء سے پہلے مولانا مودودی اس بنا پر تحریک پاکستان اور نظریہ۔ پاکستان کے مخالف تھے کہ ان کی اساس قومی اور جمہوری ہے، اور موصوف کا کہنا تھا:

"اور اگر اسلامی نصب العین آپ کے سامنے نہیں ہے بلکہ محض سادہ معنی میں ایک قوم کی حیثیت سے آپ اپنی انفرادیت کا تحفظ چاہتے ہیں اور اپنے اندر نیشنل ازم کی روح پیدا کرکے دوسری قوموں کے ساتھ کامیاب مسابقت کرنا آپ کا آخری مطمح نظر ہے تو بلاشبہ آپ کو اپنے پیشواؤں میں اسلام کا رنگ دیکھنے کی ضرورت نہیں اور مجھے آپ سے کسی بحث کی ضرورت بھی نہیں، آپ کا راستہ جدا ہے اور میرا راستہ جدا۔ البتہ وہی بات پھر کہوں گا جو اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اپنی اس قوم پرستانہ تحریک کے لیے آپ کو اسلام کا نام استعمال کرنے کا حق نہیں ہے، کیوں کہ اسلام ہر قسم کی قوم پرستی کا دشمن ہے، خواہ وہ ہندوستانی قوم پرستی ہو یا نام نہاد "مسلم قوم پرستی۔"

پاکستان کا مطالبہ جمہور کے حق خود ارادیت کے اصول پر کیا گیا تھا۔ اور

مودودی صاحب سرے سے اس کے خلاف تھے، چناں چہ اس زمانے میں انھوں نے لکھا تھا:

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میں حکم الناس علی الناس للناس کے نظریے کا قائل نہیں ہوں ..... میرے نزدیک انگلستان پر انگریزوں کی حاکمیت اور فرانس پر اہل فرانس کی حاکمیت بھی غلط ہے، بلکہ اس سے زیادہ غلط ....."

اور ان کے نزدیک

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لیے اس مسئلے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں، وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے، میرے نزدیک جو سوال سب سے اقدم ہے، وہ یہ ہے کہ آپ کے اس پاکستان میں نظام حکومت کی اساس خدا کی حاکمیت پر رکھی جائے گی یا مغربی نظریہ جمہوریت کے مطابق عوام کی حاکمیت پر؟ اگر پہلی صورت ہے تو یقیناً یہ "پاکستان" ہو گا، ورنہ بصورت دیگر یہ ویسا ہی "ناپاکستان" ہو گا، جیسا ملک کا وہ حصہ ہو گا، جہاں آپ کی اسکیم کے مطابق غیر مسلم حکومت کریں گے۔"

اس تمام عرصے میں مودودی صاحب جی بھر کر جمہوریت اور ڈیموکریسی کی مخالفت کرتے رہے اور اس میں یہاں تک غلو سے کام لیا کہ ان کے نزدیک اس امر کی بھی کوئی قدر و قیمت نہ رہی کہ ہندوستان کو انگریزی امپریل ازم سے آزاد کرایا جائے، کیوں کہ ان کا کہنا یہ تھا کہ

"اگر آزادی کی یہ ساری لڑائی صرف اس لیے ہے کہ امپریل ازم کے الٰہ کو ہٹا کر ڈیموکریسی کے الٰہ کو بت خانہ حکومت میں جلوہ افروز کیا جائے تو مسلمان کے نزدیک در حقیقت اس سے کوئی فرق بھی واقع نہیں ہوتا۔ لات گیا، منات آگیا۔ ایک جھوٹے خدا نے دوسرے جھوٹے خدا کی جگہ لے لی۔ باطل کی زندگی جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ کون مسلمان اس کو آزادی کے لفظ سے

تعبیر کر سکتا ہے؟"

مولانا کے نزدیک مغربی تہذیب کے تین بنیادی اصول ہیں؛ اول سیکولر ازم، دوسرے نیشنل ازم اور تیسرے ڈیموکریسی یعنی حاکیت جمہور، ان کی رائے میں یہ تینوں اصول فاسد ہیں اور ان کی اساس پر جو نظام قائم ہے۔ اس کا بدلنا ان کی جماعت کا اصل مدعا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

"ہمارا اصل مدعا موجودہ نظام کے چلانے والے ہاتھوں کا بدلنا نہیں ہے، بلکہ خود نظام کا بدلنا ہے۔ ہماری کوششوں کا مقصود یہ نہیں ہے کہ نظام تو یہی رہے اور انھی اصولوں پر چلتا رہے، مگر اس کو مغربی نہ چلائے، مشرقی چلائے، یا انگریز نہ چلائے، ہندوستانی چلائے، یا ہندو نہ چلائے، "مسلمان" چلائے۔ ہمارے نزدیک محض ہاتھوں کے بدل جانے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ سو،ر تو، بہرحال سو،رہی ہے، اور اپنی ذات میں ناپاک ہے، خواہ اسے کافر پکائے یا مسلمان باورچی، بلکہ "مسلمان" باورچی کا سو،ر پکانا اور بھی زیادہ افسوس ناک ہے اور گمراہ کن بھی۔"

گویا مولانا کے نزدیک سیکولر ازم، نیشنل ازم اور ڈیموکریسی کی اساس پر قائم شدہ نظام سو،ر کے گوشت کی طرح ہے کہ اسے خواہ مسلمان پکائے، یا غیر مسلم، وہ ناپاک ہی رہے گا۔ اس ضمن میں موصوف کو شکایت یہ ہے کہ

"بہت سے بندگان خدا حتیٰ کہ اچھے خاصے پرہیزگار لوگ بھی اس ظالم کے ہاتھ کا پکا ہوا سو،ر اس اطمینان کی بنا پر کھا جائیں گے کہ یہ مسلمان کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا ہے اور اگر اس پخت و پز کے دوران میں وہ چمچے کی ہر گردش پر باآواز بلند بسم اللہ پڑھتا رہے اور اس کے چنے ہوئے دستر خوان پر مسلمانوں کو کافر کے دستر خوان کی بہ نسبت تناول ماحضر کی زیادہ آسانیاں اور آزادیاں میسر ہوں اور محض طعام کے گرد و پیش کچھ ایسے لوازم بھی فراہم کر دیے جائیں جو عام طور پر اسلامی لوازم سمجھے جاتے ہیں تو یہ اور بھی زیادہ سخت دھوکا دینے والی چیز ہوگی۔ اس قسم کی نمائشی اسلامیت اگر موجود ہو تو وہ اس حرام خوراک

کو قبول کر لینے کے لیے کوئی سفارش نہیں ہے، بلکہ یہ ظاہر فریبیاں اس معاملے کو اور بھی زیادہ پر خطر بنا دیتی ہیں۔"

اس لیے مودودی صاحب کا کہنا یہ تھا کہ

"ہم کسی ایسی ظاہری تبدیلی پر نہ تو خود مطمئن ہو سکتے ہیں اور نہ کسی کو مطمئن ہوتے دیکھ سکتے ہیں، جس میں یہ فاسد نظام تو جوں کا توں قائم رہے اور صرف اس کے چلانے والے ہاتھ بدل جائیں۔ ہماری نظر ہاتھوں پر نہیں، بلکہ ان اصولوں پر ہے جن پر زندگی کا نظام چلایا جاتا ہے۔"

مولانا مودودی نے یہ باتیں ۹۔ مئی ۴۷ء کو اپنی جماعت اسلامی کے ارکان کو مخاطب کرتے ہوئے کہی تھیں۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی موصوف اسی لہجے میں قومیت، جمہوریت اور ڈیموکریسی کی سخت سے سخت الفاظ میں مذمت کرتے رہے اور ان کا تمام تر زور اس بات پر رہا کہ پاکستان کی قومی پارلیمنٹ کو جمہور پاکستان کی نمائندہ ہونے کی حیثیت سے یہ حق نہیں ہونا چاہیے کہ وہ خود مختارانہ طور پر قانون سازی کر سکے۔ ضرورت ایک ایسے بورڈ کی ہے، جس میں پانچ علما ہوں اور ایک سپریم کورٹ کا جج۔ یہ بورڈ فیصلہ کرے کہ کون سا قانون قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق ہے اور کون سا ان کے خلاف۔ اس بورڈ کا فیصلہ آخری اور قطعی سمجھا جائے۔ اور یہ اس لیے کہ مودودی صاحب کے نزدیک جمہور کی حاکمیت کا اصول اسلام کے خلاف ہے، بلکہ ان کے نائب مولانا امین احسن اصلاحی تو اسے ایک "غلیظ قسم کا شرک" قرار دیتے ہیں۔

مودودی صاحب اور ان کی جماعت اسلامی گزشتہ بیس سال تک ڈیموکریسی اور جمہوریت کو لعنت اور شرک و کفر ثابت کرتے رہے ہیں۔ ان کے نزدیک جمہوری اور قومی نظام حکومت، خواہ وہ حکومت مسلمانوں اور غیر مسلموں کی ملی جلی ہو، یا ترکی اور پاکستان کی طرح صرف مسلمانوں کی، اسلام کے خلاف ہے۔ اس طویل عرصے میں

کوئی ناشدنی الزام اور کوئی گالی ایسی نہیں، جو انھوں نے ڈیموکریسی اور جمہوریت کو نہ دی ہو۔ موصوف نے اپنی تحریک اسلامی کا مقصد ہی "حکم الناس" یعنی حاکمیت جمہور کی مخالفت قرار دیا تھا۔

لیکن آپ اسے حالات کی ستم ظریفی کہیے یا مولانا مودودی کی بے اصولی اور موقع پرستی کہ جب ۱۹۵۳ء میں مارشل لاء کے دوران لاہور میں ان پر مقدمہ چلنے لگا، تو انھوں نے اپنے وکیل سے کہا۔

"...... ہمارا لٹریچر اور دستور اور ہمارا نظام جماعت یہ بتا سکتا ہے کہ ہم لوگ سب سے زیادہ جمہوریت پسند ہیں اور ہمارے ہاں ڈکٹیٹرانہ ذہنیت کی سرے سے گنجائش نہیں۔"

مودودی صاحب نے یہ بات اپنے وکیل کے اس سوال پر کہی تھی، جس میں اس نے کہا تھا:

"اوپر والوں کا خیال ہے، کہ مولانا مودودی برسراقتدار آکر ایک بدترین ڈکٹیٹر شپ جمانا چاہتے ہیں اور اسی لیے مولانا مودودی نے انتخابات میں حصہ لینے کا اقدام بھی کیا، اور دستور کا مسئلہ بھی چھیڑا ہے، یہ مذہبی ڈکٹیٹر شپ اگر ایک مرتبہ قائم ہو گئی تو پھر کسی کی خیر نہیں، لہٰذا پوری سختی سے اس طاقت کو کچل دینا چاہیے۔"

اور اس کے بعد جب مودودی صاحب رہا ہوئے تو انھوں نے ڈیموکریسی اور جمہوریت کے متعلق اپنا پرانا مسلک ہی بدل دیا اور اب وہ اس کے گن گانے لگے۔ ۱۸ جون ۱۹۵۵ء میں سرگودھا میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

"...... تیسری چیز ڈیموکریسی ہے۔ اس کی بنا دو چیزوں پر ہے ایک یہ اصول کہ حکومت عوام کی مرضی سے ہو، .... اور عوام کی مرضی سے ختم ہو، دوسرا اصول یہ کہ انتخابات بالکل آزاد ہوں، یہ دونوں اصول کار فرما نہ ہوں، تو جمہوریت بالکل بے معنی ہے اور اگر جمہوریت نہ ہو تو آزادی کے معنی صرف

حکمراں کی آزادی ہے، باشندوں کی آزادی نہیں۔"

یہ تین چیزیں جن کی طرف مولانا نے اپنی اس تقریر میں اشارہ کیا ہے۔ان میں سے ایک تو RULE OF LAW اور دوسری شہری آزادی ہے، مولانا کا کہنا تھا کہ

"یہ تین چیزین ایسی ہیں، جن پر تمام گروہوں کو متحد و متفق ہو کر جدوجہد کرنی چاہیے۔"

مودودی صاحب کے ساتھ ساتھ جمہوریت اور ڈیموکریسی کے معاملے میں ان کی جماعت اسلامی نے بھی اپنی پالیسی بدل دی چنانچہ اس کی قرارداد میں اب اسلام اور جمہوریت کا نام ایک ساتھ لیا جانے لگا۔حالاں کہ ۱۹۳۳ء سے لے کر ۱۹۵۳ء تک مولانا کی تمام ترجدوجہد کا مقصد جمہوریت کے مغربی نظام حکومت کا مقابلہ کرنا اور اسے شکست دینا تھا اور ان کا اس بات پر اصرار تھا کہ اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ جمہوری نظام حکومت ہے۔

جمہوریت اور ڈیموکریسی کی تعریف میں مولانا اور بھی آگے بڑھ گئے چنانچہ اگست ۱۹۵۵ء کے "ترجمان القرآن" میں وہ لکھتے ہیں:

"دوسری بنیاد جس پر اتفاق ہو سکتا ہے، جمہوریت ہے، یہ خود قرآن وسنت کا منشا بھی ہے اور باشندگان ملک کی خواہشات کا تقاضا بھی۔"

اس وقت تک مولانا کے نزدیک اگر اسلام کی راہ مشرق کو جاتی تھی تو جمہوریت کی مغرب کو، اور دونوں کا ملاپ ناممکن تھا۔اور جو لوگ اسلام اور جمہوریت کی یک جائی کے مدعی تھے۔ مولانا ان کو بے نقط سناتے اور ان کو اسلام کا دشمن گردانتے تھے، اپنے اسی اصول پر انھوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی اور نظریہ پاکستان کو خلاف اسلام ٹھہرایا، لیکن وہی مولانا ۱۹۵۵ء میں جمہوریت کی تعریف کرتے نہیں تھکتے، اور اپنے ماہ نامہ "ترجمان القرآن" میں لکھتے ہیں:

"ان سب حقائق کو تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ عظیم ترحقیقت اپنی جگہ قائم رہتی ہے کہ ایک قوم کی ان کمزوریوں کو دور کر کے اسے بحیثیت مجموعی ایک بالغ قوم بنانے کا راستہ جمہوریت ہی ہے۔" (اگست ۱۹۵۵ء)

اور اسی سلسلے میں اہل پاکستان کو مخاطب کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں:

"...... تمام وہ لوگ جو ملک کے آئندہ نظام کی تشکیل پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ پہلے جمہوریت کے اصول کو صدق دل سے قبول کرلیں اور پھر نیک نیتی کے ساتھ ایسا نظام بنائیں جس میں یہ اصول ٹھیک کارفرما ہو۔"

اور آخر میں جب پاکستان کا دستور بنا اور مجلس دستور ساز نے اسے منظور کیا تو گو اس کی اساس ڈیموکریسی اور جمہوریت تھی اور اس میں حاکمیت جمہور کا اصول نہایت واضح طور پر تسلیم کیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود مودودی صاحب اور ان کی جماعت نے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے اسلامی دستور مانا، اور بیس سال تک وہ جو کچھ لکھتے اور کہتے رہے تھے، اسے بالکل بھول گئے، بے اصولی اور موقع پرستی کی اس سے زیادہ اور کیا مثال ہو سکتی ہے "واقعہ یہ ہے کہ مودودی صاحب کی ساری سیاسی زندگی اسی قسم کی بے اصولیوں اور موقع پرستیوں سے پر ہے (۱)۔

(۱) "جماعت اسلامی کا سیاسی کردار" کے عنوان سے سندھ ساگر اکادمی، لاہور نے ایک کتابچہ شائع کیا تھا۔ یہ رسالہ ایک "مسلمان" کے قلم سے تھا۔ لیکن مجھے ذاتی طور پر علم ہے کہ یہ کتابچہ "پروفیسر محمد سرور جامعی" مرحوم نے لکھا تھا۔ جماعت اسلامی کے سیاسی کردار کو سمجھنے کے لیے یہ ایک نہایت مفید رسالہ ہے۔ یہ طویل اقتباس اسی کے صفحہ ۲۱ تا ۳۰ سے ماخوذ ہے۔

منیر انکوائری رپورٹ اور جماعت اسلامی

پاکستان کی قرارداد مسلم لیگ نے اپنے لاہور کے اجلاس میں ۱۹۴۰ء میں منظور کی تھی اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان قائم ہوا۔ اس سات سال کے عرصے میں مودودی صاحب نے نظریہ۔ پاکستان کی ایڑی سے لے کر چوٹی تک شدید مخالفت کی اور اس سارے عرصے میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا کہ مودودی صاحب یا ان کی جماعت اسلامی نے کبھی کوئی کلمہ خیر پاکستان اور قائداعظم کے حق میں کہا ہو (۱) ۔ چناں چہ اس کے ثبوت میں ہم رپورٹ تحقیقاتی عدالت کا ایک اقتباس پیش کرتے ہیں، جو جسٹس محمد منیر اور جسٹس ایم۔آر کیانی مرحوم کی مرتب کردہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"جماعت اسلامی کی ذمّہ داری کے مسئلے پر بحث کرنے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ اس جماعت کے اغراض ومقاصد اور اس کی سرگرمیوں کے دائرے کا مختصر حال بیان کر دیا جائے۔ جماعت اسلامی تقسیم سے قبل موجود تھی۔ اس کا صدر مقام پٹھان کوٹ ضلع گورداس پور تھا اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اس کے بانی تھے۔ تقسیم کے بعد مولانا پاکستان چلے آئے اور انھوں نے ۱۹۵۲ء میں جماعت اسلامی پاکستان کے لیے ایک نیا آئین وضع کیا۔ ہندوستان کی جماعت اسلامی اب تک کام کر رہی ہے اور اس کا اپنا علاحدہ آئین ہے۔

جماعت اسلامی کا نظریہ نہایت سادہ ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دنیا بھر میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کی جائے۔ جس کا دوسرے الفاظ میں یہ مطلب ہے کہ ایک دینی سیاسی نظام قائم کیا جائے۔ جس کو جماعت "اسلام" کہتی ہے۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے وہ نہ صرف پروپیگنڈے کو ضروری سمجھتی

ہے بلکہ آئینی ذرائع سے (اور جہاں ممکن ہو وہاں قوت سے) سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خواہاں ہے، جو حکومت جماعت کے تصوّر پر مبنی نہ ہو، مثلاً اس کی بنیاد قومیت پر ہو، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کے نزدیک "کفر" ہے اور تمام لوگ جو ایسی حکومت میں ملازمت یا کسی دوسری حیثیت سے حصّہ لے رہے ہیں یا رضامندی سے اس نظام کی اطاعت کرتے ہیں۔ وہ گنہگار ہیں۔ لہذا جماعت تصور پاکستان کی علی الاعلان مخالف تھی۔ اور جب سے پاکستان قائم ہوا ہے، جس کو " ناپاکستان " کہہ کر یاد کیا جاتا تھا، (۲) یہ جماعت موجودہ نظام حکومت اور اس کے چلانے والوں کی مخالفت کر رہی ہے۔ ہمارے سامنے جماعت کی جو تحریریں پیش کی گئی ہیں ان میں سے ایک بھی نہیں، جس میں مطالبہ، پاکستان کی حمایت کا بعید سا اشارہ بھی موجود ہو۔ اس کے برعکس یہ تحریریں جن میں کئی ممکن مفروضے بھی شامل ہیں۔ تمام کی تمام اس شکل کی مخالف ہیں جن میں پاکستان وجود میں آیا اور جس میں اب تک موجود ہے۔"

(رپورٹ تحقیقاتی عدالت، ص ۲۶۱، بہ حوالہ "جماعت اسلامی اور نظریہ، پاکستان، ص ۴ تا ۵)

حواشی

(۱) مولانا مودودی صاحب نے مسلم لیگ کی تنظیم، اس کے مقاصد، اس کے نظریہ، پاکستان، اس کے رہنماؤں، غرضے کہ اس کے وجود، مقاصد قیام اور رہنمائی کے ہر پہلو سے اختلاف کیا؛

الف: مسلم لیگ کی جماعتی حیثیت، اس کے نظام ترکیبی اور اس کی واقعی مسلمانوں کی نمائندہ حیثیت سے اختلاف کیا۔

ب: اس کے عام مقاصد اور بنیادی تصورات کو غلط بتایا نیز انھیں غیر شرعی قرار دیا۔

ج: اس کے مزاج، اس کی اسپرٹ اور طریق کار پر تنقید کی اور اسے اسلام کے خلاف بتلایا۔

د: اس کے رہنماؤں کی سیرتوں میں کیڑے نکالے، ان کی نیتوں پر حملے کیے اور ان کے خلوص میں ہر طرح سے شکوک و شبہات پیدا کیے۔

اس طرح اپنے مضامین، خطوط اور خطبات سے، ان حضرات کو جو ملک کی تقسیم کو کل

ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد کے نقطہ نظر سے صحیح نہیں سمجھتے تھے، بہت سی معلومات، پختہ دلائل اور ایک بہترین اسلوب کے اسلحہ فراہم کر دیے۔ انھوں نے بڑے سے بڑا کوئی اعتراض یا الزام نہیں لگایا جو مودودی صاحب نے ان سے پہلے مسلم لیگ، اس کے نظریے یا اس کے رہنماؤں کی زندگی کے بارے میں نہ لگا دیا ہو (ش)۔

(۲) جمہوریت اور مسلم قومیت کے نظریے پر قائم ہونے والے مطالبہ پاکستان کو انھوں نے "ناپاکستان" اور "مسلمانوں کی کافرانہ حکومت" کہا تھا۔ اور ہندو قومیت کے نظریے پر قائم ہونے والی حکومت اور مسلمانوں کی کافرانہ حکومت دونوں سے اپنی براءت کا اظہار اور اس کے لیے آزادی کی جدوجہد سے بھی عدم تعلق کا اظہار کر دیا تھا (ش)۔

ج

مولانا مودودی کے مذہبی و دینی عقائد

مولانا مودودی کے دینی عقائد اور مذہبی افکار

ایک سرسری نظر

شیخ محمد اقبال وغیرہ

(۱)

مودودی صاحب کا عقیدہ، تنقید:

مولانا مودودی نے جماعت اسلامی کے دستور کی دفعہ ۶ میں تحریر فرمایا ہے کہ

"رسولؐ خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو۔"

(دستور، جماعت اسلامی، ص ۵)

یہ مودودی صاحب نے اپنا ذاتی عقیدہ بیان نہیں کیا، بلکہ یہ جماعت اسلامی کے متفقہ و منظور شدہ دستور کی ایک دفعہ ہے۔ دستور جماعت اسلامی کی مجلس شوریٰ نے پاس کیا ہے۔ گویا یہ ایک شخص کا محض ناسمجھی کا کلمہ نہیں جو بے خیالی میں اس کے منہ سے نکل گیا ہو۔ اور پھر اسے تائب ہو گیا ہو۔ جماعت کے اہل الرائے ارکان شوریٰ نے سوچ سمجھ کر، غور و فکر اور نظر و تدبر کے بعد اس کی صحت کو تسلیم کرکے اسے منظور کیا ہے۔ اب وہ تمام مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے دستور

اور اس کے مقاصد پر ایمان لاؤ اور ان مقاصد کو بروے کار لانے کے لیے ان کے ساتھ تعاون کرو اور جد و جہد میں ان کا ساتھ دو۔

جماعت اسلامی کے حضرات کہتے ہیں کہ دستور کی دفعہ میں "کسی انسان" سے مراد انبیاء نہیں، ان کے سوا اور انسان ہیں، لیکن دستور کے خالق مودودی صاحب نے تو "اور انسان" یعنی خلفاے راشدین، ازواج مطہرات، صحابہ کرام، صلحاے امت، علماے عظام ہی کو نہیں، انبیاے کرام مثلاً؛ حضرت آدم، حضرت یونس، حضرت داؤد حضرت موسیٰ (علیہم السلام) کو بھی نہیں بخشا۔ انھیں بھی اپنی تنقید کا نشانہ بنا ڈالا۔ مسلمانوں کا مسلمہ عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم عن الخطا ہوتے ہیں، لیکن مودودی صاحب "عصمت" کو بھی انبیاے کرام کے "لوازم ذات" سے نہیں مانتے۔ اس پر بحث تو نمبر ۲ میں آرہی ہے۔ یہاں صرف "رسول خدا کے سوا کسی انسان" یعنی خلفاے راشدین، امہات المؤمنین، صحابہ کرام وغیرہ پر تنقید کے جواز کے بارے میں بعض اشارات کیے جاتے ہیں۔

نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام کے بعد اسلام میں خلفاے راشدین اور صحابہ کرام ایک خاص درجے کی ممتاز شخصیات ہیں۔ ان میں آپس میں کسی بات پر اختلاف ہو سکتا تھا، ازواج مطہرات کا اپنے زوج کریمؐ (فداہ ابی وامی) سے اپنی کسی پسند یا ناپسند کا اظہار ممکن تھا، صحابہ کرامؓ میں ذوق وطبائع کا اختلاف تھا۔ قدیم علما وصلحا میں کوتاہیاں ہو سکتی ہیں، لیکن اس سے یہ کہاں جائز ہو گیا کہ چودھویں صدی ہجری کے ایک صحافی اور "مدن موہن مالویہ" کے مصنف کو انبیاے کرام، خلفاے راشدین، ازواج مطہرات جو امہات المؤمنین ہیں اور صحابہ کرام کو ہدف تنقید بنانے اور بہ زعم خود "حکم" بن بیٹھنے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔ بہ حکم "اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اہتدیتم" امت مسلمہ کا ہر فرد اپنے ذوق اور علم وعمل کے کسی خاص شوق اور رجحان طبع کی بنا پر تربیت یافتگان رسول (صلعم) میں سے کسی صحابیؓ کو اپنا محبوب ومطاع بنا

کر راہ ہدایت طے کر سکتا ہے اور اپنی نجات کا سروسامان فراہم کر سکتا ہے۔ لیکن اسے اپنے ذوق و رجحان کی بنا پر کسی دوسرے تربیت یافتہ۔ رسولؐ (صحابیؓ) کی تنقیص یا ان پر تنقید کا حق حاصل نہیں ہو جاتا۔

مولانا مودودی نے جب اپنے عقیدے کا اظہار کیا تھا اور اسے جماعت اسلامی کے دستور کا جز بنایا تھا تو دین کی کوئی ضرورت اور مصالح امت کی کوئی مجبوری ان کے سامنے نہ تھی۔ وہ آئندہ اپنے عمل کے لیے ایک بنائے جواز قائم کرنا چاہتے تھے۔ جب ہمارے بزرگان دین اور علمائے حق نے غور کیا کہ آخر دین و دنیا کا کون سا مفاد تھا کہ مولانا مودودی کو عقیدے کے اس اعلان اور جماعت اسلامی کے دستور کی اسے شق بنانے کی انھیں ضرورت پیش آگئی تھی؟ تو ان کی فراست ایمانی نے مودودی صاحب کے عزائم کا ادراک کر لیا اور صاف لفظوں میں ان کے عقیدہ۔ تنقید کی نفی کی اور اس کے عدم جواز کا فتویٰ دے دیا۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نے ایک مستفسر کے جواز میں ایک مفصل خط لکھا۔ جس میں مودودی صاحب اور جماعت اسلامی والوں کے اس عقیدے پر سخت گرفت فرمائی۔ حضرت مدنی کا یہ خط "عقائد مودودی کی حقیقت اور مودودی دستور" کے نام سے ایک کتابچے کی شکل میں چھپ گیا ہے۔ اس پر قاری محمد طیبؒ کے قلم سے مقدمہ ہے۔ انھوں نے اس عقیدے کا سخت رد کیا ہے۔ حضرت شیخ الاسلام مدنی نے مودودی صاحب کے اس عقیدے اور دستور جماعت اسلامی کی دفعہ ۶ کے ہر جملے پر مدلل بحث کی ہے۔ اس کتابچے میں یہ بحث بھی مدلل طور پر آگئی ہے کہ مودودی صاحب کے عقائد باطل، گم راہ کن اور اہل السنتہ والجماعتہ سے مودودی صاحب کے اختلافات ہرگز فروعی نہیں بلکہ اصولی ہیں۔

ندوۃ العلماء (لکھنو) کے سابق شیخ الحدیث مولانا محمد اسحاق صدیقی سندیلوی کی تحقیق کے مطابق مودودی صاحب کا تعلق "مذہب باطنیہ" سے ہے۔ "اظہار حقیقت" (دو جلد) میں انھوں نے اپنی اس تحقیق کو بہ تفصیل پیش کیا ہے۔ اس لیے مجھے یقین

ہے کہ مودودی صاحب نے "عقیدہ۔ تنقید" کی آڑ میں "تبرا" کا جواز پیدا کیا ہے۔ میرے ایک شیعہ دوست (محمد حسنین جن کا انتقال ہو چکا ہے) کہتے تھے کہ وہ ہر گز کسی صحابی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر تبرا نہیں کرتے۔ وہ تاریخ اور اپنے ائمہ معصومین اور مجتہدین کرام اور اپنے علمائے محققین کی تحقیق، روایات اور اقوال کی روشنی میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ "خلافت" حضرت علی (کرم اللہ وجہہ) کا حق تھا۔ اب اگر کسی نے ان کا حق انھیں نہیں دیا اور اس پر قبضہ کر لیا تو اس کے لیے عربی کا ایک عام لفظ "غصب" ہے اور غصب ایک فعل شنیعہ ہے جس کے ارتکاب کی معصیت کا ایک عام مسلمان کے بارے میں بھی تصور نہیں کیا جاسکتا۔ چہ جائے کہ کوئی عالی مقام صحابی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بہ حالت عقل وہوش اور بہ قائمی ایمان اس کا مرتکب ہو۔ یہ کہنا تبرا ہر گز نہیں، ایک خالص علمی اور تاریخی تنقید ہے، جس کے جواز کا اہل سنت وجماعت کے مفکر اسلام مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے قولاً اعلان اور عملاً اس کا نمونہ پیش کر دیا ہے اور مسلمانوں کی ایک جماعت (جماعت اسلامی) کے دستور اساسی میں ایک مستقل دفعہ کی شمولیت نے اس عقیدے کو جماعت سے متعلق ہندوستان پاکستان کے ہزاروں مسلمان کے ایمان کا جز بنا دیا ہے۔ رہا تبرا کا وہ مفہوم جو مسلمان لیتے ہیں (یعنی گالی دینا) تو اہل تشیع تو درکنار، اس کا تو کوئی شریف آدمی تصور بھی نہیں کر سکتا! تبرا کے معنی کسی شخص، معاملے، عقیدے وغیرہ سے اپنی براءت اور عدم تعلق کے اظہار کے ہیں اور جب یہ کہا جائے کہ خلافت کے غصب یا اس کے مرتکبین سے ہمارا کوئی تعلق نہیں تو یہ تبرا ہے۔ یہ بات ہمارے عقیدے، ہماری روایات اور ہمارے علما کی تحقیق کے مطابق ہے۔"

مولانا مودودی اس عقیدہ۔ تنقید کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ اس پر عامل اور اس کے آمر وداعی بھی ہیں۔ اس عقیدے نے مولانا مودودی اور ان کی جماعت کو اہل السنتہ والجماعتہ اور اس کے دونوں مکاتب فکر (دیوبندی بریلوی) سے الگ کر دیا ہے

اور اسی عقیدے اور دوسرے گم راہ کن تصورات نے مودودی صاحب اور اہل حدیث کے مابین ایک وسیع خلیج حائل کر دی ہے۔ اب اگر کوئی سادہ لوح مودودی صاحب کے اس عقیدے کو صحیح سمجھتا ہے اور دستور جماعت اسلامی کی متعلقہ دفعہ کو غلط نہیں سمجھتا تو اسے "اہل سنت و جماعت" اور "اہل حدیث" دونوں مسالک حقہ کے ایمان پر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھ لینا چاہیے۔

مولانا احتشام الحق تھانوی مودودی صاحب کے اس عقیدے کو کم از درجہ کفر نہ سمجھتے تھے اور دستور جماعت اسلامی کی متعلقہ دفعہ کو جس میں مسلمانوں کے لیے "امر و دعوت" موجود ہے، دعوت کفر سے مشابہ خیال فرماتے تھے۔ اس باب میں وہ مولانا سید حسین احمد مدنی اور قاری محمد طیب (رحمہما اللہ تعالیٰ) کے خیالات سے حرف بہ حرف متفق تھے۔ تفصیل کے لیے مذکورہ رسالے کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

مودودی صاحب کے دوسرے عقائد بھی جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ (اس بحث کے نمبر ۲ و ۳، شیخ محمد اقبال کی تالیف "جماعت اسلامی پر ایک نظر" سے ماخوذ ہیں۔) ہمارے علما کے نزدیک اسلام کے مسلمہ عقائد سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کے نظام عقائد میں ان کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

(۲)

عقیدۂ عصمت انبیاء:

مولانا مودودی صاحب کے تفردات نے اسلام کے پورے نظام عقائد کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ اسلام میں ایک اہم بنیادی عقیدہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت کا عقیدہ ہے۔ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ انبیاے کرام معصوم عن الخطا ہوتے ہیں اور

عصمت کا تعلق لوازم ذات وخصائص نبوت سے ہے۔ لیکن مودودی صاحب فرماتے ہیں:

"عصمت دراصل انبیاء کے لوازم ذات سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب نبوت کی ذمے داریاں صحیح طور پر ادا کرنے کے لیے مصلحتہ خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ فرمایا ہے، ورنہ اگر اللہ کی حفاظت تھوڑی دیر کے لیے بھی ان سے منفک ہو جائے تو جس طرح عام انسانوں سے بھول چوک اور غلطی ہوتی ہے۔ اسی طرح انبیاء سے بھی ہو سکتی ہے۔"

(تفہیمات، حصہ دوم، ص ۴۳)

عدم محفوظیت خطا اور لغزشوں کا صدور:

مولانا نے اس بیان میں محفوظیت انبیاء پر اپنے عقیدے کا اظہار فرمایا ہے۔ لیکن اسی بیان پر انھوں نے اکتفا کہاں کیا؟ بلکہ انھوں نے تو یہ بھی بتا دیا کہ حضرات انبیائے کرامؑ کی محفوظیت بھی دائمی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے بالارادہ کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ان سے ایک دو لغزشیں سرزد ہو جانے دی ہیں اور یہ ایک نکتہ لطیف ہے۔ جس کا استخراج انھوں نے قرآن کے مطالعے اور مزاج نبوت کے ذوق مناسبت سے کیا ہے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں:

"اور یہ ایک لطیف نکتہ ہے کہ اللہ نے بالارادہ ہر نبی سے کسی نہ کسی وقت اپنی حفاظت اٹھا کر ایک دو لغزشیں سرزد ہو جانے دی ہیں تاکہ لوگ انبیاء کو خدا نہ سمجھیں اور جان لیں کہ یہ بھی بشر ہیں" (ایضاً، ص ۴۳)

مقام نبوت اور مودودی صاحب:

لیکن اگر عصمت انبیاء کے لوازم ذات بنوت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے انبیائے کرام سے بالارادہ لغزشیں سرزد ہو جانے دی ہیں، تو پھر عام انسانوں پر انبیاء

علیہم السلام کی کوئی ترجیح تو نہ رہی اور انبیا کی افضلیت اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے افضل البشر ہونے کا عقیدہ تو پادر ہوا ہو گیا بلکہ اہل تشیع جو اپنے بارہ اماموں کے معصوم ہونے کا وہ عقیدہ رکھتے ہیں، نہ صرف ان کے پہلے اور دوسرے امام حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ جو حضور کے داماد اور نواسے ہیں، بلکہ ان کے گیارھویں اور بارھویں امام سے بھی آں حضرتؐ کم تر درجے پر پہنچ گئے (نعوذ باللہ) اور ثابت ہو گیا کہ منصب امامت منصب نبوت سے اونچا ہے اور شاید اسی عقیدے کا اثبات مودودی صاحب کا منشا ہے اور چوں کہ بارھویں امام کی آمد کا وہ عقیدہ نہیں رکھتے بلکہ وہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ جو تجدید دین اور احیاے اسلام کا کارنامہ انجام دے گا اور جماعت اسلامی والوں کے عقیدے اور خود مودودی صاحب کے دعاوی کے مطابق یہ کارنامہ اس صدی میں انھی نے انجام دیا ہے۔ اس لیے کم از کم اس صدی کے امام مہدی معصوم عن الخطا تو مودودی صاحب ثابت ہو گئے اور جب وہ "امام معصوم" ثابت ہو گئے تو معلوم ہوا کہ ان کا مقام، مقام نبوت اور مقام افضل البشر علیہ الصلوۃ والسلام سے بلند ہے!!! (اعوذ باللہ من ہذہ العقیدہ)

ہواے نفس شریر کی رہزنی:

مودودی صاحب کے ان بیانات سے معلوم ہوا کہ نہ صرف انبیاے کرامؑ معصوم عن الخطا ہی نہ تھے بلکہ لغزشوں میں بھی مبتلا ہوتے رہے تھے۔ ان کا نفس شریر ان کی معرفت حق کی راہ میں بھی مزاحم تھا اور وہ اس کی شرارتوں سے بھی محفوظ نہ تھے۔ بہ قول مولانا عبد الصمد رحمانی:

> "دراصل مولانا مودودی کا قلم محدثین، فقہا کی شان میں بے باکانہ جسارت کرتے کرتے اتنا چھوٹ ہو گیا ہے کہ انبیاے کرام کی شان میں بھی بیباکانہ جسارت سے اس کو باک نہیں ہوتا ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ اس سے بھی

زیادہ پیغمبروں کی شان میں مولانا مودودی کے قلم نے بے باکانہ جسارت کی ہے"۔ (جماعت اسلامی کا دینی رخ، حصہ سوم، ص ۳۱)

ایک جگہ "ہوائے نفس" کے متعلق مودودی صاحب نے یہ لکھتے ہوئے کہ:

"خواہش نفس اول تو معرفت حق ہی میں مانع ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص حق کو پہچان بھی لے تو وہ اس کو اپنے علم کے مطابق عمل کرنے سے روکتی ہے۔ قدم قدم پر مزاحمت کرتی ہے۔ انسان کے نفس میں یہ ایسی زبردست قوت ہے جو اکثر اس کی عقل و فکر پر چھا جاتی ہے اور بسا اوقات اس کو جانتے بوجھتے غلط راستوں پر بھٹکا دیتی ہے۔ معمولی آدمی تو در کنار بڑے بڑے لوگ بھی جو اپنے علم و فضل اور اپنی عقل و بصیرت، اور فہم و فراست کے لحاظ سے یکتائے روزگار ہوئے ہیں۔ اس رہزن کی شرارتوں سے بچنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔"

اس سے آگے بغیر کسی جھجک کے یہ بھی لکھ دیا کہ:

"اور تو اور بسا اوقات پیغمبروں تک کو اس نفس شریر کی رہزنی کے خطرے پیش آئے ہیں۔ چناں چہ حضرت داؤدؑ جیسے جلیل القدر پیغمبر کو ایک موقع پر تنبیہ کی گئی"۔ (تفہیمات، حصہ اول، ص ۱۶۳)

یہی ان کا عقیدہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ہے۔ لیکن اگر خدانہ خواستہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انبیا علیہم السلام بھی نفس شریر کی رہزنی سے محفوظ نہیں رہے تھے تو، پھر ان کی "جلالت قدر" کہاں باقی رہی؟

حقیقت یہ ہے کہ عصمت کو انبیائے کرام کی ذات کے لوازم سے الگ کر کے ان سے لغزشوں کے صدور اور ہوائے نفس کے ابتلا و نفس شریر کی رہزنی سے عدم محفوظیت کا عقیدہ بیان کر کے انھوں نے تبرا کے مفہوم کو وسعت عطا کر دی ہے اور اسے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے لے کر انبیا علیہم السلام کے مقامات علیا تک پھیلا دیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

سنت نبوی اور مودودی صاحب:

سنت نبوی علیٰ جہا الصلوۃ والسلام کے بارے میں ان کا خاص تصور ہے ۔ اول تو انھوں نے سنت عادت اور سنت نبوت کی دو قسمیں قرار دے کر نصف سنن (سنت عادت) کو تو پہلے ہی وجوب سے خارج کر دیا تھا ۔ نصف سنن (سنت نبوت) رہی تھیں ان میں ظاہر و باطن کا فرق کر کے نصف ثانی کو بھی غیر ضروری اور لاحاصل قرار دے دیا ان کے نزدیک حقیقی مسلم اور متقی بنے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل اور سنت کے ظاہری سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرنی ، چند عام افعال کی نقل اتروانی ہے اور نہ اتباع سنت اس کا نام ہے اور نہ اس کی کوئی حیثیت ہے ۔ مودودی صاحب کے الفاظ ہیں:

"اگر اتباع سنت نام ہے ، اس طرز عمل کا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی مرضی پوری کرنے کے لیے ہدایت الٰہی کے تحت اختیار کیا تھا تو یقیناً یہ سنت کی پیروی نہیں بلکہ اس کی خلاف ورزی ہے کہ حقیقی مومن ، مسلم ، متقی اور محسن بنائے بغیر لوگوں کو متقیوں کے ظاہری سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے اور ان سے محسنین کے چند مشہور و مقبول عام افعال کی نقل اتروائی جائے ۔"

(تحریک اسلامی کی اخلاقی بنیادیں از سید ابو الاعلیٰ مودودی ، ص ، ۵۴)

حدیث کے بارے میں مودودی صاحب کا عقیدہ:

احادیث نبوی کے بارے میں مولانا مودودی صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے بارہا منکرین حدیث نے استدلال کیا ہے یہاں تفصیل کا موقع نہیں "مودودیات" پر جن محقق علماے کرام نے قلم اٹھایا ہے ۔ ان کے افادات سے رجوع کرنا چاہیے یہاں صرف ایک اقتباس دیا جاتا ہے ۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں:

"احادیث چند انسانوں سے چند انسانوں تک پہنچتی آئی ہیں ۔ جن سے

حد سے حد اگر کوئی چیز حاصل ہو سکتی ہے تو وہ محض گمان صحت ہے نہ کہ علم الیقین۔

(ترجمان القرآن، ج ۲۸، عدد ۳، ربیع الاول ۱۳۶۵ھ، ص ۲۷)

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ احادیث میں "محض گمان صحت" کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اگر ایک مسلمان کے لیے "محض گمان صحت" کا عقیدہ کافی ہو تو ایک مسلمان اور غیر مسلمان میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ "گمان صحت" کو تو منکروں اور غیر مسلموں نے بھی تسلیم کیا ہے۔ لیکن مودودی صاحب نے تو اس پر بھی بس نہیں کیا اور متعدد احادیث کو جھٹلایا ہے، انھیں افسانہ قرار دیا ہے اور الصادق والمصدوق حضرت نبی کریم علیہ الصلوۃ والسلام روحی فداہ جن کے بارے میں قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ "وماینطق عن الھویٰ" آپ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں فرماتے بلکہ "ان ھو اِلَّا وحیٌ یُّوحیٰ" (سورہ نجم آیت نمبر ۳، ۴) مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ

"حضور کو اپنے زمانے میں یہ اندیشہ تھا کہ شاید دجال آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہی ظاہر ہو جائے یا آپ کے بعد کسی قریبی زمانے میں ظاہر ہو۔ لیکن کیا ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ نے یہ ثابت نہیں کر دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اندیشہ صحیح نہ تھا۔ اب ان چیزوں کو اس طرح نقل و روایت کیے جانا کہ گویا یہ بھی اسلامی عقائد ہیں، نہ تو اسلام کی صحیح نمائندگی ہے اور نہ اسے حدیث ہی کا صحیح فہم کہا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ اس قسم کے معاملات میں نبی کے قیاس و گمان کا درست نہ نکلنا ہرگز منصب نبوۃ پر طعن کا موجب نہیں ہے۔"

(ترجمان القرآن، جلد ۲۸، عدد ۳، ربیع الاول ۱۳۶۵ھ، ص ۳۱)

اور ظہور دجال کی حدیث کو "افسانہ" تو وہ پہلے ہی قرار دیے چکے تھے:

"یہ کانا دجال وغیرہ تو افسانے ہیں، جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔"

(ترجمان القرآن، رمضان و شوال ۱۳۶۴ھ، ص ۱۸۶)

مودودی صاحب نے صرف ایک حدیث کو افسانہ قرار نہیں دیا بلکہ اس کے ساتھ " وغیرہ " کا لفظ استعمال کر کے اس بیان کے اطلاق کا دائرہ بہت وسیع کر دیا ہے۔ اگرچہ بعض احادیث کے بارے میں محقق علما و محدثین نے فن کی روشنی میں بحث کی ہے کہ اور بعض احادیث کو روایت، درایت، یا رواۃ پر بحث کر کے وضعی، ضعیف، غیر احسن یا غیر مستند قرار دیا ہے۔ لیکن سب نے بحث کو صرف انھیں احادیث تک محدود رکھا ہے، عمومیت نہیں دی ہے اور ایک حدیث کو موضوع یا غیر مستند قرار دے کر " وغیرہ " لکھ کر اس کے بحث و نتیجے کے اطلاق کو عام کر کے احادیث کے تمام اور عظیم الشان ذخیرے کو رد نہیں کر دیا ہے۔

اب مناسب ہوگا کہ مودودی صاحب کے مذکورۃ الصدر بیان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ مودودی کا یہ فرمانا کہ کیا ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ نے یہ ثابت نہیں کر دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اندیشہ صحیح نہ تھا۔ کیا کوئی مسلمان بہ قائمی ہوش و حواس اور بہ سلامتی ایمان افضل البشر خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم فداہ وابی وامی کے کسی ارشاد گرامی اور اندیشہ سامی کے غلط ہونے کا تصور بھی کر سکتا ہے۔ چہ جائے کہ اپنے قلم سے فرمودہ نبوتؐ کی عدم صحت کا اعلان کر دے؟ اور صرف اس گمان کی بنیاد پر کہ ساڑھے تیرہ سو برس کی تاریخ میں یہ واقعہ ظہور میں نہیں آیا!

معلوم ہے کہ نزول مہدی علیہ السلام اور دجال کی احادیث آثار قرب قیامت سے تعلق رکھتی ہیں اور " اقتربت الساعتہ وانشق القمر " (۵۴:۱) کے نزول کے بعد تو یہ اندیشہ بھی درست تھا کہ شاید آپ کی حیات مبارکہ ہی میں دجال نمودار ہو جائے، لیکن یہ " قرب " کن ایام و شہور و سنین کے حساب سے قرار دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ مروجہ عیسوی و ہجری کیلنڈر کے حساب سے نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بات اللہ کے علم میں اسی کے حساب کے مطابق تھی۔ پھر اگر یہ ظہور دجال عہد مودودی تک نہیں ہوا تو اس

میں شبہ کیوں کر لاحق ہو سکتا ہے اور یہ بات کیسے قرین صحت ہو سکتی ہے کہ کسی مروجہ کیلنڈر سے ساڑھے تیرہ سو برس گن کر "اندیشہ نبوی" کے غلط ہونے کا (نعوذ باللہ) اعلان فرما دیا جائے۔ اگر اس "قرب" کے تعین اور "اندیشہ نبوی" کی صحت وعدم صحت کے اعلان کا کسی کو حق پہنچتا تھا تو وہ اولین تربیت یافتگان نبوت صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ہو سکتے تھے یا بہ حکم "خیر القران قرنی ثم الذین یلو نہم ثم الذین یلو نہم"، تابعین و تبع تابعین کو۔ لیکن ان کے دل میں اندیشہ نبوی کی صحت کے بارے میں شبہ بھی نہ گزرا۔ ان کے بعد صدیوں کی تاریخ اسلام میں پھیلے ہوئے محدثین کرام، مفسرین عظام اور اکابر و محقق علمائے امت میں سے کسی کو حضرت علیہ الصلوۃ و تسلیمات کے ارشاد گرامی کے افسانہ ہونے کا خیال نہ گزرا۔ آخر جو بات اللہ کے علم و حساب میں ہے۔ اسے دو ٹوک الفاظ میں افسانہ قرار دینے کی جرأت اللہ اور اس کے رسول علیہ الصلوۃ والسلام پر ایمان رکھنے والا کوئی شخص کیوں کر کر سکتا تھا۔ یہ توفیق ملی تو ۱۳۶۴ ہجری میں ترجمان القرآن کے ایڈیٹر، تفہیم القرآن کے مصنف اور جماعت اسلامی کے امیر مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کو! اللھم احفظنا من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا۔

فن اسماء الرجال اور مودودی صاحب:

اسلامی علوم و فنون میں اسماء الرجال ایک عظیم الشان فن ہے۔ جس میں ہزاروں راویان احادیث کے اخلاق، کردار، ذہنی و فکری صلاحیتوں اور دماغی قابلیتوں کو تحقیق و تنقید کی سخت ترین کسوٹیوں پر کس کر اور پھر احادیث کو روایت اور درایت کے اصولوں پر جانچ کر احادیث کے بہ لحاظ صحت درجات مقرر کیے گئے ہیں۔ اس میں اسماء الرجال کا فن، روایت کے طرق اور درایت کے اصول بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ اگر ان اصول و فنون کے بارے میں شبہات پیدا کر دیے جائیں تو پھر

احادیث کے درجہ استناد کو پرکھنا ممکن نہیں رہتا۔ مولانا مودودی صاحب نے یہی کارنامہ انجام دیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

الف: "ان تمام حیثیات سے رواۃ کے احوال کی جانچ پڑتال کر کے محدثین کرام نے "اسماء الرجال" کا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کیا جو بلاشبہ بہایت بیش قیمت ہے مگر ان میں کون سی چیز ہے جس میں غلطی کا احتمال نہ ہو؟

(۱) اول تو رواۃ کی سیرت اور ان کے حافظے اور ان کی دوسری باطنی خصوصیات کے متعلق بالکل صحیح علم ہونا مشکل ہے

(۲) دوسرے خود وہ لوگ جو ان کے متعلق رائے قائم کرنے والے تھے، انسانی کمزوریوں سے مبرا نہ تھے۔ نفس ہر ایک کے ساتھ لگا ہوا تھا اور اس بات کا قوی امکان تھا کہ اشخاص کے متعلق اچھی یا بری رائے قائم کرنے میں ان کے ذاتی رجحانات کا بھی کسی حد تک دخل ہو جائے۔

(۳) یہ امکان محض امکان عقلی نہیں ہے بلکہ اس امر کا ثبوت موجود ہے کہ بارہا یہ امکان فعل میں آگیا ہے" (تفہیمات، حصہ اول، ص ۲۹۳)

ب: "جن حضرات نے رجال کی جرح وتعدیل کی ہے وہ بھی تو آخر انسان تھے۔ بشری کمزوریاں ان کے ساتھ بھی لگی ہوئی تھیں۔ کیا ضرور ہے کہ جس کو انھوں نے ثقہ قرار دیا ہو وہ بالیقین ثقہ ہو اور تمام روایتوں میں ثقہ ہو اور جس کو انھوں نے غیر ثقہ ٹھہرایا ہو وہ بالیقین غیر ثقہ ہو اور اس کی تمام روایتیں پایہء اعتبار سے ساقط ہوں۔ پھر ایک راوی کے حافظے اور اس کی نیک نیتی اور صحت ضبط وغیرہ کا حال بالکل صحیح معلوم کرنا تو اور بھی مشکل ہے۔" (ایضاً، ص ۲۹۴)

قارئین کرام اندازہ کر سکتے ہیں کہ انبیاے کرام کی عصمت، عدم محفوظیت عن الخطا، ان سے لغزشوں کے صدور وظہور، ان کے ہوا و نفس شریر کی رہزنی، سنت نبوی کے تصور، اس کی تقسیم، احادیث کی افسانویت اور "محض گمان صحت" کے عقیدے ارشاد واندیشہء نبوی کی عدم صحت، اسماء الرجال کی اسلامی فنی حیثیت کے انکار، اس میں غلطی کے امکان واحتمال کے عقیدے اور امکان فعل و وقوع کے باب میں مودودی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے نہ صرف اسلام

کے نظام عقائد میں رخنہ پڑتا ہے بلکہ اس کا نظام اخلاق و عبادات بھی درہم برہم ہو جاتا ہے اور اسلام کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔

(۳)

بصر و فواد سے محروم دینی تعلیم کے مراکز:

"آپ کو جس چیز نے امامت کے منصب سے ہٹایا اور خدا ناشناس اہل مغرب کو لا بٹھایا، وہ دراصل یہی ضابطہ تھا۔ آپ کے ہاں مدت ہائے دراز سے علم کی جو حالت تھی۔ اس میں بصر اور فواد دونوں معطل تھے اور سمع کا کام بھی صرف پہلے کی حاصل شدہ معلومات فراہم کرنے تک محدود تھا۔ بخلاف اس کے ناخدا شناس یورپ علم کے میدان میں آگے بڑھا اور امام بن گیا اور آپ مقتدی بن کر رہ گئے۔ آپ کی دینی تعلیم کے تمام مراکز ابھی تک اپنی اسی غلطی پر اڑے ہوئے ہیں جس نے آپ کو اس درجے پر پہنچایا ہے۔"

(ترجمان القرآن، اگست ۱۹۳۸ء)

اسلامی درس گاہیں:

"اسلام کی تعلیم دینے والی درسگاہیں آثار قدیمہ کے محافظ خانوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔" (ترجمان القرآن، جلد ۱۸، عدد ۱)

تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیرے:

قرآن و سنت کی بھی جن اصولوں پر وہ تعلیم دینا چاہتے تھے وہ قدیم کی نسبت جدید سے زیادہ قریب تھے۔ تنقیحات میں فرماتے ہیں:

"علوم اسلامیہ کو بھی ان کی قدیم کتابوں سے جوں کا توں نہ لیجیے بلکہ ان میں سے متاخرین کی آمیزشوں کو الگ کر کے اسلام کے دائمی اصول اور حقیقی

اعتقادات اور غیر متبدل قوانین لیجیے ..... قرآن اور سنت کی تعلیم سب پر مقدم ہے۔ مگر تفسیر و حدیث کے پرانے ذخیروں سے نہیں۔" (ص، ۱۳۳)

تفسیر:

تفسیر کے متعلق بھی ان کا طریق کار قدیم کی نسبت جدید سے زیادہ ملتا جلتا تھا۔ انھوں نے اپنی تفسیر میں پرانے مفسرین سے استفادہ نہیں کیا اپنے تاثرات کو یک جا کیا ہے۔ خود اپنی تفسیر تفہیم القرآن کی ابتدا میں فرماتے ہیں:

"اس میں جس چیز کی کوشش میں نے کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ قرآن کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آئے اور جو اثر میرے قلب پر پڑتا ہے۔ اسے جوں کا توں اپنی زبان میں منتقل کر دوں۔"

علم تفسیر کے متعلق تنقیحات میں آپ نے فرمایا تھا کہ

"قرآن کے لیے کسی تفسیر کی حاجت نہیں۔ ایک اعلیٰ درجے کا پروفیسر کافی ہے۔

(ص ۲۲۲)

اسلامی عبادات:

"آپ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ باندھ کر قبلہ رو کھڑے ہونا، گھٹنوں پر ہاتھ ٹیکنا، زمین پر ہاتھ ٹیک کر سجدہ کرنا اور چند مقرر الفاظ زبان سے ادا کرنا، بس یہی چند افعال اور حرکات بجائے خود عبادت ہیں؟ آپ سمجھتے ہیں کہ رمضان کی پہلی تاریخ سے شوال کا چاند نکلنے تک روزانہ صبح سے شام تک بھوکے پیاسے رہنے کا نام عبادت ہے؟ آپ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے چند رکوع زبان سے پڑھ دینے کا نام عبادت ہے؟ غرض آپ نے چند افعال کی ظاہری شکلوں کا نام عبادت رکھ چھوڑا ہے۔ لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے جس عبادت کے لیے آپ کو پیدا کیا ہے اور جس کا آپ کو حکم دیا ہے۔ وہ کچھ اور ہی چیز ہے۔ وہ

عبادت یہ ہے کہ آپ اپنی زندگی میں ہر وقت، ہر حال میں خدا کے قانون کی اطاعت کریں اور ہر اس قانون کی پابندی سے آزاد ہو جائیں جو قانون الہیٰ کے خلاف ہو۔" (خطبات۔ حصہ سوم، ص ۱۰)

لیکن سوال یہ ہے کہ نماز، روزہ، حج وغیرہ میں ان ظاہری ارکان ومناسک کی پابندی کے بغیر قیام صلوٰۃ وصیام اور ادائے زکوٰۃ وحج کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ اگر ان عبادات کا کچھ اور مقصد ہو، تب بھی ان کی "ظاہری شکلوں" اور ان کے ارکان ومناسک کی پابندی تو لازمی ٹھہرے گی!

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"آپ پوچھیں گے کہ یہ نماز، روزہ اور حج وغیرہ کیا چیزیں ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دراصل یہ عبادتیں جو اللہ نے آپ پر فرض کی ہیں۔ ان کا مقصد اس بڑی عبادت کے لیے تیار کرنا ہے جو آپ کو زندگی میں ہر وقت ہر حال میں ادا کرنی چاہیے۔ (خطبات۔ حصہ سوم، ص ۱۲)

گویا کہ مولانا مودودی کے نزدیک ان عبادتوں اور ان کے ارکان ومناسک کا لزوم ضروری نہیں۔ یہ مقصد نہیں ذریعہ ہیں۔ مقصد ہے انتخابات میں حصہ لینا اور اقتدار پر قبضہ کرنا اور پھر ڈنڈے کے زور پر انقلاب لانا۔

اسلامی شریعت یا منجمد شاستر:

اسلامی شریعت کی عام ترجمانی کی نسبت وہ فرماتے ہیں:

"دوسرا بنیادی نقص اس مسخ شدہ مذہبیت میں یہ ہے کہ اس میں اسلامی شریعت کو ایک منجمد شاستر بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔ اس میں صدیوں سے اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ جس کی وجہ سے اسلام ایک زندہ تحریک کی بجائے عہد گزشتہ کی تاریخ بن کر رہ گیا ہے۔" (ترجمان القرآن جلد ۱۸، عدد ۱)

(جماعت اسلامی پر ایک نظر، از شیخ محمد اقبال، ص ۲۱ تا ۲۴)

(۴)

عملی زندگی میں کذب بیانی کا وجوب:

بعض علمائے دین اور اہل قلم نے مولانا مودودی صاحب کی تحریروں میں تضادات کی نشان دہی کی ہے اور بعض صحابہ وصلحا پر افترا و بہتان تراشی و کذب بیانی کی مثالیں دی ہیں ۔ لیکن اگر ان حضرات کی نظر مودودی صاحب کے فلسفہ " صداقت شعاری " پر ہوتی تو وہ ان پر جھوٹ کے وجوب کے اعتراض کے ساتھ اس سے ان کے " باطنی " ہونے پر بھی استدلال ضرور کرتے ۔ اس لیے کہ حالات و مصالح کے تحت سچائی کو دل میں رکھ کر زبان سے جھوٹ بول دینے میں ان کے نزدیک کوئی گناہ نہیں ۔ ایسے ہی حالات اور " عملی زندگی کی بعض ضرورتیں " جو پیش آ جائیں ان میں جھوٹ کی اجازت ہی نہیں ہوتی بلکہ جھوٹ کا وجوب لازم آجاتا ہے ۔ مولانا مودودی صاحب لکھتے ہیں:

> " راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں بدترین برائی ، لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے ، بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے ۔ "
>
> (ترجمان القرآن ۔ مئی ۱۹۵۸ء)

مودودی صاحب اہل حدیث ، حنفی ، دیوبندی ، بریلوی وغیرہ کو تو مانتے نہیں اس لیے ظاہر ہے کہ وہ ان مکاتب فکر کے کسی عالم کے قول و فعل سے تو " وجوب کذب " کا استدلال کر نہیں سکتے ۔ اور اگر کریں بھی تو اسی کی حیثیت معلوم! وہ اپنے ذوق و فہم اور مطالعہ و تحقیق کے مطابق قرآن حکیم ہی سے استدلال کرتے اور سنت نبوی ہی سے فتویٰ طلب کرتے ہیں ۔ ہمیں معلوم نہیں کہ قرآن کی کس آیت اور کس سنت سے انھوں نے " کذب " کے وجوب کا استخراج و استناد کیا ہے ؟ ہم اس عقیدے

سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ہمارے نزدیک یہ خدااوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کذب وافترا کی بدترین مثال ہے۔

"رسول اللہ (صلعم) پر اصول شکنی کا الزام"

جماعت اسلامی چھوڑنے والوں کا مودودی صاحب پر ایک الزام یہ بھی تھا کہ انھوں نے جماعت کی تاسیس کے وقت جن اسلامی اصولوں کا اعلان کیا تھا۔ بعد میں ایک ایک کر کے ان کی مٹی پلید کرتے گئے۔اس کے جواب میں مودودی صاحب نے فرمایا (نعوذ باللہ) رسول اللہ نے بھی ایسا کیا تھا۔مودودی صاحب کے الفاظ ہیں:

"اسلامی نظام کے اصولوں میں ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔اسی چیز کو قرآن مجید میں پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار نہ صرف زبان مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے منصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی ۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ " الائمۃ من القریش " کہ امام قریش سے ہوں گے۔

ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملے میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیے کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔"

(رسائل ومسائل حصہ چہارم، ص ۳۰-۳۲۹)

"شریعت اسلامی میں جھوٹ بولنے کی اجازت"

۱۹۵۸ء میں جماعت اسلامی کے بعض نہایت ہی سربرآوردہ حضرات جماعت اسلامی چھوڑ کر چلے گئے ان کا الزام یہ تھا کہ مودودی صاحب بعض اوقات نہ صرف یہ کہ اپنے قائم کردہ اصول توڑ دیتے ہیں بلکہ اس مقصد کے لیے "جھوٹ" بھی بولتے ہیں۔ مودودی صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا۔ (نعوذ باللہ تعالیٰ) خود رسول اللہ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"راست بازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہیں۔ اور "جھوٹ" اس کی نگاہ میں بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر نہ صرف جھوٹ بولنے کی اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔"

اور اس اصول کے بعد فرمایا:

"اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لیے جب محمد بن مسلمہ کو حضورؐ نے مامور کیا۔ تو انھوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں۔ حضورؐ نے بالفاظ صریح انھیں اجازت دے دی۔"

(ماہنامہ ترجمان القرآن۔ مئی ۵۸ء، ص ۵۴)

صحابہ کی ایک دوسرے پر چوٹیں

ان سب سے عجیب بات یہ ہے کہ بسا اوقات صحابہ رضوان اللہ علیہم پر بھی بشری کمزوریوں کا غلبہ ہو جاتا تھا (وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جاتے تھے) ابن عمر نے سنا کہ ابو ہریرہ وتر کو ضرور نہیں سمجھتے، فرمانے لگے کہ ابو ہریرہ جھوٹے ہیں، حضرت عائشہؓ نے ایک موقعہ پر انس اور ابو سعید حذری رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کہ وہ حدیث رسول اللہ کو کیا جانیں، وہ تو اس زمانے میں بچے تھے۔ حضرت حسن، علی سے ایک مرتبہ وہ شاہد و مشہود کے معنی پوچھنے گئے۔ انھوں نے اس کی تفسیر بیان کی، عرض کیا گیا کہ ابن عمر اور ابن زبیر تو ایسا اور ایسا کہتے ہیں، فرمایا دونوں جھوٹے ہیں، حضرت علی نے ایک موقع پر مغیرہ بن شعبہ کو جھوٹا قرار دیا۔ عبادہ بن صامت نے ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے مسعود بن اوس انصاری پر جھوٹ کا الزام لگا دیا۔ حالاں کہ وہ بدری صحابہ میں سے ہیں۔

(تفہیمات (اطبع چہارم بعد نظر ثانی)، صفحہ ۲۹۴)

مولانا احتشام الحق تھانوی

حیات و خدمات

تالیف و تدوین

زیر اہتمام

مولانا احتشام الحق تھانوی اکادمی

مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم کے حالات زندگی، دینی و ملی خدمات، افکار وافادات میں اہل علم اور اصحاب قلم کے مقالات، علمائے کرام اور زعمائے ملت کے اعترافات عظمت وکمال، شعرائے کرام کا نذرانہ۔ عقیدت، علمی و تعلیمی و سیاسی سماجی اداروں اور رسائل واخبارات کی تعزیت، سفر آخرت کا آنکھوں دیکھا حال نیز شخصیت اور افکار وخدمات کے متعدد پہلوؤں پر علمی تحقیقی مقالات اور تخلیقات و تاثرات کے علاوہ

حضرت مولانا تھانویؒ کے ایمان افروز افادات، خطوط، فتاوی پر مشتمل نوادر علمیہ۔ دینیہ اور شاعرانہ کلام کا بے مثال مجموعہ